التربیۃ الاستقلالیہ

یعنی

اولاد کی تعلیم و تربیت اور صحیح طریقہ پرورش کے متعلق زبان فرانسیسی کی ایک مشہور کتاب

انیسویں صدی کا "امیل"

کا

ترجمہ جو اوّل مصر میں فرانسیسی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئی تھی، اب اس کے ضروری حصّوں کو

جناب مولانا عبد السّلام صاحب ندوی نے

حسب الارشاد

عالی جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا اور تعلیم قدیم و جدید کے نقائص پر اپنی طرف سے اُس میں ایک مقدمہ اضافہ کیا

باہتمام محمد احید الدین پرنٹر

مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء طبع ہوئی

فہرست مضامین التربیۃ الاستق

دوسری کتاب

(بچے کے متعلق)

مضمون	صفحہ

چوتھی کتاب

(جوان لڑکے کی تربیت کے متعلق)

دیباچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم والصلوٰۃ والسلام علی ینبوع الحکمۃ ونبی الرحمۃ الذی ادبہ ربہ فاحسن تادیبہ واتم لہ من مکارم الاخلاق نصیبہ فصارت سیرتہ المحمودۃ اکمل مثال للمربین وافضل ھدی للمرشدین وعلی آلہ واصحابہ الھادین المھتدین۔

آج سے چند صدی پیشتر یورپ کا نظام تعلیم مذہب اور سیاست کی سخت ترین بندشوں میں جکڑا ہوا تھا۔ پوپ اور بادشاہ دونوں نے انسان کے عالم روحانی اور عالم جسمانی پر اپنا پورا تسلط و اقتدار قائم کرلیا تھا، اور اُس نے اس قدر جابرانہ اور مستبدانہ حیثیت حاصل کرلی تھی کہ انسانی عقل و دماغ اُس کی برداشت سے بالکل عاجز آگئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں طاقتوں کے مقابلے کے لئے ایک دوسری غیر معتدل طاقت پیدا ہوئی جس کی خودسرانہ بیراہروی نے یورپ میں علمی اور مذہبی حیثیت سے مادیت کا جھنڈا بلند کیا اور سیاسی حیثیت سے انارکزم اور سوشلزم کی بنیاد قایم کی۔ تمام ممالک یورپ میں دماغی اشتعال کے لحاظ سے انگلستان سب سے زیادہ سرد اور فرانس

سب سے زیادہ گرم ملک ہی اس لئے اس دماغی ہیجان کا سب سے زیادہ اثر فرانس ہی پر پڑا، جس کا سب سے بڑا مظہر آج تاریخ میں شورش فرانس کے نام سے مشہور ہی۔

اس شورش کا اثر صرف سیاست ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کے بعد تعلیم و تربیت کے متعلق بھی آزادانہ خیالات قایم ہوئے اور وہاں کے حکماء و فلاسفروں نے انہی آزادانہ خیالات اور آزادانہ اصول کو پیش نظر رکھ کر فن تعلیم و تربیت پر بکثرت کتابیں لکھیں جن میں سب سے زیادہ مشہور فرانس کے مشہور حکیم جان جاک روشو کی کتاب " اٹھارویں صدی کا **امیل**" ہی۔ اس کے بعد علوم و فنون کو اور ترقی ہوئی تو فن تعلیم و تربیت نے بھی نئے برگ و بار نکالے اور اس موضوع پر متاخرین یورپ نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں قدماء کے نامکمل اصول و قواعد کی تکمیل کی چنانچہ انہی کتابوں میں الفونس ایکروس کی کتاب " انیسویں صدی کا امیل" بھی ہی جس کے نام ہی سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ تعلیم و تربیت کے جو قواعد اٹھارویں صدی کے لئے موزوں تھے انیسویں صدی میں ناکافی ہیں۔ اس لئے اس صدی کا "امیل" اٹھارویں صدی کے "**امیل**" سے قدرتاً مختلف ہی۔

اس کتاب میں اگرچہ تعلیم و تربیت کے اصول پر فلسفیانہ حیثیت سے بحث کی گئی ہی تاہم مصنف نے طرز تحریر فلسفیانہ نہیں اختیار کیا ہی بلکہ افسانے کے طرز پر دو میاں بیوی کو فرض کیا ہی جن میں شوہر کا نام ڈاکٹر ارا سم اور بی بی کا نام ہیلانہ ہی۔ بدقسمتی سے شادی کے چند ہی دنوں بعد شوہر یعنی ڈاکٹر ارا سم کسی سیاسی جرم میں قید ہوگیا اور میاں بیوی میں ایک طویل جدائی ہوگئی ہی لیکن بی بی کے پہلو مین شوہر اپنی ایک زندہ یادگار چھوڑ گیا اور جیل کے اندر سے میاں بیوی کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی ہی اُن میں اسی زندہ یادگار کی تعلیم و تربیت کے اصول و قواعد درج ہیں، خط و کتابت کے علاوہ زمانہ قید میں ڈاکٹر ارا سم کے دل میں تعلیم و تربیت کے متعلق جو خیالات پیدا ہوئے ہیں اُن کو وہ اپنی یادداشت میں درج کرتا گیا ہی۔ اور اُس یادداشت کو اس کتاب میں شذرات کے عنوان سے درج کیا ہی۔ مصنف نے اس فرضی لڑکے کی تعلیم و تربیت کا انتظام دو مختلف ملکوں میں کیا ہی یعنی انگلستان کو اُس کی تربیت کے لئے منتخب کیا ہی کیونکہ اُس کے نزدیک تمام یورپ میں انگریزی قوم کی اخلاقی حالت

سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور قابل تقلید ہی اور اس کو اعلےٰ تعلیم جرمنی میں دلوائی ہی جو علمی ترقی کے لحاظ سے تمام یورپ میں ضرب المثل ہی۔ چنانچہ جرمنی سے اس لڑکے نے اپنے باپ ماں کے نام جو خطوط لکھے ہیں اور انھوں نے ان کا جو جواب دیا ہی ان میں بھی زیادہ تر تعلیمی امور پر بحث ہی۔ غرض اس طرح مراسلات و تذکرات کا ایک مجموعہ مرتب ہو گیا ہی جن میں اور بہت سی خانگی باتوں کے ساتھ زمانہ حمل سے لے کر زمانہ شباب تک لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے غیر مرتب اصول درج ہیں اور ان تمام اصول میں فرانس کی اصلی روح کے لحاظ سے صرف یہ مقصد پیش نظر رکھا گیا کہ طلباء کو ایسی تعلیم و تربیت دی جائے جس سے ان میں آزادی اور استقلال کی روح پیدا ہو اور اُن کے تمام اعمال و افعال خود اُن کے علم، ارادہ اور اختیار سے صادر ہوں۔ جبر اضطرار اور تقلید کی ان میں آمیزش نہ ہو۔

اس کتاب کا اصلی مقصد یہی ہی اور ہر موقع پر مصنف نے بچوں کی آزادانہ روح کا تحفظ کیا ہی یہاں تک کہ اسی مقصد کے لئے اس نے ابتدا میں بچوں کو تمام مذہبی اثرات سے الگ رکھنے کی ہدایت کی ہی۔ چنانچہ اس نظریہ کے تمام دلائل کو لکھ کر اخیر میں لکھا ہی۔

پس امیل کی عزت اور نیز اُن معانی کے احترام کے لحاظ سے جن پر اُس کو بڑے ہو جانے کے بعد ایک ایسی فکر کے ساتھ غور کرنا چاہیے جو دوسرے اثرات سے ممزوج نہ ہو، میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اپنی بچپن کی تربیت کے زمانہ میں مذہبی مسائل میں پڑنے سے احتراز کرے کیونکہ ہم اس کی عقل اور اُس کے ضمیر کی آزادی کے امین ہیں، اور ہم سے اُس کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اگرچہ اُس کا یہ نظریہ قابل اعتراض ہی یہاں تک کہ اسلام میں جن مصلحین تعلیم نے تعلیم کو تمام خارجی اثرات سے الگ رکھنے کی ہدایت کی ہی وہ بھی مذہب سے بے نیاز نہیں ہو سکے ہیں بلکہ اُنھوں نے خود مذہب ہی کو بہترین معلم قرار دیا ہی، چنانچہ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں جب مذہب میں ضعف آگیا اور لوگوں نے روکنے والے احکام کا اتباع کیا پھر شریعت ایک

ایک مصنوعی علم بن گئی تو تعلیم و تادیب کا دور شروع ہوا، لوگوں میں تمدن آیا اور لوگ احکام کے مطیع ہونے لگے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے شجاعانہ جذبات فنا ہو گئے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی اور تعلیمی احکام شجاعت کو فنا کر دیتے ہیں کیونکہ ان میں جو چیز روکنے والی ہوتی ہے وہ اجنبی ہوتی ہے لیکن شرعی احکام کا یہ نتیجہ نہیں ہوتا کیونکہ اُن میں خود انسان کی ذات روکنے والی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ شاہی اور تعلیمی احکام تمدن لوگوں کی روح کو ضعیف کر دیتے ہیں، اور اُن کے بچوں اور بوڑھوں کی شان و شوکت کو توڑ دیتے ہیں۔ اور بدوؤں کی یہ حالت نہیں ہوتی کیونکہ وہ شاہی احکام تعلیم اور آداب سے الگ رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ محمد بن زید نے اپنی کتاب احکام المعلمین و المتعلمین میں لکھا ہے کہ مودب کو تین کوڑے سے زیادہ کسی لڑکے کو مارنا نہیں چاہئے۔[لہ]

تاہم وہ الحاد اور بیدینی پر مبنی نہیں ہے، چنانچہ وہ ایک خط میں امیل کو لکھتا ہے۔

الحاد اور دیدہ دلیری صرف جرمن نوجوانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ تم جہاں جاؤ گے تم کو ایسے نوجوان ملینگے جو نہ کسی چیز کا اعتقاد رکھتے اور نہ کسی چیز کی وقعت کرتے اس لئے اُن سے بچتے رہو۔

ایک مستقل خط صرف اس موضوع پر لکھا ہے جس کا پورا ترجمہ اصل کتاب میں آئے گا۔ اس موقعہ پر اُس کے چند فقرے حسب ذیل ہیں۔

انسان کے سوا ہر زندہ مخلوق صرف جسمانی نشو و نما چاہتی ہے لیکن انسان اس کے علاوہ مادی ضروریات سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اس لئے ارتقاء عقلی کا مادہ اس میں یقیناً موجود ہے، چاہے اس کو خیال کہو یا فطرت مذہبی، اور جو لوگ اس کو حقیر سمجھتے ہیں یا اُس پر نکتہ چینی کرتے ہیں، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُن کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ اور کس کی طاقت ہے کہ اس خیال کو نفوس بشریہ سے نکال ڈالے کیونکہ حدود عقل سے آگے

لہ۔ مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۴۱

بڑھنے کی کوشش انسان کی خلقت کا اقتضا ہی اور ہم کو یہ حق حاصل نہیں کہ جن باتوں کو عقل تلاش کرتی ہی اُن کو صرف اس لئے فریب اور وہم قرار دیں کہ وہ ہماری عقل کو مبہوت کردیتی ہیں، یا ہماری سمجھ میں نہیں آئیں۔

الحاد کو بڑی چیز سمجھنا لغویت ہی وہ ایک نہایت حقیر گناہ ہی اور خود انسانی احساس کے آگے کانپتا رہتا ہی۔

بہر حال وہ اس نظریہ سے الحاد اور بیدینی کی دعوت نہیں دیتا بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہی کہ لڑکے کو خود غور و فکر کے بعد ایک مستقل مذہب اختیار کرنا چاہئے اور یہ مقصد صرف اُس وقت حاصل ہو سکتا ہی جب بچپن ہی سے اُس کو باپ، ماں اور اُستاد کے مذہبی خیالات سے الگ رکھا جائے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اگرچہ کلیتہً اس اصول کی تائید نہیں کی جا سکتی تاہم اسلام عقائد میں تقلید کو جائز نہیں رکھتا اور سن تمیز سے پہلے مذہبی تعلیمات و تلقینات کو ضروری نہیں قرار دیتا ایک روایت میں ہی کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہی۔ لیکن اُس کے باپ ماں اُس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہی کہ طلباء کو باپ ماں کے مذہبی خیالات بعض اوقات گمراہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر مصنف کا یہ نظریہ بہت زیادہ قابل اعتراض نہیں ہی۔ تاہم مذہب کے متعلق اُس نے جا بجا جو حکیمانہ اور آزادانہ رائیں قائم کی ہیں، اگر اُن کو نظر انداز کر دیا جائے تو اُس کے اور تعلیمی نظریات کے خاص طور پر وقعت کے قابل ہیں چنانچہ اسی بناء پر مصر کے مشہور مجدد و مصلح تعلیم مفتی محمد عبدہٗ نے ہربرٹ اسپنسر کی کتاب تعلیم کے ترجمہ کے بعد یورپ اور امریکہ کی تعلیمی کتابوں میں اسی کتاب کو انتخاب کیا اور اپنے شاگرد شیخ عبد العزیز آفندی محمد قاضی محاکم اہلیہ سے اس کے ترجمہ کی خدمت متعلق کی جو اول اول المنار میں بتدریج شائع ہوتا رہا لیکن تشنگان علم کے لئے اس ساغر کے چند گھونٹ کافی نہ ہوئے اس لئے انھوں نے اس متفرق ترجمہ کو ایک مستقل کتاب کی صورت میں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، حسن اتفاق سے شیخ عبد العزیز نے اپنے استاد سید محمد رشید رضا

اڈیٹر المنار کے ساتھ ایک بار ریاض پاشا کی جو اس وقت وزیر تھے ملاقات ہی تو انھوں نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا اس لئے انھوں نے "التربیۃ الاستقلالیہ" کے نام سے اس کو ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع کیا اور مصنف کے سادہ خطوط اور شذرات جن تعلیمی اصول اور تعلیمی مسائل پر مشتمل تھے ان کو پیش نظر رکھکر مضامین کی مستقل عنوانات قایم کئے جن سے مضامین کتاب کی ایک مکمل فہرست مرتب ہوگئی۔

یہ مجموعہ جس وقت چھپکر شائع ہوا مصر کے سررشتہ تعلیم نے اس کی نہایت قدر کی اور سعد پاشا زغلول نے جو اس وقت وزیر تعلیمات تھے مدرسۃ المعلمین ناصریہ (ٹرننگ اسکول) کے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ حکماً ضروری قرار دیا اور ان کے بعد ان کے جانشین احمد حشمت پاشا نے بھی اس کو حسب دستور قایم رہنے دیا۔

کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۳۲۶ھ میں شایع ہوا تھا لیکن چند ہی سال میں اس کے تمام نسخے ختم ہوگئے اور ۱۳۳۱ھ میں دوسرے اڈیشن کی ضرورت پیش آئی، جو پہلے اڈیشن سے زیادہ صحت کے ساتھ شائع ہوا۔

اسی اڈیشن کا ایک نسخہ مدّت سے میرے پیش نظر تھا اور میں نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کے تعلیمی مباحث کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ لیکن مجھے نظر آتا تھا کہ ان مراسلات و شذرات میں جو ذاتی اور خانگی معاملات درج ہیں ان کے ضمن میں نفس تعلیمی اصول و قواعد بہت کچھ دھندلے نظر آتے ہیں اور ان کی کوئی مستقل حیثیت نہیں قایم ہوتی اس لئے اگر تمام غیر ضروری باتوں کو چھوڑ کر اس خرمن سے صرف یہی دانے چن لئے جائیں تو اردو میں فن تعلیم و تربیت پر ایک مختصر لیکن نہایت مفید کتاب تیار ہوسکتی ہی چنانچہ اسی خیال کی بنا پر میں نے جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولنا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدرآباد و آنریری سکرٹیری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کو اس طرف توجہ دلائی تو جناب ممدوح نے اس کے ساتھ قدیم اسلامی تعلیم و تربیت کے اصول کو بھی نظر انداز کرنا مناسب نہیں سمجھا چنانچہ انھی کی ہدایات کے بموجب میں نے قدیم اسلامی طریقہ تعلیم و تربیت پر ایک مفصل مضمون لکھکر اس ترجمہ کا مقدمہ بنا دیا ہی اور اس طرح یہ کتاب جامع الحیثیتین ہوگئی ہی اور اس سے قوم کے قدیم و جدید دونوں گروہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مُقدمہ

تعلیم قدیم و تعلیم جدید کی خرابیاں

تعلیم قدیم

اس وقت ہندوستان، نہ صرف ہندوستان بلکہ تقریباً کل دنیائے اسلام میں دو قسم کی تعلیم جاری ہی تعلیم قدیم و تعلیم جدید لیکن دونوں قسم کی تعلیم کے نتائج نہایت افسوس ناک ہیں۔ تعلیم کا براہ راست نتیجہ اگرچہ صرف علمی ترقی تک محدود ہی لیکن ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی خاص لحاظ رکھا گیا ہی اس لئے علمی ترقی کے ساتھ ہر تعلیم یافتہ شخص پر دنیا کی نگاہ اخلاقی حیثیت سے بھی پڑتی ہی لیکن علمی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے آج تعلیم و تربیت ایک ایسی بے نتیجہ چیز نظر آتی ہی کہ اُس کو منطق کی اُن اشکال کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہی جن کو اصطلاح میں عقیم کہا جاتا ہی۔ تعلیم قدیم کا یہ بے نتیجہ نظام دنیائے اسلام کے تمام مصلحین کو نظر آیا تو اس کی اصلاح کے لئے عملی

کوششیں کی گئیں۔ ہندوستان میں ندوۃ العلما کا دار العلوم اسی غرض سے قایم کیا گیا۔ مسلمانانِ روس نے بھی قدیم طریقۂ تعلیم کو چھوڑ کر جدید روش اختیار کی اور مصر کے ایک فاضل سید محمد بدر الدین حلبی نے اسی غرض سے ایک مستقل کتاب التعلیم والارشاد کے نام سے لکھی جو ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں مصر سے چھپ کر شائع ہوئی، چنانچہ وہ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

ہم کو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب سے لوگوں نے تعلیم وارشاد کے یہ طریقے اختیار کئے مسلمانوں کے ہر شہر میں بہت سے فضلا اُن کو بُرا سمجھتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ اگر یہ طریقے دوسرے طریقوں سے بدل جاتے تو وہ اس سے بہتر ہوتے لیکن متعدد رکاوٹوں کی بناء پر وہ علانیہ اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے تھے، اور لوگوں کو اس کی دعوت نہیں دے سکتے تھے لیکن جب ان میں وہ لوگ پیدا ہوئے جو اس مداہنت میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتے تھے اور اس رائے کے اظہار اور موجودہ حالت کی برائی اور بہترین طریقوں سے اس کے تبادلہ کی ضرورت کے اعلان سے نہیں ڈرتے تھے تو اس قوم میں بھی جنبش پیدا ہوئی جو صرف خوف کی وجہ سے حرکت نہیں کرتی تھی۔ اب وہ اس تھوڑی سی مدت میں ایک جماعت بن گئے۔ اور ہم کو توقع ہے کہ زمانہ جوں جوں گزرتا جائیگا اس مذہب کے اعوان وانصار بھی بڑھتے جائینگے۔ [۱]

فاضل موصوف بھی اُسی برگزیدہ جماعت کے ایک فرد ہیں اور اس حیثیت سے اونہوں نے قدیم نظام تعلیم کے مقاصد پر نہایت تفصیلی بحث کی ہے اور جابجا اپنے ذاتی تجربات سے استشہاد کیا ہے چنانچہ ایک موقع پر علوم عربیہ کے سلسلۂ ذکر میں فرماتے ہیں:

یہ علم ہر ملک کے مذہبی طلبا میں عام طور پر رائج ہے گو اس فن کی درسی کتابیں ہر ملک میں مختلف ہیں مثلاً اہل مصر نحو کی کتابوں میں شرح کفرادی علی الاجرومیہ

---

[۱] التعلیم والارشاد مطبوعہ مصر صفحہ ۴ و ۵

شرح الشیخ خالد علی الاجرومیہ مع حاشیہ ابی النجا و حاشیہ عطار، شرح القطر مع حاشیہ سجاعی شرح الشذور مع حاشیہ امیر شرح ابن عقیل علی الفیہ ابن مالک مع حاشیہ سجاعی یا حاشیہ خضری۔ شرح اشمونی علی الفیہ ابن مالک معہ حاشیہ صبان کو پڑھتے ہیں اور ان کتابوں کی تعلیم میں کئی سال صرف کر دیتے ہیں لیکن اخیر میں یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ نکرہ اور معرفہ کی تمیز بھی نہیں کر سکتے جس کے متعدد اسباب ہیں لیکن ان تمام اسباب کا مرجع طریقہ تعلیم کی خرابی اور ان کتابوں کی پریشان بیانی ہے۔ اگر ان کتابوں کے مسائل کی تلخیص کی جائے تو ان کے ہزار جزو میں سے صرف ایک جزو باقی رہ جائے اس کے علاوہ تمام لفظی مباحث نکلیں جن کو نحو یا کسی دوسرے علم سے کوئی تعلق نہیں۔

استاد جو تعلیم دیتا ہے اُس کا مطمحِ نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جس کتاب کو پڑھاتا ہے اس کے حواشی اور شروح کے تمام مباحث اور تمام اعتراضات اور جوابات کو بیان کر دے۔ میں ایک اُستاد کے پاس گیا جو ان میں سے ایک کتاب کو پڑھا رہا تھا اور اس کے ہاتھوں کی ہر دو انگلیوں کے درمیان ایک ایک کتاب کا ایک ایک جزو تھا اور وہ ان سب میں اعتراض اور جواب کی جستجو کرتا تھا۔ میں جب ازہر میں پڑھتا تھا تو ایک بڑے عالم کو جو شرح ابن عقیل پڑھا رہے تھے دیکھا کہ وہ طلباء پر بڑا احسان جتا رہے ہیں کہ وہ سخت محنت برداشت کر کے الفیہ کی بیسیوں شرحیں اور حاشیئے دیکھتے ہیں یہاں تک کہ لوگوں نے کم و بیش جو کچھ اُس پر لکھا ہے وہ اُن سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ اس سے بھی زیادہ خرابی یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص الفیہ کی شرح ابن عقیل شروع کرتا ہے جو عادۃً یہاں ایک سال میں پڑھائی جاتی ہے لیکن شیخ اس طریقۂ تعلیم کے مطابق جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا سال بھر میں صرف نصف کتاب پڑھا سکتا ہے اس لئے جب سال کے آخری ایام آتے ہیں تو وہ اپنی باگ ڈھیلی کر دیتا ہے اور اس حالت میں طلباء کے لئے

مطالب کتاب کا سمجھنا تو درکنار شیخ کا مقابلہ کرنا بھی دشوار ہوتا ہے اس لئے معلم صرف دیکھتا ہے اور طلباء صرف سنتے ہیں۔ صرف نحو ہی کی کتابوں کا طریقہ درس یہ نہیں ہے بلکہ تمام علوم و فنون کی کتابوں کا یہی حال ہے، اکثر طلباء تو اوائل کتاب میں صرف بسم اللہ کے دقائق و نکات پر اپنی طاقت صرف کر دیتے ہیں اور اُس کا چھوڑ دینا ان کے نزدیک بہت بڑی علمی کوتاہی ہے۔ بسم اللہ کو ختم کرکے خطبہ کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کے ایک ایک حرف کی تشریح کرتے ہیں، بسا اوقات یہ خطبہ طویل ہوتا ہے تو طلباء کا کافی وقت لے لیتا ہے۔

ترک طلباء اس فن کی کتابوں میں اظہار مع حواشی و شروح کافیہ ابن حاجب مع حواشی و شروح کو پڑھتے ہیں اور حواشی کے ساتھ شدت سے اعتناء کرتے ہیں بالخصوص جب اُن کا مولف خود اُن کی قوم کا ہوتا ہے منازعات لفظیہ کی طرف بھی اُن کا میلان پایا جاتا ہے۔ بااین ہمہ اس معاملہ میں اُن کا درجہ مصریوں سے گھٹا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ بہ نسبت مصریوں کے ان کے یہاں تعلیم قدیم نے بہترین نتائج پیدا کئے ہیں، مثلاً ایک ترکی طالب علم عربی زبان اور عربی زبان کے قواعد چار سال میں اچھی طرح سیکھ لیتا ہے اور فصیح اور صحیح عربی میں بخوبی گفتگو کر سکتا ہے۔ تحریر کی بھی یہی کیفیت ہے لیکن ایک مصری طالب علم دس سال میں بھی اس پر قادر نہیں ہوتا۔

اہل شام اور اہل عراق نے دونوں طریقوں کو ملا لیا ہے اس لئے وہ مصریوں اور ترکوں دونوں کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ بااین ہمہ اُن کا طریقۂ تعلیم مصریوں سے زیادہ مشابہ ہے اور مصریوں کی طرح ان کو بھی لفظی مباحث اور سوال و جواب سے بہت زیادہ شغف ہے لیکن اُن کے یہاں تعلیم نے مصر سے بہتر نتائج پیدا کئے ہیں کیونکہ وہ علم کو عمل پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس فن میں ہندوستانی طلبہ کی کوئی مخصوص درسی کتاب نہیں ہی بلکہ اُن کو جو کتاب پسند آتی ہی وہ اس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں باایں ہمہ عام طور پر وہ شرح جامی اور حاشیہ عصام پر زیادہ اعتماد رکھتے ہیں اور ان کا طریقۂ تعلیم نہایت سادہ ہی یعنی مدرس کتاب کے الفاظ پڑھ کر ہندی زبان میں اُن کی تشریح کردیتا ہی لیکن اُن کے یہاں تعلیم سخت بے نتیجہ ہی اور غالباً اس کا سبب یہ ہی کہ وہ عربی کتابوں کے ذریعہ سے علوم وفنون کی تعلیم حاصل کرتے ہیں حالانکہ وہ اس زبان سے سخت بیگانہ ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ وہ الفاظ میں اُلجھ کر اُن کے معانی ومطالب سے نا آشنا رہ جاتے ہیں۔

ہم نے اپنی بحث کو صرف اسلامی مذہبی مدارس تک محدود رکھا ہی کیونکہ ہم مذہبی نقطۂ نظر سے صرف انہی مدارس کے طریقۂ تعلیم کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں ورنہ اگر ہم مشرق قریب میں ہندوستان سے لے کر فارس، عراق، شام، مصر، ٹرکی، قازان اور جاوہ تک نگاہ کو دوڑائیں تو ہم کو تاخر وانحطاط کے لحاظ سے ان تمام ممالک کا طریقۂ تعلیم یکساں وہموار نظر آئے گا۔

ان مذہبی مدارس کے علاوہ عربی تعلیم کے لئے اور بھی سرکاری اور قومی مدارس قایم ہیں۔ جن کا طریقۂ تعلیم اور نصاب درس مذہبی مدارس سے مختلف اور اُن سے بہتر ہی، لیکن بدقسمتی سے ان دونوں قسم کے مدارس کا نتیجہ ایک ہی جس کے اسباب فاضل موصوف کے نزدیک صرف دو ہیں، جن میں

ایک کو مدرسین نے پیدا کیا ہی اور دوسرے کو طلباء نے۔ مدرسین نے تعلیمی تنزل کا جو سبب پیدا کیا ہی وہ یہ ہی کہ وہ طلباء کو صرف کتاب کے مسائل اس طرح رٹا دیتے ہیں کہ جب اُن کا سوال کیا جائے تو وہ بلاکم وکاست بغیر غور وفکر کئے ہوئے ان کا جواب دے سکیں۔ خود طلباء بھی اس پر قانع ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ جب

طالب العلم مدرسہ میں داخل ہوتا ہی تو اس کا مقصد صرف امتحان کی ڈگری لے لینا ہوتا ہی، اس لئے وہ اپنی تمام تر توجہ کتاب کی عبارت کے رٹ لینے کی طرف مبذول کر دیتا ہی تاکہ جب اُس سے سوال کیا جائے تو وہ اُس کا جواب دے سکے نفس کتاب کے معانی و مطالب سے وہ سروکار نہیں رکھتا اور جس مقصد کے لئے وہ فن مدون کیا گیا ہی اور جس غرض کے لئے وہ کتاب لکھی گئی ہے اس سے اس کو بحث نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ مذہبی مدارس کے معلمین علوم و فنون کے قواعد کی تحقیق اُن کے توضیح و تشریح اور اُن کے ضبط و استقصاء میں اس قدر غلو کر دیتے ہیں کہ نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہی اور توضیح ابہام اور تفصیل اجمال میں جاتی ہے۔ اس کے بخلاف سرکاری مدارس میں صرف حفظ قواعد پر قناعت کر لی جاتی ہی۔ اور معانی و مطالب سے غرض نہیں ہوتی اس لئے اس افراط و تفریط سے بچنے کے لئے توسط و اعتدال کی ضرورت ہی یعنی مذہبی مدارس کی افراط اور سرکاری مدارس کی تفریط کو چھوڑ کر ایک معتدل طریقۂ تعلیم اختیار کرنا چاہیئے۔

اخلاقی حیثیت سے قدیم تعلیم کے نتائج اور بھی ناگفتہ بہ ہیں۔ عجب، غرور، خود بینی تشتت و اختلاف، جنگ و جدل، حرص و طمع، دنائت اور پستی غرض کوئی ایسا اخلاقی عیب نہیں جو قدیم تعلیم کے نمونوں میں موجود نہ ہو، اور یہ وبا ایک ایسی عالمگیر وبا ہی جس سے دنیائے اسلام کا کوئی حصہ محفوظ نہیں ہی۔ مصر کو قبۃ الاسلام کا خطاب دیا گیا ہی اور وہاں جامع ازہر ایک ایسی درس گاہ ہی جس کو دنیائے اسلام کا قبلۂ امید کہا جا سکتا تھا لیکن اُس کے تعلیمی نتائج کی تفصیل تم اوپر پڑھ آئے ہو اب اسی فاضل کی زبان سے اس کی عبرت انگیز اخلاقی داستان سننا چاہیئے وہ لکھتا ہی۔

ازہر کے مذہبی طلباء میں سب سے زیادہ افسوس ناک اور سب سے زیادہ

قابل توجہ چیز ان کی اخلاقی برائیاں ہیں یہ اُن کی ایک ایسی خصوصیت ہی جو لوگوں میں ضرب المثل ہوگئی ہی۔

اس کے لئے ہم کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں، جن لوگوں نے ان کے ساتھ میل جول رکھا ہی، وہ ان کی اخلاقی برائیوں سے اچھی طرح واقف اور اس پر سخت متاسف ہیں۔ طلبائے ازہر سے لوگوں کو جو نفرت ہی اگر وہ اُس کا سبب دریافت کریں تو اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی وجہ صرف ان کی بد اخلاقی اور بد معاملگی ہی۔ دنیا کی کُل جماعتوں کا یہ حال ہی کہ جس قدر اس کے افراد کی تعداد میں ترقی ہوتی جاتی ہی اور جس قدر وہ قدیم ہوتی جاتی ہیں اسی قدر لوگوں کے دلوں میں اُن کی وقعت بڑھتی جاتی ہی۔ صرف مذہبی علوم کی جماعتیں اس سے مستثنےٰ ہیں یعنی جس قدر اُس کے افراد بڑھتے جاتے ہیں، اور جس قدر وہ پرانی ہوتی جاتی ہیں اُسی قدر لوگ ان سے شدت کے ساتھ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس میں خود طلباء کا کوئی قصور نہیں، کیونکہ یہ لوگ کھیتوں میدانوں اور جنگلوں سے آکر اس جماعت میں دفعتہً شامل ہو جاتے ہیں اور اس سے پہلے اُن کے کان، اخلاق، آداب اور حُسنِ معاشرت کی باتوں سے آشنا نہیں ہوتے اس لئے جب وہ اُن شہری مدارس میں جو اخلاقی خرابیوں کا مرکز ہیں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے ان کی آنکھ ان ہی خلاقی برائیوں پر پڑتی ہی اور وہ اُن کی روح میں نشو و نما پانے لگتی ہیں یہاں تک کہ جب ان کو کوئی مصلح اخلاق یا اس پر کوئی دار و گیر کرنے والا شخص نہیں ملتا تو وہ ایک ملکہ راسخہ بن جاتی ہیں اور طلباء کی عام جماعت اور اہل مصر کی عام متغیر شدہ حالت کو دیکھ کر وہ بھی ان بد اخلاقیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

قصور صرف منتظمین مدارس کا ہی جنھوں نے طلباء کو چوپایوں کے گلے کی

طرح مطلق العنان چھوڑ دیا ہی اور بُرے بھلے کی تمیز درمیان سے اٹھادی ہی- اس حالت میں وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور اُن کو کسی کا خوف نہیں ہوتا-

تعلیم جدید | تعلیم قدیم کے ان افسوسناک نتائج کے بعد ہماری نگاہ جدید تعلیم کے نتائج پر پڑتی ہی جس کا آج روز بازار ہی، لیکن افسوس ہی کہ اس عالم شباب میں بھی اس کے چہرے پر وہی جھریاں نظر آتی ہیں جنھوں نے قدیم کہن سال تعلیم کے چہرے کو نہایت بدنما بنا دیا ہی، قدیم تعلیم کو پیچیدگی، اغلاق اور کثرت شروح و حواشی نے علمی حیثیت سے ایک معمہ بنا دیا ہی- جو بہ مشکل حل ہوتا ہی اور حل ہو جانے کے بعد بھی اس سے کوئی نتیجہ نہیں حاصل ہوتا، لیکن جدید تعلیم اس قدر واضح، اس قدر آسان اور اس قدر سہل بنا دی گئی ہی کہ طلباء میں سطحیت کے سوا کسی قسم کے عمیق غور و فکر کا مادہ نہیں پیدا کر سکتی- استاد اور شاگرد دونوں کو اچھی طرح معلوم ہو گیا ہی کہ اُن کا کام صرف امتحان کے لئے تیار کرنا اور کرانا ہی- اس لئے اساتذہ طلباء کو اہم مقامات ازبر یاد کرا دیتے ہیں اور وہ طوطے کی طرح ان کے الفاظ کو رٹ لیتے ہیں اکثر طلباء سال بھر کتاب کو بند رکھتے ہیں اور جب امتحان کا زمانہ قریب آتا ہی تو نہایت روانی کے ساتھ کئی کئی بار اُس کی عبارت کو دُہرا کر کامیاب ہو جاتے ہیں، اس کا یہ نتیجہ ہی کہ اس عالمگیر تعلیم نے آج تک کوئی دقیق النظر عالم، کوئی وسیع النظر مصنف علم دوست طالب علم، اور کوئی سنجیدہ مقرر نہیں پیدا کیا-

جدید تعلیم کے یہ افسوسناک علمی نتائج صرف ہندوستان ہی میں محسوس نہیں کئے جاتے بلکہ خود یورپ میں بھی جو اس طریقۂ تعلیم کا مولد طبعی ہی ان پر نگاہیں پڑتی ہیں اور اُن کی اصلاح کی کوششیں کی جاتی ہیں- چنانچہ فرانس میں مشہور سائیکالوجسٹ پروفیسر ریبو کی زیر صدارت ایک کمیشن تعلیمی تحقیقات کے لئے بیٹھا تھا جس نے اپنی رپورٹ چھ جلدوں میں شائع کی ہی- اس قابل اعتماد رپورٹ کی بنا پر فرانس کے مشہور مصنف لیبان نے فرنچ طریقۂ تعلیم کی خرابیوں کے حسب ذیل اسباب بتائے ہیں:

(۱) - یہاں کا نصاب تعلیم ضخامت کے لحاظ سے بہت بڑا ہی-

(۲) - نصاب تعلیم میں کتابوں کا انتخاب نہایت لغو اصول پر کیا جاتا ہی-

(۳) - پروفیسر عموماً وہ لوگ مقرر کئے جاتے ہیں جو خاص اپنے فن کے بہترین معلم نہیں ہوتے
(۴) - ہر درجہ میں طلباء کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایک اُستاد اُن کی نگرانی نہیں کر سکتا۔
(۵) - تعلیم محض کتابی ہوتی ہے۔
(۶) - دماغی تعلیم و تربیت پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ جسمانی نشوونما ناممکن ہو جاتی ہے۔
(۷) - امتحان و انعام کے طریقے کچھ اچھے محرک نہیں۔ ان سے طلباء میں غرور و خود پسندی پیدا ہوتی ہے۔
(۸) - لیٹن اور یونانی وغیرہ قدیم زبانوں پر زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے جو محض بے کار ہے۔
(۹) - امتحانوں میں صرف کتابی معلومات کی جانچ ہوتی ہے۔ طلبہ کی اصل استعداد و قابلیت کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔

اُس نے سِر تطور الامم میں جہاں لیٹن قوموں کے زوال و انحطاط پر بحث کی ہے اجمالاً اسی خیال کا اعادہ کیا ہے چنانچہ لکھتا ہے۔

اس حالت کا بدلنا سخت مشکل ہے کیونکہ سب سے پہلے ہم کو اُس افسوس ناک لیٹن طریقۂ تربیت کو بدلنا پڑیگا، جو ہم کو قوت استنباط اور ہمت سے معرا کر کے ہماری ملکۂ استقلال عقلی کو بالکل فنا کر دیتا ہے، کیونکہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ امتحانات میں گوئے سبقت لے جائیں، اور یہ ایک ایسا بدترین مقصد ہے جس سے صرف قوت حافظہ سے کام لینا پڑتا ہے اور اُسی کا یہ نتیجہ ہے کہ تمام قومی کاموں کو صرف وہ لوگ انجام دیتے ہیں جن میں تقلید کے سوا اور کوئی قابلیت نہیں ہوتی ہے وجہ ہے کہ یہ لوگ ان کاموں کو بہت کم ہاتھ لگاتے ہیں جن میں ذاتی ہمت اور بیباکانہ جرأت کی ضرورت ہے۔

اُس نے روح الاجتماع میں بھی اس طریقۂ تعلیم کے افسوس ناک نتائج پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر لکھتا ہے۔

اس طریقہ تربیت سے لوگوں کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ کتاب کا ازبر کر لینا ذہانت

کو ترقی دیتا ہی اس لئے ابتداء سے لے کر انتہا تک کے طلباء کے لئے اُنھوں نے اس کو بقدر استطاعت لازمی کر دیا ہی۔ حالانکہ اس سے نہ قوائے عقلیہ کو نشوونما حاصل ہوتی نہ عملی ملکہ پیدا ہوتا کیونکہ طالب العلم کی نگاہ میں اس تعلیم کا مقصد رٹ لینے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ موسیو ژول یمان قدیم وزیر تعلیم فرماتے ہیں کہ "اس طریقۂ تعلیم میں طالب العلم کی کُل کوششوں کا خلاصہ یہ ہی کہ وہ یہ اعتقاد کرلے کہ معلّم ہر قسم کی غلطی سے محفوظ ہی جو سراسر ہماری کمزوری ہی"۔ صرف یہی نہیں کہ یہ طریقۂ تعلیم غیر مفید بلکہ اس کا سب سے زیادہ خطرناک نتیجہ یہ ہی کہ وہ طالب العلم کے تمام قوائے نظریہ کو پژمردہ کر دیتا ہی اس لئے ایک کاریگر، کاریگر بننا پسند نہیں کرتا۔ کاشتکار زراعت کی طرف مائل نہیں ہوتا، ان کاموں کو چھوڑ کر طبقۂ وسطی کے لئے صرف ایک عملی میدان باقی رہ جاتا ہی یعنی سلطنت کے قصر وایوان۔

حکومت کی یہ دریوزہ گری بعض اوقات شورش اور بغاوت کی صورت اختیار کرلیتی ہی کیونکہ

جو حکومت اس جماعت کو تیار کرتی ہی وہ صرف چند کو ملازمت دے سکتی ہی اور باقی لوگ بے کار رہ جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہر قسم کی شورش اور بغاوت کے لئے تیار رہتے ہیں، کیونکہ انسان جب اپنے علوم ومعارف کے لئے کوئی محل استعمال نہ پائیگا تو لامحالہ اپنی ہی قوم سے بغاوت کرے گا۔

اگرچہ اس شورش وبغاوت پر جو معاش کی ضرورت اور تمدنی حوائج کی وسعت کا نتیجہ ہے حُبّ الوطنی کے خوشنما لفظ نے پردہ ڈال رکھا ہی۔ اس لئے وہ دنیا کو بہت زیادہ بدنما نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں نہایت کثرت سے اس قسم کی بداخلاقیاں پیدا ہوگئی ہیں جو قانونی، تمدنی، مذہبی، سیاسی اور اخلاقی غرض کی حیثیت سے جائز نہیں قرار دی جاسکتی

مثلاً جن لوگوں کو اس تعلیم نے دولتمند بنا دیا ہے ان میں شراب خوری، بدکاری، لامذہبی، اور خود بینی و خود پسندی فضول خرچی وغیرہ اخلاقی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں اور جن لوگوں کو اس تعلیم نے مفلس بنا رکھا ہے وہ اس قسم کے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں جو علانیہ تعزیری دفعات کے تحت میں آجاتے ہیں، چنانچہ لیبان روح الاجتماع میں لکھتا ہے:

تعلیم کی اشاعت سے جرائم کے میلان میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے یا کم از کم تعلیم کے ایک مخصوص طریقہ نے اس کو ترقی دی ہے سوسائٹی کے سب سے بڑے دشمن انارکسٹ اسی گروہ سے پیدا ہوتے ہیں جس نے مدارس میں ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ ایک مشہور جج کہتا ہے کہ "چار ہزار مجرموں میں تین ہزار تعلیم یافتہ اور صرف ایک ہزار ناخواندہ لوگ ہوتے ہیں" آج سے پچاس سال پیشتر جرائم کی تعداد فی لاکھ نفر ۲۲۷ تھی اور اب ترقی کر کے ۵۲ ۲ ہو گئی ہے، دوسرے ججوں کی رائے ہے کہ زیادہ تر جرائم کی نشوونما اُن نوجوانوں میں ہوتی ہے جنھوں نے اپنے پیشے کی تعلیم کو چھوڑ کر جبری تعلیم حاصل کرنا شروع کی ہے۔

غرض علمی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے کتاب کے دونوں صفحے سیاہ ہیں، اور جدید تعلیم کو اس باب میں قدیم تعلیم پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اب ہم کو صرف یہ غور کرنا ہے کہ اس طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی کیا صورت ہے؟ اور زمانہ قدیم میں تعلیم سے جو بہترین علمی اور اخلاقی نتائج پیدا ہوتے تھے وہ اس زمانہ میں کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں؟

تعلیم قدیم کا طریقۂ اصلاح

تعلیم قدیم کے متعلق تو تمام مصلحین تعلیم نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ جب تک موجودہ طریقۂ تعلیم کو چھوڑ کر قدماء کی روش اختیار نہ کی جائے گی موجودہ نظام تعلیم کی ابتری دور نہیں ہو سکتی، چنانچہ سید محمد بدر الدین حلبی نے اپنی کتاب "التعلیم والارشاد" کے جو تین مقاصد قرار دیے ہیں اُن میں ایک مقصد یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے موجودہ طریقۂ تعلیم کے عیب و ہنر سے بحث کر کے یہ بتایا جائے کہ وہ مفید طریقۂ تعلیم جو قرون اولے میں جاری تھا کیا تھا؟ تاکہ اس زمانے میں

اُس پر عمل کیا جائے۔ ندوۃ العلماء نے بھی نصاب تعلیم کی اصلاح کی تو اس میں متاخرین کی کتابوں کو چھوڑ کر قدماء کی کتابیں داخل کیں۔

قدیم تعلیم کی اصلاح کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جدید طریقۂ تعلیم اور جدید نصاب درس کی تقلید کی جائے۔ مصر میں انگریزی اسکولوں کے طرز کی جدید عربی ریڈروں کا ایک سلسلہ بھی تیار ہو گیا ہے جو ہماری نظر سے گزر چکا ہے لیکن اس سے بھی کسی مفید نتیجہ کی امید نہیں ہو سکتی۔ انگریزی نصاب تعلیم نے جو سطحیت پیدا کر دی ہے وہی اس نصاب تعلیم سے بھی لازمی طور پر پیدا ہو گی۔ چنانچہ علامہ سید محمد بدرالدین علی اس طریقۂ اصلاح پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لیکن ہماری یہ رائے نہیں ہے کہ جو کتابیں آج مذہبی طلباء کے درمیان متداول ہیں اُن کو سرکاری مدارس کی درسی کتابوں سے بدل دیا جائے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کیونکہ یہ کتابیں علمی حیثیت سے نہایت کم درجہ کی ہیں اور الفاظ کو الٹ پلٹ کر متاخرین ہی کی کتابوں سے تراشی گئی ہیں اور اُن کے پڑھانے سے سرکاری مدرسوں میں جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ مدارس شرعیہ کے لئے ناکافی ہے۔ کیونکہ ہر فریق کا مقصد دوسرے فریق سے مختلف ہے۔ بااین ہمہ یہ کتابیں اگرچہ مدارس شرعیہ کے قابل نہیں ہیں تاہم سرکاری مدارس کے لئے وہ نہایت موزوں ہیں۔ البتہ اگر یہ کتابیں مذہبی علوم کے مبتدیوں کو ایک خاص طریقہ سے پڑھائی جائیں تو چنداں مضائقہ نہیں۔ بلکہ وہ اُن کے لئے قدماء کے مختصرات سے زیادہ مفید ہوں گی۔ کیونکہ لوگوں پر عجمیت غالب آ گئی ہے اور طبیعتوں میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو گیا ہے بالخصوص مذہبی مدارس کے لوگ علوم و فنون کی تحصیل سے پہلے علوم ریاضیہ کو مطلق نہیں پڑھتے۔

بہرحال موجودہ قدیم طریقۂ تعلیم کی اصلاح صرف عہد قدیم کے طریقۂ تعلیم کے رائج کرنے سے ہو سکتی ہے جس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے قدیم طریقۂ تعلیم کے ایک ایک جزو کی

تفصیل کی جائے جو اس مقدمہ کا اصلی موضوع ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہم مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا اجمالی بیان ضروری سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ

اسلام میں ابتدا ہی سے تعلیم و تربیت کا سلسلہ قایم ہوا۔ قرآن و حدیث میں علم و علماء کے شرف و فضائل پر کافی زور دیا گیا ہے۔ تعلیم کے سلسلہ کی ابتدا قرآن پاک کی تعلیم سے ہوئی چنانچہ رسول اللہ صلعم نے قیام مکہ معظمہ ہی کے زمانے میں حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت ابن مکتومؓ کو بعیت عقبۂ اولیٰ کے بعد اس غرض سے مدینہ روانہ فرمایا کہ لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیں[۱] ہجرت کے بعد اس سلسلہ کو اور ترقی ہوئی اور مسجد نبوی میں اصحاب صُفّہ کا ایک مستقل حلقۂ درس قایم ہو گیا اور یہ لوگ شب و روز قرآن مجید کی تعلیم و تعلم میں مصروف رہنے لگے۔ اس حلقہ میں درس و تدریس کا یہ طریقہ تھا کہ ایک شخص قرآن مجید پڑھتا جاتا تھا اور دوسرے لوگ سنتے جاتے تھے محنت اور جفاکشی جو اسلامی تعلیم و تربیت کا ایک لازمی جز و ہے اس دور میں ہر زمانے سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ چنانچہ اصحاب صُفّہ میں چند لوگ ایسے تھے کہ دن کو شیریں پانی بھر لاتے تھے جنگل سے لکڑیاں چن لاتے تھے اور اُن کو بیچ کر وجہ معاش حاصل کرتے تھے لیکن اس مصروفیت کی وجہ سے اُن کو دن میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ اس بناء پر یہ لوگ رات کو مدینہ کے ایک معلم کے پاس جا کر صبح تک قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے تھے[۲]۔ باہر سے جو مہاجرین آتے وہ بھی اہل صفہ کے حلقہ درس میں داخل ہو جاتے اور قرآن مجید کی تعلیم حاصل کر کے اپنے وطن واپس جاتے۔

اس سلسلہ سے الگ انصار کا ہر گھر مہمان خانہ ہونے کے ساتھ ایک مستقل مکتب بن گیا تھا باہر سے جو مہاجر آتے رسول اللہ صلعم اُن کو انصار کے سپرد کر دیتے اور وہ لوگ مہمانداری کے ساتھ اس دلسوزی سے اُن کو کتاب و سنت کی تعلیم دیتے کہ یہ لوگ نہایت شکرگزاری کے

---

[۱] مسند جلد ۴ صفحہ ۲۹۱ و بخاری کتاب التفسیر تفسیر سبح اسم ربک الاعلی

[۲] مسند جلد ۳ صفحہ ۱۳۷

ساتھ واپس جاتے چنانچہ وفد عبد القیس آیا تو اس منت شناسانہ اعتراف کے ساتھ واپس گیا۔

ان الانصار یعلمونا کتاب ربنا وسنۃ نبیناؐ [1] (انصار ہم کو ہمارے خدا کی کتاب اور ہمارے پیغمبر کی سنت سکھاتے ہیں)

نظام حکومت کے قایم ہوجانے کے بعد رسول اللہ صلعم نے جو امراء و عمال مقرر فرمائے ان کا سب سے مقدم فرض کتاب و سنت کی تعلیم دینا تھا، چنانچہ آپ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا عامل مقرر فرما کر روانہ فرمایا تو اس کا مقصد یہ قرار دیا کہ

لیعلم الناس القرآن وشرائع الاسلام [2] تاکہ وہ لوگوں کو قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم دیں۔

اس زمانے میں علم حدیث کی تعلیم کے لئے کوئی باقاعدہ حلقۂ درس نہ تھا بلکہ جن لوگوں کو جس قدر شرف صحبت حاصل ہوتا تھا اسی قدر ان کو احادیث کے یاد کرنے کا زیادہ موقع ملتا تھا اصحاب صفہ میں حضرت ابو ہریرہؓ چونکہ ہمہ وقت رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اس لئے ان کو کثرت سے احادیث کے یاد کرنے کا موقع ملا۔ صحیح حدیث کے یاد رکھنے اور دوسروں تک پہونچانے کی سخت تاکید تھی اور غلط حدیث روایت کرنے پر سخت تہدید۔

خلافت راشدہ کے زمانے میں اس سلسلہ کو اور وسعت حاصل ہوئی، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں تمام ممالک مفتوحہ میں تعلیم قرآن کے لئے مکاتب قایم کئے اور بعض حالتوں میں قرآن مجید کی جبری تعلیم کا انتظام کیا۔ اس کے علاوہ متعدد صحابہ کو خاص اس مقصد سے مختلف ممالک میں روانہ کیا۔ شام فتح ہوا تو وہاں کے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے حضرت عبادہ بن صامتؓ کو جو عہد نبوت ہی میں معلم قرآن تھے روانہ فرمایا اور ان کے ساتھ حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابو الدرداءؓ کو بھی کر دیا۔ چنانچہ ان بزرگوں میں حضرت عبادہ بن صامتؓ نے حمص میں قیام کیا حضرت ابو الدرداءؓ دمشق کو گئے اور حضرت معاذؓ نے فلسطین میں اقامت اختیار کی۔ اس کے بعد حضرت عبادہ بن صامتؓ بھی فلسطین چلے گئے [3]

[1] مسند جلد ۳ صفحہ ۴۳۲ [2] استیعاب تذکرہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالے عنہ

[3] اسد الغابۃ تذکرہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالے عنہ

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بصرہ کا گورنر مقرر فرما کر بھیجا تو ان کے ساتھ حضرت عمران بن حصینؓ کو کر دیا کہ لوگوں کو فقہ اور قرآن مجید کی تعلیم دیں۔ اُن کے بعد اور خلفاء نے بھی کم وبیش اس سلسلہ کو قایم رکھا۔

اس زمانہ میں علم حدیث کی تعلیم کا سلسلہ بھی اسی وسعت کے ساتھ قائم ہوا چنانچہ صحابۂ کرامؓ اشاعت حدیث کے لئے تمام ممالک مفتوحہ میں پھیل گئے اور لوگوں کو نہایت شوق کے ساتھ حدیث کی تعلیم دی۔ حضرت ابوادریس تولانی کا بیان ہے کہ میں حمص کی مسجد میں گیا تو ایک حلقہ میں جس میں ۳۲ بتیس صحابی تھے بیٹھ گیا ایک شخص روایت حدیث کر چکتا تو دوسرے بزرگ اس سلسلہ کو شروع کرتے۔[۱]

مصر میں عاصم اللیثی کا بیان ہے کہ میں کوفہ کی مسجد میں گیا تو ایک حلقہ نظر آیا جو نہایت خاموشی کے ساتھ ایک شخص کی طرف کان لگائے ہوئے تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ حضرت حذیفہ بن اسحق ہیں۔[۲]

حضرت ابودرداء دمشق میں رہتے تھے اور جب درس دینے کے لئے مسجد میں آتے تھے تو اُن کے ساتھ طلباء کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا جس قدر بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے۔[۳]

حضرت جابر بن عبداللہؓ خاص مسجد نبوی میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیتے تھے۔[۴]

قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ فقہ کی تعلیم بھی نہایت وسعت کے ساتھ جاری تھی چنانچہ شام فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے جن صحابہ کو قرآن پاک کی تعلیم کے لئے روانہ فرمایا تعلیم فقہ کی خدمت بھی اُن سے متعلق کی حضرت عبدالرحمٰن قاسم کو بھی شام میں یہ خدمت تفویض ہوئی اور انھوں نے شام کے تمام تابعین کو فقہ سکھائی۔[۵] بصرہ کے لوگوں کی تعلیم فقہ کے لئے حضرت عمران بن حصینؓ اور حضرت عبداللہ بن معقلؓ کو روانہ فرمایا تو ان کے ساتھ اور بھی آٹھ بزرگوں کو اس مقصد کے لیئے

---

[۱] مسند جلد ۵ صفحہ ۲۲۸ [۲] مسند جلد ۵ صفحہ ۳۸۶ [۳] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ حضرت ابوالدرداء

[۴] حسن المحاضرہ جلد اول صفحہ ۷۰ [۵] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عبدالرحمٰن بن عم اشعری رضی اللہ عنہ

ساتھ کر دیا[۱]۔ مصر میں تعلیم فقہ کے لئے حضرت حبان بن جبلہ رضؓ کو ایک جماعت کے ساتھ روانہ فرمایا[۲]۔ اور مداین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ اس خدمت پر مامور تھے[۳]۔

حضرت امیر معاویہؓ نے بھی اپنے عہد میں اس نظام کو قایم رکھا چنانچہ قاضی ابن عبدالبر حضرت ربیعہ بن عمر الجرشی رضؓ کے حال میں لکھتے ہیں۔

کان یفقه الناس زمن معاویة[۴] وہ امیر معاویہ کے زمانے میں لوگوں کو فقہ کی تعلیم دیتے تھے

وحی کے پہلے الفاظ میں فضلِ ربانی کی اول شان تعلیم بالقلم فرمائی ہے اس کا اثر تھا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تحریر و کتابت سے بھی بے پروائی نہ تھی۔ چنانچہ عہد نبوت ہی میں جب اسیرانِ بدر گرفتار ہوئے تھے تو اُن میں جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ دے کر آزاد نہیں ہو سکتے تھے رسول اللہ صلعم نے اُن کا فدیہ یہ قرار دیا کہ یہ لوگ انصار کے بچوں کو لکھنا سکھا دیں چنانچہ انصار کے بچوں نے اُن سے لکھنا سکھیا حضرت عبادہ بن صامت رضؓ اہل صفہ کو قرآن مجید کی جو تعلیم دیتے تھے تحریر و کتابت بھی اُس کا جزو تھی۔ خلفاء کے زمانے میں جو مکاتب قایم ہوئے اُن میں بھی یہ خصوصیت قایم رہی۔ چنانچہ تاریخوں میں متعدد واقعات مذکور ہیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس دور کی تعلیمی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱)۔ قرآن۔ حدیث اور فقہ کے سوا کسی دوسرے علم کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔

(۲)۔ تعلیم کتابی نہ تھی یعنی قرآن کے سوا حدیث اور فقہ بالکل زبانی پڑھائی جاتی تھی۔

(۳)۔ عہد نبوت تک تعلیم پر تنخواہ تو درکنار ہدیۃً بھی کسی چیز کے لینے کی ممانعت تھی۔ چنانچہ ایک مہاجر نے جس نے حضرت عبادہ بن صامت رضؓ سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تھی اپنے وطن سے اُن کی خدمت میں ہدیۃً ایک کمان بھیجی تو رسول اللہ صلعم نے اس کے لینے سے منع فرما دیا[۶]۔

---

۱ طبقات الحفاظ تذکرہ عمران بن حصین رضؓ و اسد الغابہ تذکرہ عبداللہ بن مغفل رضؓ ۲ تہذیب تذکرہ حبان بن جبلہ رضؓ

۳ یعقوبی جلد دوم صفحہ ۱۷۳ ۴ استیعاب تذکرہ ربیعہ بن عمرو الجرشی ۵ اسد الغابہ ترجمہ حضرت عبداللہ بن العاصی رضؓ ۶ ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الکسب المعلم

(۴) اساتذہ طلباء کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کرتے تھے چنانچہ ابوہرون عبدی کا بیان ہی کہ ہم لوگ حضرت ابو سعید خدری رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو وہ کہتے تھے "مرحبا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہی کہ تمھارے پاس دنیا کے گوشے گوشے سے بہت سے لوگ تحصیل علم کے لئے آئینگے تم لوگ ان کے ساتھ بھلائی کرنا" ؎۱

(۵) تحصیل علم کے ساتھ کسی دنیوی غرض کا شامل کرنا جائز نہ تھا چنانچہ ایک بار حضرت ابوالدرداء رضؓ کی خدمت میں مدینہ سے ایک آدمی آیا اور کہا کہ میں آپ کی خدمت میں صرف ایک حدیث کے لئے آیا ہوں جس کی آپ روایت کرتے ہیں۔ بولے کسی ضرورت سے تو نہیں آئے؟ تجارت کی غرض سے تو آنا نہیں ہوا؟ اُس نے کہا "نہیں" تو حدیث کی روایت کی۔

(۶) اس دور میں تعلیم کے لئے سفر کرنا اس قدر ضروری تھا کہ ایک موقع پر رسول اللہ صلعم نے ایک حدیث بیان فرمائی تھی۔ حضرت سائب بن خلاد رضؓ اور حضرت عقبہ بن عامر رضؓ بھی اس موقع پر موجود تھے لیکن بعد میں حضرت سائب رضؓ کو اس حدیث کے متعلق وہم پیدا ہوا اور وہ ازالۂ شک کے لئے مصر میں حضرت عقبہ رضؓ کے پاس گئے اور پہلے مسلمہ بن مخلد کے دروازے پر حاضر ہوئے۔ اُنھوں نے اُن کو مہمان بنانا چاہا لیکن اُنھوں نے کہا کہ پہلے عقبہ سے میری ملاقات کروا دیجئے۔ وہ ایک گاؤں میں تھے وہ وہاں گئے اور اس حدیث کی تصدیق کر کے واپس آئے۔ ؎۲

اسی طرح حضرت جابر رضؓ بھی مصر میں حضرت عبداللہ بن انیس رضؓ کے پاس آئے اور اُن سے ایک حدیث سُنی۔ ؎۳

اس زمانے کے بعد بنو امیہ کا دور آیا جنھوں نے اگرچہ سیاسی حیثیت سے اسلام کے نظام حکومت کو بہت کچھ بدل دیا تاہم تعلیم کا جو طریقہ ابتدا سے چلا آتا تھا اُس میں کسی قسم کی

؎۱ سنن ابن ماجہ باب الوصاۃ بطلبۃ العلم۔ ؎۲ حسن المحاضرہ جلد ۱ صفحہ ۸۶۔ ؎۳ " جلد ۱ صفحہ ۷۸

بخاری کتاب العلم میں بھی اسکا تذکرہ اجمالاً ہی۔ دیکھو باب الخروج فی طلب العلم

تبدیلی نہیں کی بلکہ اُس کو اور بھی زیادہ وسیع، منتظم اور باقاعدہ کر دیا۔

مسلمانوں کی تعلیم کا سب سے بڑا محور قرآن مجید تھا جو اگرچہ خلفائے راشدین کے عہد میں مدون و مرتب ہو چکا تھا لیکن وہ اب تک غیر معجم یعنی غیر منقوط تھا اگرچہ اہل عرب کے لئے اس کی قرأت میں چنداں دقت نہ تھی لیکن جب عجمی قومیں اسلام لائیں تو اُن کو اس کی قرأت میں دشواریاں پیش آئیں اور عراق میں اس کے متعلق سخت غلطیاں پھیل گئیں۔ حجاج نے یہ حالت دیکھی تو فوراً اس کا تدارک کیا اور قرآن مجید میں اعراب اور نقطے لگوا کر تمام ملک میں اُس کے متعدد نسخے تقسیم کئے۔ ۱ھ

حفظ قرآن کا جو طریقہ ابتدا ہی سے قائم تھا۔ ولید کی ترغیبات و ترہیبات نے اُس کو اور بھی زیادہ باقاعدہ کر دیا چنانچہ وہ لوگوں کو ہمیشہ حفظ قرآن کی ترغیب دیتا تھا۔ حفاظ کو نہایت فیاضانہ صلے عطا کرتا تھا، اور جو لوگ قرآن کو حفظ نہیں کرتے تھے ان کو سزا دیتا تھا۔ ۲ھ

تفسیر کی پہلی کتاب بھی اسی عہد میں ابن جبیر نے عبد الملک کے حکم سے لکھی۔ ۳ھ

احادیث کا سرمایہ جو اب تک متفرق و پراگندہ تھا اُس کی نسبت حضرت عمر بن عبد العزیز نے قاضی ابو بکر بن حزم کو جو اُن کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے لکھا:

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم و ذھاب العلماء ولا یقبل الا حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ۴ھ احادیث نبویہ کی تلاش کر کے اُن کو لکھو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہونے کا خوف معلوم ہوتا ہے اور صرف رسول اللہ صلعم کی حدیث قبول کی جاوے۔

حافظ ابن حجر کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم مدینہ کے گورنر کے ساتھ مخصوص نہ تھا

۱ھ - ابن خلکان تذکرہ حجاج ۲ھ عقد الفرید اخبار ولید و ابن اثیر واقعات سنہ ۳ھ میزان الاعتدال ذہبی ذکر عطاء بن دینار ۴ھ بخاری کتاب العلم باب

بلکہ انھوں نے تمام صوبوں کے گورنروں کے پاس یہ حکم بھیجا تھا[1] جب اس حکم کی تعمیل ہوگئی تو اُنھوں نے احادیث کے متعدد مجموعے تیار کرا کے تمام ممالک محروسہ میں تقسیم کئے۔ چنانچہ

جامع بیان العلم میں سعد بن ابراہیم سے روایت ہے

امرنا عمر بن عبد العزیز بجمع السنن فکتبناها دفترا دفترا فبعث الی کل ارض له سلطان دفترا[2]

ہم کو حضرت عمر بن عبد العزیز نے جمع حدیث کا حکم دیا تو ہم نے دفتر کی دفتر حدیثیں لکھیں اور اُنھوں نے اُن کا ایک ایک مجموعہ اپنے تمام حدود حکومت میں روانہ فرمایا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے جمع حدیث کا جو حکم دیا تھا اُس کا مقصد صرف فن حدیث کی تعلیم و اشاعت تھا۔ چنانچہ اپنے فرمان میں قاضی ابوبکر بن حزم کو ان الفاظ میں اُس کی طرف توجہ دلائی:

ولیفشوا العلم ولیجلسوا حتی یعلم من لا یعلم فان العلم لا یهلك حتی یکون سرا

علماء کو چاہئے کہ عام طور پر علم کی اشاعت کریں اور تعلیم کے لئے حلقۂ درس میں بیٹھیں تاکہ جو لوگ نہیں جانتے وہ لوگ جان لیں کیونکہ علم صرف اسی وقت برباد ہوتا ہے جب وہ راز بن جاتا ہے۔

ایک اور عامل کے نام لکھا۔

اما بعد، فامر اهل العلم ان ینشروا العلم فی مساجدهم فان السنة کانت قد امیتت[3]

اہل علم کو حکم دو کہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں کیونکہ حدیثیں مرچکی ہیں۔

چنانچہ جو لوگ اس مقدس کام میں مصروف ہوئے اُن کو فکر معاش سے بالکل بے نیاز کر دیا اور حمص کے گورنر کو لکھا:

انظر الی القوم الذین نصبوا انفسهم للفقه وحبسوها فی المسجد عن طلب الدنیا فاعط

جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر اپنے آپ کو فقہ کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا ہے اُن میں

---

[1] فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۱۷۴ [2] جامع بیان العلم صفحہ ۳۸۔

[3] سیرت عمر بن عبد العزیز

کل رجل منھم مائۃ دینار یستعینون بھا علیٰ ما ھم علیہ من بیت المال المسلمین[۱]

ہر ایک کو بیت المال سے سو سو دینار دو تاکہ وہ لوگ موجودہ حالت میں اس سے مدد حاصل کریں۔

یہ فیاضی صرف اساتذہ کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ انھوں نے اسی فیاضی کے ساتھ طلباء کے وظائف بھی مقرر فرمائے۔[۲]

جو ممالک دور افتادہ تھے وہاں کے لوگوں کی تعلیم کے لئے خود متعدد علماء کو روانہ کیا چنانچہ حضرت نافع کو مصر بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو علم حدیث کی تعلیم دیں[۳]۔ جعثل بن عاہان کو جو قراء میں تھے مصر سے مغرب کو بھیجا کہ وہاں جاکر لوگوں کو قرارت سکھائیں[۴]۔ بدوؤں کی تعلیم و تربیت کے لئے یزید بن ابی مالک الدمشقی اور حارث بن یمجد الاشعری کو متعین کیا۔ اور اُن کے وظیفے مقرر فرمائے۔[۵]

مصر میں افتاء کی خدمت پر یزید بن ابی حبیب کو مقرر فرمایا جنھوں نے سب سے پہلے اہل مصر کو فقہ و حدیث سے آشنا کیا ورنہ وہ اس سے پہلے صرف ترغیب اور جنگ وغیرہ کے متعلق حدیثیں روایت کرتے تھے۔ احکام حلال و حرام کی ان کو خبر نہ تھی۔[۶]

فن مغازی اور مناقب کے ساتھ خاص طور پر اعتناء کیا۔ اور عاصم بن عمر بن قتادہ کو جو مغازی اور سیرت میں کمال رکھتے تھے حکم دیا کہ مسجد دمشق میں بیٹھ کر مغازی اور مناقب کا درس دیں۔[۷]

مذہبی علوم و فنون کے علاوہ اس زمانے میں یونانی علوم و فنون بھی عربی زبان میں منتقل ہوئے چنانچہ ابن آثال نے حضرت معاویہ کے لئے یونانی زبان سے عربی زبان میں طب کی کتابوں کا ترجمہ کیا اور اسلام میں یہ پہلا ترجمہ تھا جو غیر زبان سے کیا گیا۔

---

[۱] سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن الجوزی صفحہ ۹۵ [۲] جامع بیان العلم صفحہ ۸۰ [۳] حسن المحاضرہ جلد اول صفحہ ۱۱۹ زرقانی شرح موطا جلد اول صفحہ ۲۱۔ [۴] حسن المحاضرہ جلد اول صفحہ ۱۱۹۔ [۵] سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی صفحہ ۴۲ [۶] حسن المحاضرہ جلد اول صفحہ ۱۲۰۔ [۷] تہذیب التہذیب ترجمہ عاصم بن عمر بن قتادہ۔

مروان بن حکم کے زمانہ میں بصرہ میں ایک یہودی طبیب ماسرجویہ تھا جس نے سریانی سے طب کی ایک کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جو خزانہ شاہی میں محفوظ رکھا گیا چنانچہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انھوں نے شام کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ پایا اور عام طور پر اس کی نقلیں ملک میں شائع کیں[۱]۔ اس کے علاوہ خالد بن یزید بن معاویہ نے جو طب اور کیمیا کا بہت بڑا ماہر تھا متعدد فلسفیانہ کتابوں کا ترجمہ کرایا اور حکمار کی ایک جماعت سے یہ کام لیا۔

ان علوم کے علاوہ لغت، شاعری اور تاریخ وغیرہ کے متعلق بھی اس عہد میں کتابیں تصنیف ہوئیں اور اس طرح تقریباً تمام اسلامی علوم وفنون کی تدوین وتالیف کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ان تغیرات کی بنار پر حسب ذیل تعلیمی خصوصیات پیدا ہوگئیں:

(۱) تمام علوم وفنون کا سرمایہ سینوں سے نکل کر سفینوں میں آگیا۔

(۲) تصنیف وتالیف کا سلسلہ قایم ہوا۔

(۳)۔ غیر زبانوں کے علوم وفنون کا ترجمہ ہوا۔ لیکن یہ علوم نصاب تعلیم کا جزو نہیں قرار پائے۔

حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے شرف سے انھی علمار کو مشرف فرمایا ہے جو اپنے علم پر عامل ہوں۔ عالم بے عمل کی سخت مذمت ہے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ قرون اولےٰ میں عموماً یہ دلی عقیدت تھی کہ علم کا حاصل کرنا عمل کی ذمہ داری ساتھ لاتا ہے۔ ذمہ داری یا فرض کا اخلاص و صداقت کے ساتھ ادا کرنا اس عہد میں مقصد زندگی تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ استاد کا پڑھانا، شاگرد کا پڑھنا عمل کرنے کے لئے ہوتا تھا اس لئے ان کا علم عمل ساتھ ساتھ رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس تعلیم سے میدان زندگی میں وہ اہل کمال پیدا ہوئے جن کی مثالیں تاریخیں نہیں بتا سکتیں۔ سپہ سالاری۔ حکومت سفارت، آبادی ممالک غرض جس شعبۂ زندگی کے لئے آدمی درکار ہوئے اسی حلقۂ درس سے نکلے اور کامل نکلے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا علم سے عمل جدا ہوتا گیا۔ اس جدائی نے وہ

---

[۱] اخبار الحکماء تذکرہ ماسرجویہ۔

تباہی دکھائی جو آج ہر طرف پیش نظر ہے۔

(۴)۔کتب خانہ قایم ہوا۔

(۵)۔علماء و طلباء کے وظائف مقرر کئے گئے اور حفظ قرآن کا جبری طریقہ قایم کیا گیا۔

خلفائے بنو امیہ کے بعد خلفائے عباسیہ کا دور آیا اور غیر قوموں کے علوم و فنون کی جو ابتدا اموی دور میں ہو چکی تھی اُس کو عباسی دور نے تکمیل کے درجہ تک پہونچا دیا اس دور میں نہ صرف یونانی علوم و فنون کے ترجمے کئے گئے۔ بلکہ مصر، ایران اور ہندوستان کا تمام علمی سرمایہ عربی زبان میں آگیا لیکن باوجود اس علمی انقلاب کے عام طریقہ تعلیم میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا ہوا۔ اموی دور میں جو علوم و فنون مثلاً حدیث، تفسیر، فقہ، لغت اور نحو وغیرہ پیدا ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں بھی انھی علوم کی تعلیم جاری رہی جو طرز تعلیم پہلے تھا وہی اس زمانہ میں بھی قائم رہا یعنی اس زمانہ تک کتابی تعلیم کا طریقہ نہ تھا بلکہ استاد کسی علم پر کھڑے ہو کر لکچر دیتا تھا اور طلبہ اس کو سنتے جاتے اور استاد کے افادات کو قلمبند کرتے جاتے تھے۔ عربی زبان میں اس طریقہ کا نام املا ہے۔ اور اس دور میں اس طریقہ نے اس قدر وسعت حاصل کی تھی کہ ایک ایک استاد کے حلقۂ درس میں ہزاروں طالب علم مشغول نظر آتے تھے۔ علامہ ذہبی نے طبقات میں ابو النقی المتوفی ۲۵۱ھ کے ترجمے کے بعد لکھا ہے کہ "اس زمانہ کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیث نبوی لکھتے تھے۔ فرا نحوی نے جب کتاب المعانی کا لکچر دیا تو حاضرین میں سے اسی صرف قاضی تھے۔ طلباء اساتذہ کے جن افادات کو لکھتے جاتے تھے اُن کا مجموعہ ایک کتاب بن جاتا تھا جس کو امالی کہتے ہیں۔ امالی میں درید و تعلب وغیرہ اسی قسم کی تصنیفات ہیں جب معمولی سے زیادہ طلباء حلقۂ درس میں حاضر ہوتے تھے تو اُستاد کے سامنے یا داہنے بائیں چند فاضل کھڑے ہو جاتے تھے جو دور والوں کو اُستاد کے خاص الفاظ سنا سکتے تھے یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے۔

یہ طریقۂ تعلیم منقولی علوم کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ ابو بشر متی بغداد میں ارسطو کی کتاب المنطق کا درس بھی اسی طریقہ پر دیتا تھا اور اس کے لکچر میں سیکڑوں طلبہ شریک ہوتے تھے جن میں ایک فارابی بھی تھا۔[۱]

فلسفہ و منطق کے ساتھ ساتھ اس زمانہ میں ایک اور علم بھی پیدا ہوا جس کو علم کلام کہتے ہیں۔ چونکہ فلسفہ اور علم کلام دونوں ایک دوسرے کے حریف تھے اس لئے ان دونوں کے اختلافی مسائل نے اس زمانہ میں مناظرے کا طریقہ پیدا کیا اور باہمی اختلافات نے بھی اس کو ترقی دی۔ اس طریقہ نے اگرچہ علماء و طلباء کی ذہانت، طباعی، حاضر جوابی اور زود رسی کو نہایت فائدہ پہونچایا۔ لیکن اس سے اخلاق کو سخت صدمہ پہونچا، علماء میں جو رشک و حسد تشتت و اختلاف، جنگ و جدل اور ضد و ہٹ دھرمی پائی جاتی ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے، چنانچہ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں آفات المناظرہ کے عنوان سے خصوصیت کے ساتھ اس کے اخلاقی نقصانات بتائے ہیں۔

مدارس کی ابتداء یہ طریقہ تعلیم جب تک جاری رہا تعلیم خانقاہوں کے حجروں، مساجد کے صحنوں اور علماء کے مکانات میں محدود رہی لیکن ۴۵۷ھ میں مدارس کی بنیاد پڑی، اور ایک ہی صدی کے اندر اندر تمام اسلامی ممالک ان سے معمور ہو گئے اور آج ہماری نگاہیں جن سروسامان کو ڈھونڈھ رہی ہیں اسلامی تمدن نے اُن سب کو چند ہی دنوں میں مہیا کر دیا۔ مثلاً نظام الملک طوسی نے نظامیہ بغداد کو قایم کیا تو دو لاکھ دینار اُس پر وقف کئے اور پندرہ ہزار دینار سالانہ اس کے صرف کے لئے مقرر کئے اور طلباء کے وظیفے اور تنخواہیں مقرر کیں۔ خلیفہ مستنصر باللہ نے بغداد میں جو مدرسہ مستنصریہ کے نام سے قایم کیا اس کا سلسلہ عمارت چھ برس میں مکمل ہوا۔ مذاہب اربعہ کے فقہاء اور شیخ الحدیث، شیخ النحو، شیخ الفرائض اور شیخ الطب درس کے لئے مقرر ہوئے۔ ایک سو ساٹھ اونٹوں پر لاد کر عمدہ عمدہ کتابیں

---

[۱] "قدیم تعلیم" مندرجہ رسائل شبلی۔

کتب خانہ شاہی سے اُس کے استعمال کے لئے آئیں۔ مدرسہ ہی کے احاطہ میں ایک شفاخانہ اور رمزملہ بھی بنایا گیا جس سے گرمیوں میں پانی ٹھنڈا کرتے ہیں۔ دو سو اڑتالیس طلبا مدرسہ کے کھلنے کے ساتھ ہی بورڈنگ میں داخل ہوئے جن کو مکان، فرش، خوراک روغن، کاغذ، قلم وغیرہ مدرسہ کی طرف سے ملتا تھا۔ ان کے دسترخوان پر معمولی کھانے کے علاوہ شیرنی اور میوے بھی چنے جاتے تھے۔ ان سب کے علاوہ ایک اشرفی ماہوار الگ وظیفہ کے طور پر مقرر تھی۔ سینکڑوں دیہات اور مواضع مدرسہ کے سالانہ مصارف کے لئے وقف تھے جن کی مجموعی آمدنی ستر ہزار مثقال سونا یعنی آج کل کے حساب سے قریباً ساڑھے چار لاکھ سالانہ تھی لیکن بایں ہمہ جو لوگ علم کو صرف علم کے لئے پڑھنا چاہتے تھے اُنھوں نے ان شاندار درسگاہوں کا خیر مقدم مسرت کے ساتھ نہیں کیا، بلکہ جب نظامیہ بغداد قایم ہوا تو علماء ماوراءالنہر نے ایک مجلس ماتم منعقد کی اور اس بات پر روئے کہ اب علم علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ و ثروت حاصل کرنے کے لئے سکھایا جائیگا۔ [۱]

مدارس کا اثر تعلیم اور طریقہ تعلیم پر چوتھی صدی تک ممالک اسلامیہ میں جو تعلیم جاری تھی اُس کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھیں:

(۱)۔ تعلیم مذہب کا ایک جزو بن گئی تھی اور اس کی یہ خصوصیت آج تک قایم ہی۔

(۲)۔ تعلیم مسجدوں اور علماء کی خاص درسگاہوں میں مقید نہ تھی بلکہ وزرا، حکام، فوجی افسر اہلِ منصب اور ہر طبقے کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ وزارت کے کثیر الاشغال اوقات میں بھی بوعلی سینا کی خدمت میں مستعد طلباء کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

(۳)۔ تعلیم میں نہایت آزادی تھی کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا حاصل کر سکتا تھا۔ اہلِ کمال کے زمرے میں سیکڑوں بزرگ گزرے ہیں جو ایک فن کے امام تھے لیکن دوسرے فنون میں معمولی طالب العلم کا درجہ بھی نہیں رکھتے تھے۔

---

[۱]۔ "اسلامی مدارس و دارالعلوم" مندرجہ رسائل شبلی۔

(۴) - امراء اور اہل منصب کا گروہ جو شایقین علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا اور صحیح تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا۔

مدارس قایم ہوئے تو ابتداءً ان خصوصیات میں دفعتہً کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی نصاب تعلیم قریباً وہی رہا جو پہلے تھا۔ پرائیویٹ تعلیم گاہیں عموماً قایم رہیں اور سچ تو یہی کہ جب تک اُن پر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس ہو گیا جس سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوئے:

(۱) - تعلیم ایک خاص نصاب کی پابند ہو گئی۔

(۲) - مدت تعلیم معین کی گئی۔

(۳) - متواتر امتحانات کا طریقہ قایم ہوا۔

(۴) - علماء کو ملکی عہدے ملنے لگے۔ اس لئے دینی تعلیم گویا دنیوی تعلیم بن گئی۔

(۵) - املا کا طریقہ جاتا رہا۔

(۶) - یہ مدرسے اکثر مذہبی تھے اور کسی ایک مذہب کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے اس خصوصیت نے مذہب پر یہ اثر ڈالا کہ تقلید شخصی کو جس کی بنیاد چوتھی صدی میں پڑ چکی تھی ان مدارس نے محسوس صورت میں اور بھی نمایاں کر دیا۔ اس لئے قوم میں اس کا شدت کے ساتھ رواج ہوا اور اس کے لازمی نتائج یعنی تعصب وغیرہ بھی ساتھ ساتھ پیدا ہو گئے۔ رفتہ رفتہ تقلید کے عام رواج نے علمی اختراعات وایجادات کی قوت کو اس قدر گھٹا دیا کہ گویا قوم سے اجتہاد کی قابلیت ہی جاتی رہی۔

ہندوستان کا نصاب تعلیم | ان مدارس کے قایم ہونے کے بعد مسلمانوں کے نظام تعلیم میں جو ابتریاں پیدا ہو چلی تھیں وہ ساتویں صدی تک اس قدر نمایاں ہو گئیں کہ علامہ ابن خلدون کو مقدمہ تاریخ میں اُس کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی زمانہ سے ہندوستان

کی تعلیمی تاریخ شروع ہوتی ہی۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہی کہ اس کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی جو روز بروز نمایاں ہوتی گئی۔

ہندوستان میں جو نصاب تعلیم رواج پذیر ہوا اُس کے متعدد دور ہیں۔

دور اوّل[1]

اس دور کی ابتدا ساتویں صدی ہجری سے ہوئی اور اس کا خاتمہ دسویں صدی پر ہوا۔ اس دور میں کم وبیش دو سو برس تک مندرجہ ذیل فنون کی تعلیم معیار فضیلت خیال کی جاتی تھی: صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر، حدیث اور ان علوم کی حسب ذیل کتابیں داخل درس تھیں:

نحو۔ مصباح، کافیہ، لب الالباب مصنفہ قاضی ناصرالدین بیضاوی (اور چند دنوں کے بعد ارشاد مصنفہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی)

فقہ ہدایہ۔

اصول فقہ منار اور اس کے شروح اور اصول بزدوی۔

تفسیر مدارک، بیضاوی اور کشاف۔

تصوّف عوارف اور خصوص (اور ایک زمانہ کے بعد نقد الفصوص ولمعات بھی اُن مدارس میں رائج ہوگئیں جو خانقاہوں سے متعلق تھے)

حدیث میں مشارق الانوار اور مصابیح السنۃ (یعنی مشکوٰۃ المصابیح کا متن)

ادب میں مقامات حریری جو زبانی یاد کی جاتی تھی۔

منطق میں شرح شمسیہ

کلام میں شرح صحائف اور بعض بعض مقامات پر تمہید ابوشکور سالمی (ندوہ نے بھی اس کو اپنے نصاب درس میں داخل کیا ہی)

اس دور میں حدیث کے ساتھ سخت بے اعتنائی کی جاتی تھی، اور صرف فقہ اور

---

[1] نوٹ صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ ہو۔

اصول فقہ کو معیار فضیلت خیال کیا جاتا تھا۔

دورِ دوم

نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ ملتان سے آئے اور شیخ عبداللہ دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ سنبھل میں فروکش ہوئے۔ سکندر لودی نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا یہاں تک کہ خود اُن کے حلقۂ درس میں آکر شریک ہوتا تھا اور اس خیال سے کہ اُس کے آنے سے سلسلۂ درس برہم نہ ہوجائے مسجد کے کسی گوشہ میں بیٹھ کر اُن کی تقریر سے محظوظ ہوتا تھا۔

ان دونوں کے فضل وکمال اور بادشاہ کی قدردانی سے اُن کی علمی شہرت بہت جلد تمام ہندوستان میں پھیل گئی اور انھوں نے معیار فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لئے قاضی عضد کی تصانیف، المطالع و مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم کو نصاب درس میں داخل کیا، اور یہ کتابیں بہت جلد علماء و طلباء کے حلقہ میں متداول ہوگئیں۔

چنانچہ ملّا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں۔

واز جملہ علمائے کبار در زمان سلطان سکندر شیخ عبداللہ طلبنی در دہلی و شیخ عزیز اللہ طلبنی در سنبھل بودند و این ہر دو عزیز ہنگام خرابی ملتان بہندوستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند و قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نبود۔

اسی دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف کو رواج دیا اور علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے مطول مختصر تلویح اور شرح عقائد نسفی کو رواج دیا۔ اسی زمانہ میں شرح وقایہ اور شرح ملّا جامی بھی رفتہ رفتہ داخل نصاب ہوگئیں۔

نوٹ ص ۳۲ ۔ مولانا سید عبدالحی صاحب ناظم ندوۃ العلماء نے الندوہ ۱۳۲۷ھ کے پہلے نمبر میں ہندوستان کے نصاب درس پر ایک محققانہ مضمون لکھا ہے۔ اور ہم نے تمہید کو چھوڑ کر اس موقع پر اسی کو درج کر دیا ہے۔

اس دور کے سب سے آخری مگر سب سے زیادہ نامور عالم شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہندوستان سے عرب تشریف لے گئے اور تین برس رہ کر علمائے حرمین محترمین سے حدیث کی تکمیل کی اور اور اس مقدس تحفہ کو اپنے ساتھ لائے اور اُنھوں نے اور ان کی نامور اولاد نے ہمیشہ اس کی اشاعت کی کوشش کی مگر افسوس ہی کہ اُس کو قبولیت عام حاصل نہیں ہوئی اور یہ شرف زمانہ مابعد میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے لئے مقدر تھا جو اُن کو حاصل ہو گیا۔

اس طبقہ کے علمائے کرام کے حالات سے معلوم ہوتا ہی کہ جس طرح ہمارے زمانہ میں صدرا اور شمس بازغہ منتہائیہ کتابیں سمجھی جاتی ہیں اُسی طرح اُس زمانہ میں مفتاح العلوم سکاکی اور مطالع و مواقف للقاضی عضد منتہائیہ کتابیں خیال کی جاتی تھیں۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں مفتی جمال خاں کے حال میں لکھا ہی:

بر شرحین مفتاح محاکمہ کردہ و عضدی را کہ کتاب منتہائیہ است می گویند کہ چہل مرتبہ از اول تا آخر درس گفتہ (جلد سوم منتخب التواریخ)

اسی طرح شیخ حاتم کے حال میں لکھتے ہیں:

می گفتند کہ قریب بچہل مرتبہ شرح مفتاح و مطول را از بسم اللہ تا تمت درس گفتہ و بریں قیاس سائر کتب منتہائیہ۔

دور سوم

اس دور میں شاہ فتح اللہ شیرازی نے ہندوستان کے مروجہ نصاب درس میں ایک عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا۔ چنانچہ میر غلام علی آزاد ماثر الکرام میں لکھتے ہیں۔

تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدرالدین و میر غیاث الدین منصور و مرزا جان میر ہندوستان آورد و در حلقہ درس انداخت و جم غفیر از حاشیہ محفل استفادہ کردند و از آں عہد معقولات را رواجے دیگر پیدا شد۔

(عبید اللہ)

لیکن اس موقعہ پر شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کو نہ بھولنا چاہئے، جنھوں نے سب سے پہلے متاخرین کی تصنیفات کو ہندوستان میں رواج دیا۔ چنانچہ قاضی ضیاء الدین جونپوری جو تمنی کے باشندہ تھے۔ گجرات سے یہ تحفہ لے کر آئے، اور شیخ جمال نے اُن سے ان کتابوں کی تعلیم حاصل کر اُن کو دور دور تک پھیلایا۔ ملا لطف اللہ شیخ جمال کے ممتاز شاگرد تھے اُن سے ملا جیون صاحب نور الانوار، ملا علی اصغر، قاضی علیم اللہ، ملا محمد زماں وغیرہ نے ان کی تعلیم حاصل کی اور ان میں ہر شخص صاحب سلسلہ و صاحب درس ہوا۔ لیکن با ایں ہمہ اس نصاب تعلیم کو قبولیت عام اُس وقت حاصل ہوئی جب شاہ فتح اللہ شیرازی نے اُس کو رواج دیا اور اُن کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد نے اس سلسلہ کو اور وسیع کیا۔ مثلاً مفتی عبد السلام نے جو شاہ فتح اللہ کے جلیل القدر شاگرد تھے چالیس سال تک لاہور میں بیٹھ کر درس دیا اور ہزاروں آدمیوں کو فائدہ پہونچایا لیکن ان میں دیوہ کے مفتی عبد السلام اور الہ آباد کے شیخ محب اللہ سب سے زیادہ ممتاز نکلے اور جب لاہور سے پڑھ کر آئے تو خود اپنی مستقل مسند فضیلت قائم کی شیخ قطب الدین سہالوی جو ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ کے پدر بزرگوار تھے بیک واسطہ انھی دونوں کے شاگرد ہیں۔

شاہ ولی اللہ المتوفی ۱۱۷۶ھ نے (جو اس دور کے سب سے آخری مگر سب سے زیادہ نامور عالم تھے) الجزء اللطیف میں اپنی درسی کتابوں کے حسب ذیل نام بتائے ہیں:

نحو میں کافیہ۔

منطق میں شرح شمسیہ، شرح مطالع

فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ

کلام میں شرح عقائد نسفی معہ حاشیہ خیالی، شرح مواقف۔

فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ (کامل)

اصول فقہ میں حسامی اور کسی قدر توضیح و تلویح

بلاغت میں مختصر اور مطول

ہیات وحساب میں بعض رسائل مختصرہ

طب میں موجز القانون

حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح کل، شمائل ترمذی کل، کسی قدر صحیح بخاری۔

تفسیر میں مدارک اور بیضاوی۔

تصوّف میں عوارف ورسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات مقدمہ نقد الفصوص۔

اس نصاب درس کے ختم کرنے کے بعد شاہ صاحب عرب گئے اور وہاں کئی برس رہ کر شیخ ابوطاہر مدنی سے فن حدیث کی تکمیل فرمائی اور ہندوستان میں یہ تحفہ لے کر آئے اور ایسی سرگرمی سے اس کی اشاعت فرمائی کہ باوجود کساد بازاری کے اب تک اُس کا اثر باقی ہی۔ درحقیقت صحاح ستّہ کے درس وتدریس کا رواج ہندوستان میں اُسی وقت سے ہوا جب کہ شاہ صاحب اور ان کے نامور اخلاف نے اُس کو رواج دیا اور اپنی اپنی عمر عزیز کا بیش بہا حصّہ اس کی اشاعت میں صرف کر دیا۔ شاہ صاحب نے اپنی طرز کا ایک جدید نصاب بھی بنایا تھا مگر چونکہ اس زمانہ میں علم کا مرکز نقل دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو چکا تھا اور تمام درس گاہوں میں منطق وحکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کام وزبان آشنا ہو رہے تھے اس لئے اُس نصاب کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی اور غالباً ان کے نامور بیٹوں نے زمانہ کی روش سے مجبور ہو کر اُس کے رواج دینے کی کوشش بھی نہیں کی۔

دورہ چہارم

چوتھا دور بارہویں صدی ہجری میں قایم ہوا اور ملا نظام الدین نے ایسی مضبوط ہاتھوں سے اُس کی بنیاد رکھی کہ اب تک باوجود امتداد زمانہ کے اس کا ایک شوشہ بھی کم نہیں ہوا ملا نظام الدین حضرت شاہ ولی اللہ کے معاصر تھے اس لئے اُن کے زمانہ میں وہی کتابیں

رائج تھیں جو شاہ صاحب کے نصاب درس میں تھیں ان میں ملا صاحب نے مندرجہ ذیل ترمیم و اضافہ فرمایا:

منطق میں بجائے شرح مطالع کے سلم العلوم، میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال۔

فلسفہ میں شمس بازغہ۔

کلام میں میر زاہد، شرح مواقف۔

اصول فقہ میں بجائے حسامی کے نور الانوار، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)

تفسیر میں بجائے مدارک کے جلالین۔

یہی نصاب ہی جس کی ترمیم و اضافہ کے بعد مندرجہ ذیل شکل قایم ہوئی۔

صرف میں میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ۔

نحو میں نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی۔

منطق میں صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم۔

حکمت میں میبذی، صدرا، شمس بازغہ۔

ریاضی میں خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس مقالہ اول، تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیہ، شرح چغمنی باب اول

بلاغت میں مختصر المعانی، مطول، تا ما انا قلت۔

فقہ میں شرح وقایہ، اولین، ہدایہ آخرین۔

اصول فقہ میں نور الانوار، توضیح، تلویح، مسلم الثبوت (مبادی کلامیہ)

کلام میں شرح عقائد نسفی شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف

تفسیر میں جلالین، بیضاوی۔

حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح۔

موجودہ نصاب تعلیم

اس زمانہ میں جو نصاب رائج ہی وہ اسی درس نظامیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہی کیونکہ اس میں منطق کی مندرجہ ذیل کتابوں کا اضافہ بغیر غور و فکر کے خود بخود ہو گیا ہی، غلام یحیٰ

ملاحسن، حمداللہ، قاضی مبارک اور بعض مقامات پر شرح سلم عبدالعلی بحرالعلوم اور حاشیہ عبدالعلی برمیرزاہد رسالہ اور کہیں کہیں شرح سلم ملامبین بھی۔

اس اضافہ کی تاریخ بہت دلچسپ ہی۔ مولوی محمد فاروق صاحب چریاکوٹی اپنے استاد مفتی محمد یوسف سے نقل کرتے ہیں کہ اُن کے بچپن میں شرح سلم علی العموم رائج نہیں تھی، بلکہ قاضی مبارک کے شاگرد مولوی مدن وغیرہ اپنے شاگردوں کو سلم کے ساتھ شرح سلم قاضی مبارک بھی پڑھاتے تھے اور ملاحسن کے شاگرد شرح سلم ملاحسن کا درس دیتے تھے اور بحرالعلوم کے خاندان میں شرح سلم بحرالعلوم رائج تھی اور حمداللہ کے تلامذہ اپنے استاد کی شرح پڑھاتے تھے۔ پڑھانے میں ایک دوسرے پر نوک جھوک بھی ہوتی جاتی تھی اس لئے ایک کو دوسرے کی کتاب کا دیکھنا ضروری تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ سب کتابیں درس میں داخل ہوگئیں جن کو ہم صحیح طور پر ناخواندہ مہمان یا سبزۂ خود رو سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

اس وقت تمام ہندوستان میں یہی نصاب تعلیم رائج ہی لیکن اس کے بھی نقائص حسب ذیل ہیں:

(۱)۔ اس نصاب میں قوت مطالعہ کا زیادہ خیال رکھا گیا ہی اور تحصیل فن کی طرف کم توجہ کی گئی ہی۔ یہی وجہ ہی کہ طلبا میں ضرورت سے زیادہ احتمال آفرینی پیدا ہو جاتی ہی۔ لیکن کسی فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا۔

(۲)۔ منطق کی کتابیں ضرورت سے بہت زیادہ ہوگئی ہیں۔ شروع سے لیجئے تو چھوٹی بڑی پندرہ کتابیں اس نصاب میں صرف منطق کی ہیں۔ یعنی صغری کبری، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملاحسن، حمداللہ، میرزاہد رسالہ، غلام یحیٰی، میرزاہد ملاجلال، قاضی مبارک۔

(۳) لیکن اس کے مقابلہ میں تفسیر کی صرف دو کتابیں ہیں، بیضاوی اور جلالین، بیضاوی کے

صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں۔ جلالین پوری پڑھائی جاتی ہے لیکن اُس کے اختصار کا یہ حال ہے کہ اُس کے الفاظ و حروف قرآن مجید کے الفاظ و حروف کے برابر ہیں۔

(۴)۔ اس نصاب میں ادب و عربیت کا حصہ بہت کم شامل ہے۔ بلاغت میں صرف دو کتابیں درس میں ہیں مختصر و مطول، مختصر پوری پڑھائی جاتی ہے اور مطول ما اناقلت تک یعنی ۱/۴ سے بھی کم۔

(۵)۔ منطق کی جو کتابیں درس میں داخل ہیں ان میں خلط مبحث بہت ہے۔ ملا حسن، حمد اللہ اور قاضی ہیں تو منطق میں لیکن ان میں منطق کے جس قدر مسائل ہیں اُن سے کہیں زیادہ اُمور عامہ اور فلسفہ کے مسائل ہیں، جعل بسیط اور جعل مرکب، علم باری کلی طبعی کا وجود فی الخارج وغیرہ وغیرہ ایسے اہم مسائل ہیں جن میں مصروف ہو کر طالب العلم کو منطق کے خاص مسائل کی طرف بہت کم توجہ ہو سکتی ہے۔

(۶)۔ اس نصاب میں تاریخ، جغرافیہ، علم اعجاز القرآن اور دوسرے ضروری علوم بالکل نہیں

نصاب درس جو بالفعل مروج ہے

صرف۔ میزان، منشعب، پنج گنج، زبدہ، دستور المبتدی، صرف میر، فصول اکبری، شافیہ

نحو۔ نحو میر، مائۃ عامل، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح ملا تا منصوبات (اور بعض درس گاہوں میں تا بحث فعل)

بلاغت۔ مختصر معانی تمام مطول تا ما انا قلت

ادب۔ نفحۃ الیمن، سبعہ معلقہ، دیوان متنبی، مقامات حریری، دیوان حماسہ

فقہ۔ شرح وقایہ اولین، ہدایہ آخرین

اصول فقہ۔ نور الانوار، توضیح، تلویح، مسلم الثبوت اصول فقہ میں ہے مگر جس قدر حصہ اُس کا زیر درس ہے وہ درحقیقت فن کلام کا ایک ٹکڑا ہے اس لئے اس کو فن کلام میں داخل کرنا چاہئے۔

منطق ۔صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی میرقطبی، ملاحسن، حمداللہ، قاضی مبارک، میرزاہد رسالہ حاشیہ غلام یحیی برمیر زاہد رسالہ۔ میر زاہد ملا جلال

حکمت ۔ میبذی، صدرا، شمس بازغہ۔

کلام ۔شرح عقائد نسفی، خیالی، میر زاہد امور عامہ۔

ریاضی ۔تحریر اقلیدس مقالہ اول، خلاصۃ الحساب، التصریح، شرح تشریح، شرح چغمنی

فرائض ۔ شریفیہ۔

مناظرہ ۔ رشیدیہ

تفسیر ۔جلالین، بیضاوی تا سورۂ بقر

اصول حدیث ۔ شرح نخبۃ الفکر

حدیث ۔ بخاری، مسلم، موطا، ترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ۔

لیکن اس نصاب میں منطق کی جس قدر کتابیں بڑھ گئی ہیں وہ ہر درس گاہ میں عموماً رائج ہیں اور ادب و حدیث کی جو کتابیں درج کی گئی ہیں وہ ہر جگہ رائج نہیں ہیں، بلکہ جس کو ادب کا شوق ہوتا ہی وہ کتب درسیہ کے ساتھ ادب کی اُن کتابوں کو بھی پڑھ لیتا ہی لیکن ان کے پڑھنے والے فیصدی ایک سے زائد نہیں ہوتے۔

جس کو حدیث پڑھنے کا شوق ہوتا ہی وہ کتب درسیہ کے پڑھنے کے بعد ایسے مقامات پر سفر کر کے جاتا ہی جہاں اُس کو حدیث کے پڑھانے والے مل سکیں۔ اس لئے جو نصاب تعلیم آج کل بلا استثنار ہر مدرسہ میں جاری ہی اُس سے ادب و حدیث کو خارج سمجھنا چاہئے

صدائے اصلاح | قرونِ اولےٰ تک اسلامی تعلیم کا مرکز صرف قرآن و حدیث تھے، باقی نحو ادب لغت، اور شاعری کی جو تعلیم ہوتی تھی وہ انھی دونوں کی تعلیم کا ضمیمہ و مقدمہ تھی لیکن تیسری صدی تک ان علوم میں اور بھی وسعت پیدا ہوگئی اور یونانی کتابوں کے تراجم نے بہت سے جدید علوم مثلاً فلسفہ، منطق، ریاضی ہندسہ اور طب وغیرہ پیدا کر دیئے۔ ان علوم نے

اسلامی عقائد کو جو صدمہ پہونچا یا اس کی مدافعت کے لئے ایک جدید علم ایجاد ہوا جس کا نام علم کلام تھا۔ چوتھی صدی میں مدارس کی بنیاد پڑی تو اُس نے اگرچہ قدیم طرز تعلیم میں کوئی نمایاں تغیر نہیں پیدا کیا، تاہم علوم زیر درس کی ترتیب و مدارج میں بہت کچھ فرق آگیا، مثلاً

(۱)۔ سب سے بڑا خلط مبحث یہ ہو گیا کہ مذہبی اور غیر مذہبی علوم آپس میں مخلوط ہو گئے یعنی جو علوم درحقیقت مذہبی نہ تھے وہ مذہبی علوم خیال کئے جانے لگے، اور اسی حیثیت سے ان کی تعلیم دی جانے لگی جس سے دو قسم کے سخت ضرر پیدا ہو گئے۔

(۱) چونکہ ان علوم کو مذہبی عظمت دی گئی اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتناء ہو گیا اور ان کی تعلیم میں اس قدر وقت صرف کیا گیا کہ دوسرے ضروری علوم کی طرف سے بے التفاتی کی جانے لگی۔

(۲) اس سے بھی سخت ضرر یہ پیدا ہوا کہ یہ علوم چونکہ مذہبی حیثیت سے حاصل کئے جاتے تھے اس لئے ان کے مسائل میں جو اختلاف و نزاع پیدا ہوتی تھی وہ مذہبی رنگ پکڑ لیتی تھی علماء کے گروہ میں ایک مدت سے جو اختلافات ہیں اور اُن اختلافات کی وجہ سے تکفیر و تفسیق سب و شتم اور جنگ و جدل کا دستور چلا آتا ہے وہ اسی غلطی کا نتیجہ ہے۔ ادب، منطق، نحو اور ریاضی وغیرہ کے مسائل کے متعلق علماء میں جب بحث و مناظرہ کی وجہ سے رد و قدح کی نوبت آئی تو تکفیر و تفسیق کا کبھی کام نہیں لیا جاتا، لیکن فقہاء و متکلمین میں جزئیات مسائل پر بھی بحث چھڑ جاتی ہے تو کم سے کم تفسیق و تکفیر سے تسلی نہیں ہوتی۔

(۳)۔ جو علوم درس میں داخل تھے ان میں ترجیح و مساوات کا اندازہ صحیح طور پر نہیں کیا گیا تھا۔ بعض علوم پر ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جاتا تھا اور بعض پر قدر ضرورت سے بھی کم توجہ کی جاتی تھی۔

(۴)۔ عقلی اور صنعتی علوم یعنی منطق و فلسفہ اور طب وغیرہ بالکل درس میں داخل نہ تھے

(۵)۔ علم اخلاق بھی درس میں داخل نہ تھا۔

فقہ کا ایک خاص حصہ یا فقہ کی ایک خاص قسم یعنی علم خلاف طلبار وعلماء کے دماغ کا سب سے بڑا جولان گاہ بن گئی تھی۔[1]

بعض علوم کی حقیقت بالکل بدل گئی

امام غزالیؒ کے زمانے تک یہ تمام مفاسد پیدا ہو چکے تھے اس لئے سب سے پہلے اُنھی نے صدائے اصلاح بلند کی اور احیار العلوم میں اس کے لئے ایک خاص باب باندھا جس کی سرخی یہ ہے:

الباب الثانی فی العلم المحمود والمذموم واقسامھما واحکامھما وفیہ بیان ما ھو فرض عین وما ھو فرض کفایۃ وبیان ان موقع الکلام والفقہ من علم الدین الی ای حد ھو۔

دوسرا باب اس بیان میں ہے کہ علم محمود کونسا ہے، اور مذموم کون؟ اور یہ کہ ان کے اقسام اور احکام کیا ہیں؟ اور یہ کہ ان میں کونسا فرض عین ہے اور کون سا فرض کفایہ اور یہ کہ علم دین میں فقہ اور کلام کا کیا درجہ ہے۔

(۱) اور اس میں نہایت تدقیق سے علوم شرعیہ وغیر شرعیہ محمودہ وغیر محمودہ میں تفریق کی اور فقہ کو دنیوی علوم میں شمار کیا۔

(۲)۔ فقہ کے ایک خاص حصّے کو جو فقہار کی اصطلاح میں خلافیات سے تعبیر کیا جاتا ہے سخت قابل احتراز علم قرار دیا۔

(۳)۔ فقہ اور علم کلام کی نسبت یہ رائے ظاہر کی کہ قرون اولی میں ان کے معنی کچھ اور تھے لیکن اب وہ بالکل بدل گئے ہیں چنانچہ علم کلام کی نسبت لکھتے ہیں

اب علم توحید ان باتوں کا نام ہے، مجادلہ و مناظرہ کے قواعد کا جاننا، مخالف کے تناقض اور اختلاف کا تفحص کرنا، کثرت سے شبہے اور اعتراضات کا پیدا کرنا، الزامی

---

[1] جس طرح اس زمانہ میں انگریزی دانوں کو ملکی عہدے ملتے ہیں، اُسی طرح اسلامی حکومت میں فقہار کو قضارت اور افتار کا منصب حاصل ہوتا تھا اس لئے علم فقہ دنیوی مال وجاہ کا ذریعہ بن گیا تھا۔

جواب دنیا وغیرہ وغیرہ حالانکہ قرون اولیٰ میں ان چیزوں کا نام ونشان بھی نہ تھا بلکہ وہ لوگ ان باتوں کو نہایت ناپسند کرتے تھے۔

(۴)۔ علوم کی تحصیل میں تناسب ملحوظ رکھنے کے لحاظ سے علوم کی دو قسمیں قرار دیں۔ فرضِ عین، فرض کفایہ۔

(۵)۔ اور تمام متداول علوم کو فرض کفایہ قرار دیا۔

(۶)۔ اور ان علوم شرعیہ میں سے جس قدر فرض کفایہ ہی اُس کی حسب ذیل مقدار بتائی:

تفسیر میں کوئی تفسیر جس کی ضخامت قرآن مجید سے دوگنی ہو، مثلاً تفسیر وجیز یا بہت سے بہت تگنی مثلاً تفسیر وسیط۔

حدیث میں صحیحین یا یا زیادہ شوق ہو تو وہ صحیح حدیثیں جو صحیحین میں نہیں ہیں۔

فقہ میں مختصر مزنی یا زیادہ سے زیادہ وسیط کے برابر کوئی کتاب۔

کلام میں کوئی مختصر سی کتاب مثلاً قواعد العقائد یا زیادہ سے زیادہ اقتصاد فی الاعتقاد جو سو ورق میں ہی۔

(۷)۔ دنیوی علوم میں تمام علوم مثلاً طب اور حساب کو فرض کفایہ قرار دیا اور لکھا کہ "ہمارے اس قول پر کہ طب وحساب فرض کفایہ ہیں تعجب نہ کرنا چاہیے بلکہ اور صنعتی علوم بھی فرض کفایہ ہیں۔ مثلاً کاشتکاری، جولاہہ پن، سائیسی، حجامت اور درزی گری۔ لیکن اُس زمانے کی حالت اس زمانے سے بالکل مختلف تھی، آج ایک عمدہ کاشتکار اور ایک کامیاب درزی علمار سے زیادہ دولت پیدا کر سکتا ہی، لیکن اُس زمانہ میں اکثر طبیب صرف عیسائی ہوتے تھے، مسلمان فقہ کو چھوڑ کر ان دنیوی علوم کی طرف رخ نہیں کرتے تھے جس کی وجہ امام صاحب کے الفاظ میں یہ تھی کہ

طب کے ذریعہ سے اوقاف پر، وصیت پر اور یتیموں کے مال پر آسانی کے ساتھ قبضہ نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ قضا کا عہدہ نہیں مل سکتا تھا۔ حکومت

ہاتھ نہیں آسکتی تھی ہم عصروں پر تفوق نہیں حاصل کیا جاسکتا تھا اور مخالف زیر نہیں کئے جاسکتے تھے۔

(۸)۔ علوم عقلیہ میں سے منطق کو علم کلام کا ایک حصہ قرار دیا اور الٰہیات وطبیعیات کے جو مسائل مذہب کے مخالف تھے ان کو کفر و بدعت قرار دیا، باقی مسائل کے سیکھنے کی اجازت دی۔

امام صاحب کے ان اصلاحی خیالات کا اثر اگرچہ فوراً ظاہر نہیں ہوا تاہم رفتہ رفتہ اُس نے تعلیم کی حالت بالکل بدل دی۔ اور نصاب تعلیم میں فقہ وکلام کے ساتھ منطق اور فلسفہ بھی داخل ہو گیا۔ دنیوی علوم کے لئے اتنا کافی وقت نکل آیا کہ فقہا اور محدثین بھی ریاضی داں اور حساب داں ہونے لگے۔ فقہ سے علم الخلافیات کا حصہ بالکل خارج ہو گیا اور علم کلام کے بہت سے غیر ضروری مباحث چھٹ گئے۔ [۱]

امام غزالیؒ کے زمانہ تک اگرچہ علوم کی تقسیم و ترتیب میں بے اعتدالیاں پیدا ہو چکی تھیں، لیکن خود نصاب تعلیم اور نظام تعلیم میں کوئی نمایاں تغیر نہیں ہوا تھا لیکن اُن کے بعد چھٹی صدی سے خود نصاب تعلیم و نظام تعلیم میں تغیرات پیدا ہونے لگے اور روز بروز یہ مرض بڑھتا گیا۔

علوم آلیہ یعنی جو علوم مقصود بالذات نہ تھے بلکہ دوسرے علوم کے حاصل کرنے کا ذریعہ تھے وہ مقصود بالذات قرار دے لئے گئے۔ اور اصل مقصد کو نظر انداز کر دیا گیا مثلاً منطق خود مقصود بالذات علم نہ تھا بلکہ اُس کے پڑھنے کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ علم کلام کی تعلیم میں کام آوے۔ قدما اسی غرض سے بقدر ضرورت اس کی تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن امام رازی کے زمانہ سے یہ روش بدل گئی اور علم منطق خود مقصود بالذات ہو گیا۔ چنانچہ علامہ سید بدر الدین حلبی لکھتے ہیں:-

> متاخرین نے اس پر ایک مستقل فن کی حیثیت سے نگاہ ڈالی اس حیثیت سے اس کو نہیں دیکھا کہ وہ دوسرے علم یعنی علم توحید کا ذریعہ ہے اس لئے اس پر نہایت طویل بحث کی سب سے پہلے امام فخر الدین رازی نے

---

[۱] - اگرچہ احیاء العلوم ہماری پیش نظر ہے لیکن علامہ شبلی مرحوم نے اس بحث کو الغزالی میں نہایت سلجھا کر لکھا ہے ہم نے اس موقع پر اسی کو اور بھی مختصر مسلسل اور مربوط کر دیا ہے۔

اس کی ابتدا کی اُن کے بعد افضل الدین خونجی نے اس کو ترقی دی۔ پھر ان کے بعد ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے اُن کی کتابوں کا خلاصہ کیا اور اُن کی بہت سی باتوں کو حذف کر دیا. مثلاً کاتبی اور قطب الدین رازی، پھر اُس کے بعد ایک قوم پیدا ہوئی جس نے اس فن میں غیر مفید مختصرات کی بنیاد ڈالی، پھر اُن پر شروح و حواشی لکھے گئے اور لوگ اُن کی طرف مائل ہو گئے اور متقدمین و متاخرین اور اُن تمام لوگوں کی کتابیں جو اس فن کو اچھی طرح جانتے تھے متروک ہو گئیں۔ ؎

علوم عربیہ کا بھی یہی حشر ہوا۔

(۲)۔ اس زمانہ میں جیسا کہ علامہ بدر الدین حلبی نے لکھا ہی تصنیف و تالیف اور شروح و حواشی کا نہایت کثرت سے رواج ہوا اور جس کثرت سے کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اُسی کثرت سے داخل درس ہوتی گئیں اس لئے طلباء کے دماغ پر ان کتابوں کا غیر معمولی بار پڑ گیا۔

(۳)۔ اس لئے نصاب تعلیم مختلف علوم اور مختلف کتابوں کا ایک مخلوط مجموعہ ہو گیا اور جن کی تعلیم طلباء کے لئے ضروری نہ تھی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ طالب العلم کو بہت سے علوم سے ناکافی واقفیت تو ہو جاتی تھی لیکن کسی خاص فن میں کمال نہیں پیدا ہوتا تھا قوت مطالعہ و قوت بحث ضرور پیدا ہوتی تھی، لیکن قوت فیصلہ جو کمال علم کا ثمرہ ہی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہی کہ متاخرین کے یہاں اختلاف یا بیان اختلاف کا سرمایہ وافر ہی، قول فیصل کمتر یا شاذ۔ یہ کمزوری فیصلہ کی یوماً فیوماً بڑھتی گئی اور ہر فن میں ساری ہو گئی معقول و منقول دونوں ایک رنگ میں آ گئے۔ حالانکہ ان میں زمین و آسمان کا فرق تھا یہی وجہ ہی کہ چھٹی صدی کے بعد اسلام میں کوئی یک فنی کامل عالم نہیں پیدا ہوا۔ امام رازی کے

؎۔ التعلیم والارشاد صفحہ ۲۹

زمانہ سے یہ نظام تعلیم قایم ہوا اور آٹھویں صدی یعنی علامہ ابن خلدون کے زمانہ تک وہ بالکل مکمل ہو گیا اس لیئے سب سے پہلے علامہ موصوف نے اس کی مخالفت میں صدا بلند کی اور مقدمہ تاریخ میں متعدد عنوانات قائم کر کے اس کی خرابیاں بتائیں چنانچہ ایک عنوان یہ قایم کیا کہ "علوم آلیہ میں نہ نظر کو بہت وسیع کرنا چاہئے اور نہ اُن میں مسائل کی تفریع کرنی چاہئے اور اُس کے تحت میں جو کچھ لکھا اُس کا خلاصہ یہ ہی کہ

متداول علوم کی دو قسمیں ہیں، ایک مقصود بالذات جیسے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، طبعیات، الہیات، اور ایک وہ علوم جو ان کے حاصل کرنے کا آلہ اور ذریعہ ہیں جیسے۔ عربیت، حساب، منطق۔ پس جو علوم مقصود بالذات ہیں اگر ان میں کلام کو وسعت دی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن جو علوم دوسرے علوم کا آلہ ہیں مثلاً عربیت اور منطق وغیرہ تو ان کو صرف اسی حیثیت سے دیکھنا چاہئے کہ وہ آلہ ہیں اور اور ان میں کلام کو وسعت نہیں دینی چاہئے کیونکہ اس سے اُن کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ اور علوم مقصود بالذات کی تحصیل میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ حالانکہ وہی اہم ہیں اور اس طریقہ سے عمر ان سب کی تحصیل کے لئے کافی نہ ہو گی، اس لئے ان علوم آلیہ کی مصروفیت میں عمر ضائع ہو گی۔ جیسا کہ متاخرین نے نحو، منطق، اور اصول فقہ کے متعلق کیا۔

ایک عنوان یہ قائم کیا کہ کثرت سے مختصرات کی تعلیم، تعلیم میں خلل انداز ہوتی ہی" اور اُس کے تحت میں لکھا کہ

اکثر متاخرین نے علوم و فنون کے طریقے کو مختصر کر دیا ہی اور ہر علم کی ایک مختصر سی فہرست مرتب کر لی ہی جو مختصر الفاظ میں اُس کے تمام مسائل و دلائل پر مشتمل ہوتی ہی۔ ان لوگوں نے تفسیر اور بیان کی

مطولات کتب کا اختصار کر لیا ہی جیسا کہ ابن حاجب نے فقہ اور اصول فقہ ابن مالک نے عربیت اور خونجی وغیرہ نے منطق کے متعلق کیا لیکن یہ تعلیم کا مضر طریقہ ہی اور اس سے تحصیل میں خلل پڑتا ہی۔ تمام خرابیوں کے ساتھ طالب العلم کے لئے بڑی دردسری یہ ہی کہ ہم کو مشکل اور مختصر الفاظ کا تتبع کرنا پڑتا ہی اور بہ مشکل اُن سے مسائل کو نکالنا پڑتا ہی ان تمام مفاسد کے بعد ان مختصرات کی تعلیم سے جو ملکہ علمی حاصل ہوتا ہی وہ اُس ملکہ سے ناقص ہوتا ہی جو طویل الذیل کتابوں کے پڑھنے اور ایک بات کے بار بار دُہرانے سے حاصل ہوتا ہی۔

ایک عنوان یہ قایم کیا کہ "علوم و فنون کی بہت سی کتابیں اُن کی تحصیل میں رکاوٹ پیدا کرنے والی ہوتی ہیں"۔ اور اس کے تحت میں لکھا کہ

لوگوں کو تحصیل علم میں جس چیز نے نقصان پہونچایا ہی وہ کتابوں کی کثرت، اصطلاحات کا اختلاف اور تعلیم کے طریقوں کا متعدد ہونا اور پھر طالب العلم سے اس کے یاد کرنے کا مطالبہ کرنا ہی۔ لیکن جو کچھ ایک فن کے متعلق لکھا گیا ہی طالب العلم کی عمر اُسی کا ساتھ نہیں دے سکتی اس لئے تحصیل علم میں خواہ مخواہ کوتاہی واقع ہوتی ہی۔ فقہ مالکی میں اس کی مثال کتاب مدونہ اور اس کی شروح مثلاً ابن یونس، لخمی، ابن بشیر کی کتابیں اور تنبیہات، مقدمات بیان اور عتبیہ ہیں۔ یہی حال ابن حاجب کی کتابوں اور اُن کی شروحات کا ہے۔ یہ تمام کتابیں مکرر ہیں اور معنی سب کے ایک ہیں لیکن طالب العلم سے سب کے یاد کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہی اور عمر صرف ایک ہی کتاب میں گزر جاتی ہی۔ اگر اساتذہ صرف مذہبی مسائل پر اکتفا کرتے تو تعلیم

آسان ہوجاتی اور اس کا ماخذ قریب ہو جاتا لیکن اس مرض کا ازالہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ عادت ہو کر ایک طبعی امر ہو گیا ہے جس میں تغیر نہیں کیا جا سکتا اس کی ایک مثال علم عربیت میں سیبویہ کی کتاب اور اس کی شروح بھی ہیں۔

ان خرابیوں کی تفصیل کے بعد علامہ موصوف نے تعلیم کا صحیح طریقہ بتایا اور اپنے زمانہ کے طریقۂ تعلیم پر نکتہ چینی کی لیکن جیسا کہ اُنھوں نے لکھا ہے کہ اب یہ طریقہ طبعیت ثانیہ ہو گیا ہے اُن کو اس نظام اصلاح میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور اُن کی یہ صدا بے اثر ثابت ہوئی۔

اسی زمانہ سے ہندوستان کا تعلیمی دور بھی شروع ہوا۔ اس لئے ہندوستان کے نصاب تعلیم میں قدرتی طور پر وہ تمام نقائص پیدا ہو گئے جن کی تفصیل علامہ ابن خلدون نے کی ہے۔ تاہم چونکہ ان خرابیوں کا اثر رفتہ رفتہ ظاہر ہوا، اس لئے ابتدا میں نسبۃً نتائج اچھے ظاہر ہوئے لیکن رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ جس نصاب نے یہ خرابیاں پیدا کی تھیں وہ آپ اپنا شکار ہو گیا اور آج اُس کے پڑھانے والے بھی بہ مشکل مل سکتے ہیں۔

قدیم زمانے میں امام غزالیؒ اور علامہ ابن خلدونؒ کو اصلاحِ نصاب کا شرف حاصل ہوا تھا اور اس آخری دور میں ہندوستان کے نصاب تعلیم کے اصلاح کی عزت ندوۃ العلما کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ علامہ سید بدرالدین حلبی التعلیم والارشاد میں لکھتے ہیں:

چند سال سے ممالک اسلامیہ میں علوم مذہبی کی جماعت پر احساس کی ایک ہوا چلی ہے اور اس سے اہل بصیرت نے مدارس مذہبی کی خرابیوں کو محسوس کیا ہے اور اُنھوں نے اُن طریقوں سے بحث شروع کر دی ہے جو اس پستی سے نکال سکتے ہیں۔ ہوا کا یہ جھونکا ہندوستان سے

بھی گزرا ہی اور وہاں کے اہل علم نے ایک انجمن قایم کی ہی جس کا نام ندوۃ العلمار رکھا ہی۔ ان لوگوں کا بیان ہی کہ اس کا مقصد علوم و فنون کا احیار اور طریقہ تعلیم کی اصلاح ہی اور وہ اس غرض سے ہر سال ہندوستان کے کسی مرکزی شہر میں جمع ہوتے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں ہی کہ یہ انجمن کسی عمدہ نتیجہ تک پہونچی ہی یا اصلاح طریقہ تعلیم کی ایجاد میں بھی اُن کی مصروفیت اُسی قسم کی ہی جیسا کہ خود تعلیم ہیں۔

مجھ سے بعض قابل اعتماد اہلِ علم نے بیان کیا کہ اصلاحی جماعت کی حالت بھی تعلیمی جماعت کی سی ہی۔ مجھے اصل حقیقت معلوم نہیں ہی لیکن میں نے سنہ ۱۳۱۹ھ میں اس انجمن کی ایک ایک سالہ یا دو سالہ رپورٹ دیکھی جس کا اکثر حصہ اُن رکیک اشعار سے بھرا ہوا تھا جن کو اس انجمن کے ارکان نے ایک دوسرے کی مدح میں کہا تھا۔ اگر ان لوگوں کا اجتماع اسی غرض سے ہوتا ہی تو تعلیم اور علم کی اصلاح کو ہندوستان سے کوسوں دور سمجھنا چاہیئے۔ ۵۱

بے شبہ ابتدا میں ندوۃ العلمار کی حالت یہی تھی لیکن اس کے ارکان میں ایک فرد کامل ۵۲ (علامہ شبلی مرحوم) ایسا بھی تھا جو اصلاح کے شور و غل سے زیادہ اصلاح پر عمل کرنے کے لئے شور و غل کرتا رہتا تھا چنانچہ اُس نے ندوۃ العلمار کے ایک برگزیدہ اور اپنے ہم خیال رکن کے نام جو خطوط لکھے ہیں اُن سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

۵۱۔ التعلیم والارشاد صفحہ ۶۰۔ ۵۲۔ اس بارہ میں مولٰنا سید محمد علی صاحب کے مساعی و استقلال فرو گذاشت کرنے کے قابل نہیں۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ)

ندوہ کی حالت دیکھ کر ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ بوسیدہ ارکانوں کا تو یہ حال ہے کہ اس دفعہ بھی شرح عقائد نسفی، ہدیہ سعیدیہ، نور الانوار درس میں تجویز کی گئی ہے۔ ایک ہمارے روشن خیال شروانی ہیں جن کو میں اپنا امام کہتا ہوں اُن کا یہ حال ہے کہ انگریزی کے نام سے اُن کو لرزہ آتا ہے۔ [۱]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

یہ ارادہ ہوتا ہے کہ دو مہینہ کی رخصت لے کر لکھنؤ آؤں اور کم از کم دو چیزوں کو درست اور جاری کرا دوں، نصاب اور رسالہ ماہانہ۔ [۲]

ایک اور خط میں نہایت تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:

نصاب تعلیم پر میں برسوں غور کر چکا ہوں، مصر کی اصلاحات کو دیکھتا رہتا ہوں، وہاں سے جدید کتابیں جو اب تک کسی کے پاس نہیں پہونچیں اُن کو منگوایا ہے۔ [۳]

لیکن اس شور و غل اور اس خط و کتابت کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا تو اُنھوں نے حیدر آباد کی گراں قیمت ملازمت کو خیر باد کہہ کے خود ندوۃ العلماء میں بحیثیت معتمد تعلیم کے مستقلاً قیام اختیار کیا اور سب سے پہلے جس چیز کی اصلاح کی طرف توجہ کی وہ یہی نصاب تعلیم تھا۔ چنانچہ الندوہ کے ابتدائی مضامین سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

علامہ مرحوم نے جن اصول پر قدیم نصاب تعلیم کو بدلنا چاہا۔ وہ وہی ہیں جن کو علامہ ابن خلدونؒ نے مقدمہ تاریخ میں قایم کیا تھا چنانچہ الندوہ [۴] کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

---

[۱]۔ مکاتیب شبلی جلد اول صفحہ ۱۳۲ خط بنام مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔ [۲] مکاتیب شبلی صفحہ ۱۵۱ خط بنام مولنا حبیب الرحمن خاں شروانی۔ [۳] مکاتیب صفحہ ۱۵۲ خط بنام مولنا حبیب الرحمن خاں شروانی [۴] الندوہ بابتہ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ جلد ۱ نمبر ۲

ہم اس دعوے کے ثابت کرنے کے لئے اشارات و قرائن پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ قطعی طریقہ سے ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ نصاب تعلیم نہایت ناقص اور ابتر ہے۔ سب سے پہلے ہم کو چند مقدمات اصول موضوعہ کے طور پر ذہن نشین کر لینے چاہئیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱)۔ تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ نفس فن حاصل کیا جائے۔

(۲)۔ ہر فن کے حاصل کرنے کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ اس کے مسائل کو منفرداً اور بہ استقلال حاصل کیا جائے تاکہ اس فن کی طرف کافی توجہ ہو سکے اگر چند فنوں کے مسائل کو مخلوط کر کے حاصل کیا جائیگا تو کسی فن کی اچھی طرح تکمیل نہ ہوگی۔

(۳)۔ متعدد علوم و فنون کی تحصیل میں الاقدم فالاقدم کا خیال ضرور ہے یعنی یہ کہ جو فنون مقصود بالذات ہیں اُن کے حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کیا جائے جو مقصود بالعرض ہیں اُن میں کم۔ اسی طرح علوم مقصود بالذات میں بھی بلحاظ اہمیت کے فرق مراتب کرنا چاہیے یعنی جو علوم زیادہ مہتم بالشان اور ضروری ہیں وہ زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔

(۴)۔ ہر علم کی تحصیل میں سب سے مقدم یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس فن کی جو غایت ہے وہ حاصل ہو۔

ان اصول کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے اس مضمون میں نصاب قدیم کے نقائص دکھائے اور ایک نصاب تعلیم جاری کیا جو انھی اصول کے مطابق مرتب کیا گیا تھا۔ آج ندوۃ العلماء میں یہ تغیر و اصلاح یہی نصاب تعلیم جاری ہے جو عمدہ نتائج پیدا کر رہا ہے۔ علامہ مرحوم نے اخیر میں خاص ایک فن کی تکمیل کے لئے ایک مستقل درجہ تکمیل قایم کیا جو انگریزی کے ایم اے کے برابر ہے۔

انگریزی زبان کی تعلیم لازمی کردی، اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ندوہ کے طلبار میں متعدد اشخاص ہیں جو جدید علوم وفنون میں کافی مہارت رکھتے ہیں، اور عام ضروریات کے لئے تو تقریباً تمام طلبار انگریزی جانتے ہیں۔ بااین ہمہ قدیم خیال کے علمار کی مخالفت، سرمایہ کی قلت اور دوسرے عوائق وموانع کی وجہ سے مولانا مرحوم قدیم تعلیم میں جس وسیع پیمانے پر انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اُن کے حوصلہ وہمت کے موافق اُن کو ندوہ میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن خوش قسمتی سے اُن کو ایک اور موقع ہاتھ آگیا جس میں انھوں نے اس طریقۂ تعلیم و نصاب تعلیم میں اپنے حوصلہ کے مطابق تغیرات کئے یعنی حیدرآباد کے دارالعلوم میں پہلے پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کا نصاب درس جاری تھا جو قدیم عربی مدارس کے نصاب درس سے بھی زیادہ لغو وبے کار تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے خود پنجاب یونیورسٹی نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ وہ دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے امتحانات میں شریک نہیں کرسکتی۔ اس لئے اب یہ خیال پیدا ہوا کہ خود دارالعلوم کا ایک الگ نصاب تعلیم ریاست کی ضروریات کے مطابق تیار کیا جائے۔ چنانچہ نواب عماد الملک بہادر بلگرامی نے جو اُس وقت ناظم تعلیمات تھے ایک سرکاری مراسلہ کے ذریعہ سے مولانائے مرحوم سے اس معاملہ میں اعانت طلب کی اور لکھا کہ ترمیم نصاب میں چند ابواب پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱)۔ اصلاح نصاب موجودہ پنجاب یونیورسٹی بہ لحاظ مقتضائے وقت وزمانہ وضروریات خدمات حکومتی۔

(۲)۔ تکمیل تحصیل علوم مشرقیہ

چنانچہ اس مراسلہ کی بنار پر مولانائے مرحوم جون ۱۹۰۱ء میں خود حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں چند روز رہ کر ایک نصاب تیار کیا جس میں خصوصیات ذیل کو پیش نظر رکھا۔

(۱)۔ صرف وہی کتابیں درس میں رکھیں جن میں تمام مسائل نہایت سادہ صاف اور واضح

طریقے سے بیان کئے گئے تھے۔

(۲)۔ اور جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط نہیں کئے گئے تھے۔

(۳)۔ قرآن مجید کی تعلیم کا حصّہ زیادہ وسیع کیا۔

(۴)۔ ادب کی کتابیں بہت بڑھادیں۔

(۵)۔ عربی تحریر و انشا پردازی کے لئے خاص گھنٹے مقرر کئے۔

(۶)۔ عقائد و کلام میں متعدد اور بلند پایہ کتابیں نصاب میں رکھیں۔

(۷)۔ تاریخ اسلام اور عام تاریخ کی کتابیں بھی داخل نصاب کیں۔

(۸)۔ علوم جدیدہ کی بعض کتابیں جو عربی میں ترجمہ ہو گئیں تھیں نصاب میں شامل کیں۔

(۹)۔ انگریزی زبان بطور سکنڈ لنگویج کے لازمی قرار دی۔

(۱۰)۔ مدت تعلیم جو پہلے اُنیس ۱۹ سال تھی اُس کو گھٹا کر چودہ ۱۴ سال کر دیا۔

ندوۃ العلمار اور حیدر آباد کے علاوہ اور مدارس میں بھی نصاب تعلیم کی تبدیلی اور طلبار میں علمی زندگی پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور گو ان میں ندوہ کے نصاب تعلیم کی پابندی نہیں کی گئی۔ تاہم ہر ایک نے اپنے مذاق و مصالح کے موافق قدیم نصاب میں ترمیم و اضافہ کیا اور آج علمار و طلبار میں جو ایک عام حرکت، ایک عام روشن خیالی اور آزادی محسوس ہو رہی ہے وہ اسی تعلیمی انقلاب کا نتیجہ ہے۔

ہندوستان کے علاوہ اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں بھی اصلاح تعلیم و اصلاح نصاب کا خیال پیدا ہوا اور قدیم طریقے میں مختلف تبدیلیاں کی گئیں۔ چنانچہ مصر میں مفتی محمد عبدہ نے قدیم طریقۂ تعلیم کو بالکل اُلٹ کر جدید قالب میں ڈھالنا چاہا اور ۱۳۰۰ھ میں نظامت داخلیہ میں ایک رپورٹ بھیجی جس میں یہ تجویز پیش کی کہ ازہر اور تمام دوسری مذہبی درس گاہیں، قومی یا سرکاری مدارس کی شکل میں بدل دی جائیں اُن میں اور سرکاری مدرسوں میں صرف یہ فرق باقی رہ جائے کہ ان میں مذہبی امور کا زیادہ لحاظ

رکھا جائے لیکن چونکہ اس سے قدیم نظام تعلیم بالکل معدوم ہو جاتا تھا اس لئے کسی نے اُن کی حمایت نہیں کی بلکہ جو لوگ قدیم طریقۂ تعلیم کی خرابیوں کو محسوس کر رہے تھے انھوں نے بھی اُن کا ساتھ نہیں دیا، اور رانہیر والوں نے شدت کے ساتھ اُن کی مخالفت کی اس لئے اُن کی یہ تجویز ناکامیاب رہی۔ ؎۵

ٹرکی میں مدارس کی ترقی و اصلاح کا آغاز دستوری حکومت کے بعد ہوا۔ چنانچہ جب علامہ امراللہ آفندی سکریٹری تعلیم مقرر ہوئے تو انھوں نے سرکاری مدارس کے نصابِ تعلیم و طریقۂ درس کی اصلاح کی طرف خاص توجہ مبذول کی اور حکومت کی طرف سے بھی ان کی تائید کی گئی قسطنطنیہ میں مذہبی مدارس چونکہ مجلس اوقاف سے تعلق رکھتے ہیں جو اُن کے حدودِ اختیارات سے باہر ہے اس لئے اُنھوں نے ابتدا میں اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ تاہم وہ اُن کی ترقی و اصلاح سے بھی غافل نہ تھے چنانچہ اس غرض سے انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ وہ ان مدارس کے انتظام کو بھی اپنے ہاتھ میں لیں لیکن اس خیال کے ظاہر ہونے کے ساتھ ہی خود علماء و طلباء نے اصلاح کی طرف توجہ کی، اور اس غرض سے مدرسہ تابخانہ میں جس کو سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ نے قائم کیا تھا علماء و مشائخ کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں تمام اعیانِ سلطنت مثلاً وزیر اعظم حقی پاشا شیخ الاسلام حسین حسنی آفندی، سعید پاشا پریسیڈنٹ دارالامراء، محمود شوکت پاشا وزیر صیغۂ جنگ وغیرہ بھی شریک ہوئے اور سب سے پہلے وزیر اعظم نے مسلمانوں کی اُن علمی ترقیوں کا ذکر کیا جو انھوں نے اُس زمانے میں کی تھیں جب یورپ جہالت کا ظلمت کدہ بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد متعدد مقرروں نے تقریریں کیں اور نصاب تعلیم کی اصلاح پر زور دیا، چنانچہ حساب ہندسہ، جغرافیہ، جبر و مقابلہ، طبیعات، علم الموالید، علم الفلک اور علم کیمیا، نصاب تعلیم کے ضروری اجزا قرار دیئے گئے۔ اور مدت تعلیم بارہ سال مقرر کی گئی اور یہ نصاب قسطنطنیہ کے چند مدارس یعنی مدرسہ فاتح، مدرسہ سلطان احمد، مدرسہ بایزید، اور مدرسہ شہزادہ میں جاری کر دیا گیا۔ لیکن

؎۵۔ الارشاد و التنظیم صفحہ ۲۲۔

بعض روشن خیال علماء نے اس اصلاح کو بوجوہ ناکافی سمجھا۔

(۱)۔ علوم متذکرہ بالا بے شبہ ضروری ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس نصاب میں اکثر ایسی کتابیں داخل کی گئی ہیں جن کی تعلیم سے تضییع اوقات کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا مثلاً صرف ونحو میں کتاب الامثلۃ و البناء، کتاب المقصود، کتاب تعلیم المتعلم، کتاب العوامل، کتاب الاظہار، کافیہ مع شرح جامی، شافیہ، الفیہ ابن مالک اس نصاب کا جزو ہیں، لیکن ان کتابوں سے اصلاح کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ آج تمام مدارس اسلامیہ میں یہی کتابیں پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔ اس بناء پر جو کتابیں ہمارے علمی تنزل کا حقیقی سبب ہیں اُن سے ہماری علمی اور ذہنی ترقی کیونکر ہو سکتی ہے۔ شافیہ درحقیقت کتاب نہیں بلکہ ایک چیستان ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ خود ابن حاجب بھی اس کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ تمام کتابیں صرف ایک فن یعنی صرف ونحو میں ہیں، جو علوم آلیہ میں سے ہیں یعنی وہ بجائے خود مقصود بالذات نہیں ہیں، بلکہ علم ادب کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس بناء پر ان سے زیادہ علمِ ادب کا لحاظ رکھنا چاہیے لیکن اس مرمّمہ نصاب میں صرف سبعہ معلقہ، قصیدۃ البُردہ، قصیدہ بانت سعاد اور مقاماتِ حریری داخل کی گئی ہیں جو تعداد میں صرف ونحو کی کتابوں سے بہت کم ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ ادب کی اور کتابوں کا بھی اضافہ ہونا چاہیئے۔

(۲)۔ دینیات میں اس قسم کی کتابیں داخل نصاب کرنی چاہیئیں جن سے تعصب جمود اور تقلید کے شکنجے سے طلباء کو آزادی حاصل ہو لیکن دینیات کے متعلق اس نصاب میں اظہار الحق، تحفہ اثنا عشریہ اور ملل ونحل داخل کی گئی ہیں جو تعصب، مجادلہ اور مشاجرہ کا سرچشمہ ہیں۔

ان وجوہ کی بناء پر انھوں نے اصلاح نصاب کا یہ اصول قرار دیا کہ

(۱)۔ صرف عربیت کی تحصیل کے لئے چار سال مقرر کئے جائیں جس میں ایک مستعد طالب العلم صرف، نحو، معانی وبیان وغیرہ کی تکمیل اچھی طرح کر سکتا ہے لیکن اس کے لئے

عمدہ کتابیں درس میں داخل ہونی چاہئیں۔ اگر اس غرض کے لئے قدما کی کتابیں کافی نہ ہوں تو جدید تالیفات کے مہیا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(۲)۔ فنون عربیت کی تکمیل کے بعد سب سے اہم چیز یہ ہے کہ خصوصی علما پیدا کئے جائیں، جو صرف ایک خاص فن کے ماہر ہوں جیسا کہ قدما کا طرز تھا۔ اسلامی علوم و فنون میں چھ علم یعنی فقہ، حدیث، تفسیر، کلام، تاریخ، ادب، سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہیں۔ اس بناء پر طلبا کو چھ قسم میں منقسم کر دینا چاہئے لیکن فقہ کے بھی دو جزو ہیں۔ عبادات و معاملات اس لئے جو طلباء فقہ کے لئے تیار کئے جائیں اُن کی دو قسمیں کر دینی چاہئیں۔ جو لوگ خاص عبادات کی شاخ کو لیں اُن کے لئے علم کلام کا ماہر اور حافظ قرآن ہونا ضروری قرار دیا جائے اور جو لوگ صرف معاملات میں کمال پیدا کرنا چاہیں اُن کے لئے علم حدیث اور یورپ اور دولت عثمانیہ کے قوانین کا جاننا لازمی کر دیا جائے۔ محدثین کے لئے علاوہ صحاح ستہ کے اسماء الرجال اور طبقات رواۃ وغیرہ کا علم بھی ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ وہ فقہ اور علوم قرآنیہ سے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ مفسرین کو علم تفسیر اس جامعیت کے ساتھ حاصل کرنا چاہئے کہ اسباب نزول، ناسخ و منسوخ، مجمل و مفصل، محکم و متشابہ، صریح و موؤل وغیرہ سے کافی واقفیت ہو۔ اس کے ساتھ اُن کو حفظ قرآن اور کسی قدر علم اصول اور فقہ سے بھی واقف ہونا چاہئے۔

ادباء کے لئے علم عروض و قوافی کے بعد یہ ضروری ہے کہ وہ امثال عرب اور ایام عرب سے کافی طور پر واقف ہوں۔ اُن کو جاہلی، مخضرمی، اور اسلامی شعراء کے بہترین اشعار ازبر ہوں۔ علم ادب کی بہترین کتابیں مثلاً کتاب العمدہ اور مثل السائر وغیرہ اُن کے درس میں ہوں وہ کسی قدر علم تاریخ سے بھی جو ادب کا ضروری جز ہے واقف ہوں۔ نیز کی علم ادب اور فرانسیسی علم ادب کی تاریخ سے بھی ماہر ہوں اور ان باتوں کے ساتھ یورپ کی کسی زبان سے بھی واقف ہوں۔

مورخین کے لئے اہل عرب اور دول اسلامیہ کی تاریخ کے ساتھ گزشتہ قوموں کی تاریخ کا جاننا بھی ضروری ہے لیکن ان تمام اقسام میں متکلمین کا گروہ سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔ کیونکہ اسی گروہ پر اس زمانے میں عقائد اسلام کی بقا موقوف ہے، اور یہی گروہ حکمائے اسلام کا لقب حاصل کر سکتا ہے۔ اس بنا پر موجودہ ضروریات اور حالات کے لحاظ سے اُن کے لئے عقائد اسلام ہی کی تعلیم ضروری نہیں ہے بلکہ اُن کو فلسفۂ قدیمہ، فلسفۂ جدیدہ، رومن لا، گزشتہ قوموں کے قوانین، یورپ کے پالٹیکس کی تاریخ، ریاضی، طبیعات، یہود، اہل ہند، اہلِ یونان، اہل بابل اور اہل مصر کے خرافات اور قدیم عقائد سے بھی کافی طور پر واقف ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ان ہی اصول کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے ایک نہایت مفصل اصلاحی پروگرام شائع کیا۔

علماء کے علاوہ طلباء نے بھی اس اصلاحی کام میں حصہ لیا اور اس موضوع پر نہایت کثرت سے مضامین لکھے۔ مثلاً ایک طالب العلم نے ایک نہایت مفصل مضمون لکھا جس میں وہ تدبیریں بتائیں جن پر عمل کرنے سے عربی مدارس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ان تجویزوں میں بعض یہ ہیں۔

(۱)۔ مدارس اسلامیہ اور اُن کے طلباء کی تعداد محدود کر دی جائے کیونکہ طلباء اور مدارس کی کثرت اور غیر محدود ہونے سے نظام تعلیم کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے اور کافی انتظام نہیں ہو سکتا۔

(۲)۔ مدت تحصیل محدود کر دی جائے جس کی متوسط میعاد بارہ سال ہو سکتی ہے۔ لیکن جو طالب العلم مدرسہ میں داخل ہوں اُن کا سن بارہ سال سے متجاوز نہ ہو۔

(۳)۔ علوم متداولہ کے ساتھ علوم جدیدہ کا بھی اضافہ کیا جائے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ وہ طلباء جنھوں نے اسلامی علوم وفنون کے ساتھ علوم جدیدہ کی تعلیم بھی حاصل کی ہے اُن طلباء سے زیادہ قابل نکلے ہیں جنھوں نے صرف علوم قدیمہ کی تحصیل پر اکتفا کیا ہے۔ ۵۱

روس کی تعلیمی حالت آج سے چند سال پیشتر نہایت افسوس ناک بلکہ عبرت انگیز تھی وہاں کے مکاتب ومدارس کے قیام وبقاء کا تمام تر دار ومدار خود قوم پر تھا جن کی عمارت تمام ممالک اسلامیہ سے مختلف ہوتی تھی اور ان میں اور عام رہنے کے مکانات میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ خود مدارس ومکاتب میں کوئی فرق نہیں تھا بلکہ تقریباً دونوں مرادف الفاظ تھے۔ کیتھرائن ثانی کے عہد سے پیشتر ان کی تعداد نہایت کم تھی لیکن جب کیتھرائن کا زمانہ آیا اور اس نے مدارس ومساجد کی تعمیر کا عام حکم دیا تو آہستہ آہستہ ان کی تعداد میں ترقی ہوئی یہانتک کہ جب اخیر میں سلطنت کی طرف سے اس معاملہ میں سختیاں شروع ہوئیں تو امراء نے غیرت وحمیت سے ان سختیوں کے خلاف نہایت کثرت سے مساجد، مدارس اور مکاتب کی بنیاد ڈالی۔ اور بعض امراء نے تو تنہا متعدد مساجد ومکاتب قایم کئے۔ شہروں میں جو مکاتب قایم تھے ان کے مصارف کے متکفل امراء ہوتے تھے اور دیہاتی مکتبوں کا بار خود طلباء اٹھاتے تھے البتہ اگر گاؤں میں دولتمند لوگ ہوتے تھے تو وہی اُن کے مصارف بھی برداشت کرتے تھے۔ اور معلمین کی تنخواہ صدقات کی مد سے ادا ہوتی تھی۔

تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ ابتداء میں صرف حروف تہجی اور اعراب یعنی زیر وزبر وغیرہ سکھائے جاتے تھے اور سورہ فتح سے لے کر اخیر تک کی سات سورتیں پڑھائی جاتی تھیں جو قازان میں علیحدہ ہفت یک کے نام سے چھپی چھپائی ملتی تھیں۔ یہ تعلیم امام یا مدرس سے متعلق ہوتی تھی لیکن اگر مدرسہ میں اوپر کے درجے کے طلباء ہوتے تھے تو اُن کو بھی یہ خدمت انجام دینی ہوتی تھی، بچوں کے قیام کا طریقہ یہ تھا کہ بعض مکتب ہی میں رہتے تھے اور بعض اپنے

لہ قسطنطنیہ سے ایک اخبار العرب کے نام سے نکلا تھا جس کے ایڈیٹر شیخ محمد عبد اللہ تھے جو اہل عرب کی طرف سے قسطنطنیہ میں پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور اُن کا شمار وہاں کے مشہور علماء میں تھا۔ اسی اخبار کے متعدد پرچوں میں یہ معلومات شائع ہوئے تھے۔ جن کا خلاصہ ہم نے جولائی ۱۹۱۰ء کے الندوہ میں مولانا شبلی مرحوم کی ایماء سے کر دیا تھا۔ اس موقع پر ہم نے اُسی خلاصے کا خلاصہ درج کر دیا ہے۔ (نوٹ۔ متعلق ص ۵۷)

گھروں کو چلے آتے تھے۔ لیکن بڑے طلباء کو ہمیشہ مدرسہ ہی میں رہنا پڑتا تھا۔ تعلیم کا زمانہ اکتوبر سے شروع ہو کر اپریل تک ختم ہو جاتا تھا۔ یعنی سال میں صرف سات مہینے کی تعلیم ہوتی تھی۔

حروف تہجی کی تعلیم کے بعد قرآن شروع کرایا جاتا تھا۔ اور جب ایک خاص حد تک اُس کی تعلیم ہو جاتی تھی تو بعض ترکی رسالے پڑھائے جاتے تھے۔ اس کے بعد عربی اور فارسی کے بعض رسائل مثلاً شروط الصلوٰۃ چہل حدیث لباب اور یک حکایت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر کتاب تعلیم الصلوٰۃ اور تحفۃ الملوک کا درس دیا جاتا تھا، اور ان رسائل کی تعلیم میں دو برس سے زیادہ کا زمانہ صرف ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد حسب ذیل کتابوں کی تعلیم شروع ہوتی تھی۔

صرف میں بدان (یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے اور اسی سے ابتداء کی جاتی تھی اس لئے اس کو بدان کہتے تھے) شرح عبداللہ فارسی۔

نحو میں عوامل جرجانی فارسی میں، شرح انموذج الزمخشری للاردبیلی، کافیہ، شرح جامی (کے بعض مقامات)، معہ حاشیہ عبدالغفور و عصام و لبیب۔

منطق میں شرح ایساغوجی لحسام الکاتبی مع حواشی ملا نعمان و ملا صادق و محی الدین البردعی و سیالکوٹی، قطبی مع میر و حاشیہ سیالکوٹی و مفتی زادہ۔

عقائد میں شرح عقائد نسفی معہ حاشیہ خیالی و سیالکوٹی و ملا احمد، سلم مع قاضی مبارک، حمداللہ و ملا حسن، عقائد جلالی مع حاشیہ خانقانی، ملا جلال مع حاشیہ میر زاہد و حاشیہ قاضی مبارک۔

فلسفہ میں شرح حکمۃ العین الٰہیات۔

اصول فقہ میں توضیح تلویح۔

فقہ میں مختصر الوقایہ، اور بعض مدارس میں ہدایہ بھی۔

تفسیر و حدیث میں کچھ نہیں۔ البتہ بعض مدارس میں مشکوٰۃ اور بیضاوی پڑھائی جاتی تھی۔

اور بعض مدارس میں شرح عقائد نسفی کے بعد شرعۃ الاسلام، طریقۂ محمدیہ اور عین العلم کی تعلیم دی جاتی تھی اور ان کو حدیث کی کتاب خیال کیا جاتا تھا۔

ان کتابوں کے بعد علماء و طلباء کے نزدیک علم کا کوئی درجہ باقی نہیں رہ جاتا تھا، اور وہ عمر بھر کے لئے ان پر قناعت کرتے تھے۔ اہل قازان نے یہ طریقۂ درس اہل بخارا سے لیا ہی جو اُن کے نزدیک علوم و فنون کا سب سے بڑا مرکز تھا اور وہ اُس کو بخارا شریف کہتے تھے اس لحاظ سے بخارا کی تعلیمی حالت کو بھی قازان ہی پر قیاس کرنا چاہیے۔ البتہ بخارا میں بعض کتابیں مثلاً شرح جامی، عقائد نسفی سلم وغیرہ نہیں پڑھائی جاتی تھیں اور علم صرف تو سرے سے نصاب ہی میں داخل نہیں تھا۔

قازان میں یہ طریقۂ تعلیم اس وقت تک قائم رہا جب تک بخارا اُن کا قبلہ آمال رہا لیکن ریل اور جہاز کی ایجاد کے بعد جب اہل قازان نے بخارا کو چھوڑ کر قسطنطنیہ، مصر اور حرمین کا سفر کیا تو اُن کو نظر آیا کہ اُنھوں نے تعلیمی سفر اور علمی تکمیل کے لئے بخارا کا غلط انتخاب کیا تھا۔ بخارا کو اس وقت جو کچھ شرف حاصل ہی وہ اُس کی قدیم علمی امتیاز کی بنار پر ہی ورنہ موجودہ زمانہ میں وہ دوسرے اسلامی ممالک سے بہت زیادہ پست حالت میں ہی۔ اس خیال کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اُن کو اپنی تعلیمی اصلاح کا خیال پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ حسب ذیل اصلاحات عمل میں آئیں:

(۱)۔ مکاتب و مدارس میں فرق قائم کیا گیا یعنی جن میں ابتدائی تعلیم ہوتی تھی اُن کو مکتب کا لقب دیا گیا اور جن میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ اُن کو مدرسہ کے نام سے پکارا گیا۔

(۲)۔ تمام مدارس و مکاتب کے مصارف کا بار امرا نے برداشت کیا اور طلباء اس بارگراں سے سبکدوش ہو گئے۔

(۳)۔ معلمین کی تنخواہیں بھی امرا ہی نے ادا کرنا شروع کیں۔

(۴)۔ چہل حدیث، تحفۃ الالباب، یک حکایت وغیرہ جو رسالے ابتدائی تعلیم میں

پڑھائے جاتے تھے، تمام تر موضوع و مزخرف روایات پر مشتمل تھے، اب یہ سب نکالدیئے گئے اور ان کے بجائے ایسے رسالے داخل نصاب کئے گئے جن کے ذریعہ سے عقائد عبادات اور معاملات کی صحیح تعلیم ہو سکتی تھی۔

(۵)۔ صرف ونحو کی ابتدائی کتابوں کے ترجمے خود تاتاری زبانوں میں کئے گئے جن سے تعلیم میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

(۶)۔ تعلیم کے لئے ماہوار تنخواہ پر مدرس مقرر کئے گئے جن کا کام تعلیم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

(۷)۔ تعلیم اور مکاتب میں بچوں کی آمد و رفت کے اوقات معین کئے گئے۔

(۸)۔ نصابِ تعلیم سے متعدد غیر مفید کتابیں نکال ڈالی گئیں اور ان کے بجائے متعدد ضروری علوم مثلاً معانی، بیان، بدیع، عروض، تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں داخل کی گئیں۔

(۹)۔ علم کلام میں عقائد سلف کو پیش نظر رکھا گیا اور امام طحاوی کی بیان السنہ داخل نصاب کی گئی۔

(۱۰)۔ بعض جدید علوم بھی مثلاً حساب، جغرافیہ، ہندسہ، اور تاریخ شامل نصاب کئے گئے۔

(۱۱)۔ تحریر میں صحتِ املا اور انشا، پردازی کا لحاظ رکھا گیا۔

(۱۲)۔ پہلے طلباء اپنا کھانا خود پکاتے تھے اب اُن کے لئے باورچی مقرر کئے گئے۔

یہ طریقہ اصول جدیدہ کے نام سے مشہور ہوا اور اُس کے بہترین فوائد نظر آئے تو تمام دولتمند لوگوں نے اُس کی طرف توجہ مبذول کی اور بیش قرار رقموں سے اس کی اعانت کی [اے]

طریقۂ اصلاح — آج اگرچہ تمام دنیائے اسلام میں جیسا کہ تصریحات متذکرہ بالا سے معلوم ہوا ہوگا، قدیم طریقۂ تعلیم کی بہت کچھ اصلاح یا کم از کم اصلاح کی ایک عام تحریک جاری

اے۔ تلفیق الاخبار جلد دوم از صفحہ ۲۶۷ تا صفحہ ۲۷۷۔

ہوگئی ہی، تاہم ابھی ہم میں اور قدماء کی علمی، مذہبی اور اخلاقی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہی، بلکہ جب تک زمین و آسمان قایم رہینگے یہ فرق باقی رہیگا۔ کیونکہ ہم نے صرف نصابِ تعلیم میں قدماء کی پیروی کی۔ حالانکہ ہماری علمی ترقی کا اصلی زمانہ وہ تھا جب کہ سرے سے نہ کوئی نصابِ تعلیم تھا نہ کوئی نظامِ تعلیم، صرف ایک علمی ذوق، ایک مذہبی تشنگی اور ایک اخلاقی ولولہ تھا جو ہمارے نصابِ تعلیم، ہمارے نظامِ تعلیم، ہماری عظیم الشان مدارس کی عمارت اور ہماری تمام تعلیمی اصول و ضوابط کا قایم مقام تھا اور ہم نے اب تک ان چیزوں میں قدماء کی تقلید نہیں کی ہی۔ صرف اتنا کیا ہی کہ ان کی بہترین تصانیف کو نصابِ تعلیم میں داخل کرلیا ہی۔ جس سے ہم میں فی الجملہ وسیع الخیالی پیدا ہوگئی ہی۔ لیکن قدماء کا طریقۂ تعلیم اور بھی متعدد اجزا پر مشتمل تھا جن کے مجموعہ کو "اسلامی طریقۂ تعلیم و تربیت" کا مقدس لقب دیا جا سکتا ہی۔ آج جو جدید طریقۂ تعلیم و تربیت ہم کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہی اُس کے مقابل میں یہ اسلامی طریقۂ تعلیم و تربیت، نہایت سادہ، بالکل بے رنگ اور سخت بے کیف نظر آئیگا۔ تاہم یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہی کہ دنیا کی اصلاح ہمیشہ سادہ، واضح اور آسان ہی طریقہ سے ہوئی ہی۔ اور خود اسلام کو ملت لمعہ بیضا یعنی آسان اور روشن بنا کر خدا نے دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا ہی اور یہی وضاحت اور سادگی اسلام کے طریقۂ تعلیم و تربیت میں بھی نظر آتی ہی۔ چنانچہ ان کی تفصیل سے اس کا اندازہ ہوگا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں تربیت اولاد کا ایک خاص عنوان قایم کیا ہی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہی:

اسلامی طریقۂ تربیت اولاد

اسلام میں بچوں کی تربیت نہایت اہم چیز ہی، اور بچہ گویا اپنے باپ ماں کے پاس ایک امانت ہی جس کا پاک دل ایک بیش بہا جوہر ہی جو اگرچہ ہر قسم کے نقش و نگار سے خالی ہی لیکن ہر نقش و نگار کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہی، اگر اُس کو نیکی کا خوگر بنایا جائے تو نیکی ہی پر اُس کی نشو و نما ہوگی، دین و دنیا میں وہ سعادت مند

ہوگا۔ اور اُس کے ثواب میں اُس کے باپ ماں، معلّم اور اتالیق سب شریک ہونگے،
لیکن اگر اُس کو برائی کا عادی بنایا گیا اور جانوروں کے گلہ کی طرح خود سر چھوڑ دیا گیا تو
وہ بدبخت ہو کر تباہ ہو جائے گا۔ اور اس کا گناہ اُس کے ولی اور مربّی پر ہو گا۔ خدا خود
کہتا ہے:
یا ایھا الذین اٰمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا لوگو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال
کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔
توجب اُس کا باپ اُس کو دنیا کی آگ سے بچاتا ہے تو آخرت کی آگ سے بچانا تو اور بھی ارجح
ہوگا، اور اس آگ سے بچانے کی صورت صرف یہی کہ باپ اُس کو ادب سکھائے، اُس کو مہذب
بنائے، اس کو محاسن اخلاق کی تعلیم دے، اُس کو بُرے ساتھیوں سے محفوظ رکھے، اُس کو عیش
پرستی اور زیب و زینت کا خوگر نہ بنائے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اُس کی نگرانی کرے
اُس کو نیک اور متدین عورت کا دودھ پلائے جو اپنی وجہ معاش حلال طریقہ سے پیدا کرتی ہو کیونکہ
جو دودھ حرام وجہ معاش سے پیدا ہوتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر اس سے
لڑکے کی نشو و نما ہوگی تو وہ خبیث الطینت ہوگا اور ہر خیانت کی طرف میلان ظاہر کریگا۔
جب بچہ ہوش سنبھالے تو اور بھی شدت کے ساتھ اُس کی نگرانی کرنی چاہئے۔ اور اس
سلسلہ میں سب سے پہلے جو چیز قابل لحاظ ہے وہ حیا، کی ابتدائی علامات کا ظہور ہے۔ کیونکہ جب
بچہ وقار اور شرم و حیا کا اظہار اور بعض کاموں سے احتراز کریگا تو اس سے یہ ظاہر ہوگا
کہ اُس پر عقل کی روشنی پڑتی، اور اس روشنی میں وہ بعض چیزوں کو بُرا اور بعض چیزوں
کو اس کے مخالف دیکھتا ہے۔ اس لئے ایک چیز کے کرنے سے شرماتا ہے لیکن دوسرے کام
سے اُس کو حیا نہیں آتی اور یہ خداوند تعالےٰ کا ایک ہدیہ اور ایک بشارت ہے جو
اُس کے اعتدال خلق اور صفائے قلب پر دلالت کرتی ہے اور بلوغ کے وقت کمال عقل
کی خوشخبری سُناتی ہے۔ پس شرمیلے لڑکے کو چھوڑ دینا مناسب نہیں، بلکہ اسی حیا ر کا اُس کو

خوگر بنا نامناسب ہے۔ سب سے پہلی بداخلاقی جو لڑکے پر غالب ہو جاتی ہے وہ کھانے کی شدید حرص ہے اس لئے اُس کو یہ ادب سکھانا چاہیئے کہ کھانا صرف داہنے ہاتھ سے کھائے۔ کھانے کے شروع میں بسم اللہ کہے، اپنے قریب کی چیز کھائے، اوروں سے پہلے کھانے میں پیش دستی نہ کرے، کھانے کی طرف یا کھانے والوں کی طرف گہری نگاہ سے نہ دیکھے لقمے کو اچھی طرح چبائے، منہ میں پے در پے لقمے نہ ڈالے، اپنے ہاتھ اور کپڑے کو کھانے سے آلودہ نہ کرے، کبھی کبھی اُس کو خشک روٹی بھی کھلانی چاہیئے تاکہ سالن کو ضروری چیز نہ سمجھنے لگے، اُس کے سامنے شکم پری کی برائی بیان کرے، اور جو لوگ زیادہ کھاتے ہیں اُن کو جانوروں سے تشبیہ دے، جو لڑکے زیادہ کھاتے ہیں اُن کی مذمت اور جو لڑکے کم کھاتے ہیں اُن کی مدح کرے، اس کو یہ بتائے کہ کھانے میں ایثار کرے اور اُس کی بہت کم پروا کرے، اور روکھا سوکھا جو کچھ ملے اُس کو کھالے۔

کپڑوں میں اس کو سفید کپڑے کی ترغیب دے، رنگین اور ریشمی کپڑوں کی طرف مائل نہ کرے، اور اُس کو بتائے کہ یہ عورتوں اور ہیجڑوں کے لئے موزوں اور مردوں کے لئے ننگ و عار ہیں، اور جب لڑکے کے جسم پر کوئی رنگین یا ریشمی کپڑا دیکھے تو اُس کی بُرائی بیان کرے، اور جو لڑکے عیش و تنعم کے خوگر ہو چکے ہیں ان کی صحبت سے اور نیز ان لوگوں سے جو اس کی ترغیب دیتے ہیں بچائے کیونکہ جب لڑکا ابتداء میں بالکل خودسر چھوڑ دیا جاتا ہے تو اکثر بد اخلاق، جھوٹا، حاسد، چور، چغل خور، جھگڑالو، فضول گو، اور مسخرا نکلتا ہے۔ اور ان تمام بد اخلاقیوں سے صرف حسن تادیب کے ذریعہ سے اس کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

اس تمام اخلاقی نگرانی کے بعد اُس کو مکتب میں بٹھائے اور قرآن پاک اور نیک لوگوں کے سوانح و حالات کی تعلیم دے، تاکہ اُس کے دل میں نیک لوگوں کی محبت جاگزیں ہو جائے۔ حالت تعلیم میں بچوں کو اُن اشعار سے محفوظ رکھنا چاہیئے جن میں عشق و عاشقی کا

تذکرہ ہو اور اُن ادیبوں کی صحبت سے بھی بچانا چاہئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لطیف الطبعی کی علامت ہی کیونکہ ان سے بچے کے دل میں برائی کا بیج جڑ پکڑ لیتا ہی، اور اگر بچے سے کسی خلق جمیل کا اظہار یا کسی فعل محمود کا صدور ہو تو اس پر اُس کی عزت کرنی چاہئے، اُس پر ایسا انعام دینا چاہئے جس سے اُس کو مسرت حاصل ہو، اور لوگوں کے سامنے اُس کی تعریف کرنی چاہئے، لیکن اگر کبھی اس کے برعکس نتیجہ ظاہر ہو تو چشم پوشی کرنی چاہئے، اُس کی پردہ دری کرنی نہیں چاہئے، بالخصوص جب لڑکا خود اُس کا اخفار کرے تو اس کا اظہار اُس کو اور دلیر بنا دیگا، اور وہ اس کو علانیہ کرنے لگے گا، پھر اگر وہ دوبارہ کسی بداخلاقی کا مرتکب ہو تو مخفی طور پر اُس کو سرزنش کرنی چاہئے، اور اُس کے نتایج بد کو نہایت اہمیت کے ساتھ اُس کے ذہن نشین کرنا چاہئے، لیکن ہر وقت اس کو سرزنش کرنا مناسب نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ ملامت کا خوگر ہو جائیگا اور اُس کے دل سے اس کا اثر جاتا رہیگا۔ اس لئے باپ کو خود اپنی باتوں میں ہیبت قایم رکھنی چاہئے، اور کبھی کبھی بچے کو جھڑکنا چاہئے۔ ماں کو چاہئے کہ وہ باپ سے اُس کو ڈرائے اور برائیوں سے اُس کو روکے۔ دن کے سونے سے بھی بچے کو روکنا چاہئے کیونکہ اس سے کاہلی پیدا ہوتی ہی، لیکن رات کو خوب سونے دینا چاہئے، البتہ نرم بچھونے سے احتراز کرنا چاہئے تاکہ اُس کے اعضاء سخت ہوں، اور بدن اتنا موٹا نہ ہو جائے کہ عیش و تنعم کے بغیر زندگی نہ بسر کر سکے، بلکہ اوڑھنے بچھونے اور کھانے پینے میں اُس کو موٹے جھوٹے کا عادی بنایا جائے، جو کام وہ خفیہ طور پر کرے اُس سے روکنا چاہئے، کیونکہ وہ اس کو مخفی طور پر اس لئے کرتا ہی کہ اُس کو برا سمجھتا ہی۔ ایسی حالت میں اگر اُس کو چھوڑ دیا گیا تو وہ برائی کا عادی ہو جائے گا۔

دن کے بعض حصوں میں اس کو چلنے پھرنے اور ورزش کرنے کا خوگر کرنا چاہئے تاکہ اُس پر کاہلی کا غلبہ نہ ہو، اس کو اس کا بھی عادی بنانا چاہئے کہ اپنے جسم کے اطراف کو نہ کھولے تیز نہ چلے، دونوں ہاتھوں کو ڈھیلا نہ کرے، بلکہ اپنے سینے سے ملائے رکھے، اپنے ساتھیوں پر

اپنے باپ ماں کے مملوکات، یا اپنی غذا، اپنے لباس، اپنی تختی اور دوات کے ذریعہ سے تفاخر نہ کرے بلکہ خاکساری کا خوگر ہو، اور اپنے ہم صحبتوں کی عزت اور اُن کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرے، اگر وہ صاحبِ جاہ آدمی کا لڑکا ہے اور لڑکوں سے کوئی چیز مبادلۃً لیتا ہے تو اُس کو روکنا چاہیئے کہ بلند ہمتی دینے میں ہے، لینے میں نہیں، بلکہ لینا کمینہ پن اور دناءت ہے، اور اگر وہ صاحبِ احتیاج شخص کا لڑکا ہے، تو اُس کو بتانا چاہیئے کہ حرص وطمع اور لینا ذلت ہے۔ بہرحال لڑکوں کے سامنے چاندی سونے کی محبت وحرص کی برائی بیان کرنی چاہیئے، اور اُن سے اس طرح ڈرانا چاہیئے جس طرح سانپ اور بچھو سے ڈراتے ہیں۔

اُس کو اس بات کا خوگر بنانا چاہیئے کہ اپنی مجلس میں نہ تھوکے، نہ ناک صاف کرے، اگر نہ دوسروں کے سامنے جمھائی لے، نہ دوسروں کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھے، نہ پانوں پر پانوں رکھے، نہ ٹھوڑی پر ہاتھ دھرے، نہ کلائی پر سر کو ٹیکے کیونکہ یہ کاہلی کی علامت ہے، اس کو بیٹھنے کی ہیئت بتانی چاہیئے، زیادہ بولنے سے منع کرنا چاہیئے کہ یہ بے حیائی پر دلالت کرتا ہے اور کمینوں کے بچوں کا فعل ہے، قسم کھانے سے خواہ وہ سچی ہو یا جھوٹی منع کرنا چاہیئے تاکہ بچپن میں اس کا عادی نہ ہو جائے۔ اس کو ابتداءِ کلام کرنے سے بھی روکنا چاہیئے، اور صرف بقدر سوال کے جواب دینے کی عادت ڈالنی چاہیئے اور یہ بتانا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص جو اُس سے سن میں بڑا ہو بات کرے تو اُس کو اچھی طرح سننا چاہیئے، اس کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو جانا چاہیئے۔ اُس کے لئے جگہ خالی کرنی چاہیئے، اور اس کے سامنے بیٹھنا چاہیئے۔ لغویات، فحاشی، لعن وطعن، گالی گلوج، اور اُن لوگوں کی صحبت سے جو ان کے عادی ہیں اس کو بچانا چاہیئے، کیونکہ بُرے ہم صحبتوں کے اثر سے اس میں بھی یہ عادت سرایت کر جائے گی اور لڑکوں کی تادیب کا اصلی نقطہ یہ ہے کہ اُس کو بُرے لوگوں کی صحبت سے بچایا جائے۔

اگر استاد اُس کو سزا دے تو مناسب یہ ہے کہ وہ بہت شور وغل نہ کرے، اور کسی سے طالبِ اعانت نہ ہو، بلکہ صبر کرے اور اس حالت میں اُس کو بتانا چاہیئے کہ صبر بہادروں اور

مردوں کا شیوہ ہی۔ اور بہت زیادہ شور و غل غلاموں اور عورتوں کا وتیرہ۔
مکتب سے پلٹنے کے بعد اُس کو عمدہ کھیل کی اس قدر اجازت دینی چاہیے کہ اس کو تکان نہ
لاحق ہو تاکہ مکتب کی زحمتوں کے بعد اُس کو آرام ملے، کیونکہ بچہ کو کھیل کود سے روکنا، اور
ہمیشہ بجبر پڑھانا اُس کو مردہ دل بنا دیتا ہی، اُس کی ذہانت کو فنا کر دیتا ہی اور اُس کے عیش کو
مکدر کر دیتا ہی، یہاں تک کہ وہ کلیتہً اُس سے نجات حاصل کرنے کا حیلہ ڈھونڈھنے لگتا ہی۔
اس کو باپ، ماں، اُستاد، اتالیق، اور ہر اس شخص کی اطاعت کی تعلیم دینا چاہیے جو
اُس سے بڑا ہو، اور یہ کہ اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور اُن کے سامنے کھیلنا چھوڑ دے،
اور جب وہ سنِ تمیز کو پہونچ جائے تو طہارت اور نماز کے چھوڑنے میں نرمی نہ اختیار کرے
اور اُس کو رمضان کے بعض دنوں میں روزہ رکھنے کا حکم دے، اور ریشم حریر اور سونے کے
استعمال سے روکے، اور اُس کو ضروری حدود شرعیہ کی تعلیم دے، چوری، اکل حرام، خیانت
جھوٹ، فحش وغیرہ سے جو لڑکوں کی غالب خصوصیات ہیں اُس کو ڈرائیے، اس طرح جب
اُس کی نشو و نما ہوگی تو جب بلوغ کے قریب پہونچے گا تو ممکن ہی کہ ان کے اسرار کو بھی جان لے
اب اُس کو یہ بتانا چاہیے کہ غذا صرف ایک دوا ہی، اور اُس کا مقصد یہ ہی کہ اُس کے ذریعہ سے
انسان کو طاعتِ الٰہی کی طاقت حاصل ہو، دنیا کی کوئی اصلیت نہیں کیونکہ اُس کو بقا نہیں، وہ
ایک گزرگاہ ہی قیام گاہ نہیں، اور آخرت قیام گاہ ہی گزرگاہ نہیں، موت ہر وقت آسکتی ہی،
اس لیئے عقلمند وہ ہی جو دنیا ہی میں آخرت کا سامان کرلے تاکہ خدا کے نزدیک اس کا درجہ
بلند ہو اور جنت میں اس کو بکثرت نعمتیں حاصل ہوں، اگر اس قسم کے بچے کی نشو و نما عمدہ
طریقہ پر ہوئی ہوگی تو بلوغ کے وقت یہ کلام موثر اور کامیاب ہوگا اور اُس کے دل میں کالنقش
فی الحجر ہو جائے گا۔ لیکن اگر اُس کی نشو و نما اس کے برخلاف ہوگی مثلاً وہ بچپن ہی سے کھیل
کود، فحاشی اور بے حیائی، کھانے کی اور پہننے کی حرص اور زیب و زینت کا خوگر ہوگا تو اُس کا
دل قبول حق سے ابا کرے گا۔ اس بنا پر ابتدائی امور کا زیادہ لحاظ رکھنا چاہیے۔ کیونکہ بچہ فطرتاً

خیر و شر دونوں کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہی، اور اس کو باپ ماں ان میں سے ایک کی طرف مائل کردیتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہی کہ ہر بچہ کی پیدائش فطرت پر ہوتی ہی، پھر اُس کے باپ ماں اُس کو یہودی، مجوسی یا نصرانی بنا لیتے ہیں۔ سہل بن عبد اللہ تستری فرماتے ہیں کہ میں تین برس کا تھا تو راتوں کو اٹھ کر اپنے ماموں محمد بن سوار کی کیفیت نماز کو دیکھا کرتا تھا، انھوں نے کہا تم کیوں اُس خدا کو یاد نہیں کرتے جس نے تم کو پیدا کیا ہی، میں نے کہا کیوں کر یاد کروں؟ بولے، جب اپنے کپڑوں میں کروٹ لو تو تین مرتبہ زبان کو حرکت دیئے بغیر کہو کہ اللہ میرے ساتھ ہی، اللہ مجھ کو دیکھ رہا ہی، اللہ میرا گواہ ہی۔ میں نے چند راتوں کو ایسا کیا اور ان کو اس کی اطلاع دی تو انھوں نے کہا کہ اب ہر رات کو سات مرتبہ کہو، اس کی میں نے تعمیل کی اور اُن کو اس کی اطلاع دی، انھوں نے کہا کہ اب گیارہ بار کہا کرو، میں نے ایسا کیا تو دل میں اُس کی شیرینی محسوس کرنے لگا، ایک سال کے بعد میرے ماموں نے کہا کہ میں نے جو کچھ بتایا ہی اس کو یاد کرلو اور تا دم مرگ اُس پر مداومت کرو، وہ تم کو دنیا و آخرت میں فائدہ دیگا۔ میں نے چند سال اُن کی ہدایت پر عمل کیا تو اپنے اندر ایک شیرینی محسوس کی، پھر میرے ماموں نے ایک دن کہا کہ اے سہل خدا جس کے ساتھ ہی، خدا جس کو دیکھ رہا ہی، خدا جس کا گواہ ہی کیا وہ اُس کی نافرمانی کریگا؟ اب میں تنہا رہنے لگا۔ جب لوگوں نے مجھ کو مکتب میں بٹھایا تو میں نے کہا کہ میرے مقصد میں تفرق و تشتت پیدا ہو جائیگا۔ لیکن اُن لوگوں نے اُستاد سے یہ شرط کرلی تھی کہ میں ایک گھنٹہ کے لئے مکتب میں جاؤنگا، پھر پڑھ کر واپس آؤں گا۔ اب میں مکتب میں گیا، اور قرآن پڑھا اور اس کو حفظ کیا، اور اس وقت میرا سن چھ یا سات برس کا تھا، لیکن میں ہمیشہ روزہ رکھتا تھا، بارہ سال تک میری غذا صرف جو کی روٹی تھی، اسی حالت میں میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا اور اُس وقت میرا سن تیرہ سال کا تھا، میں نے اپنے گھر والوں سے درخواست کی کہ وہ مجھے بصرہ بھیجدیں تاکہ میں اُس سوال کو حل کرلوں۔ میں بصرہ آیا اور وہاں کے علماء سے یہ سوال کیا

لیکن کسی نے میری تشفی نہیں کی اب میں عبادان میں ایک بزرگ کے پاس گیا، اور انھوں نے مجھ کو جواب دیا۔ میں نے وہاں ایک مدت تک قیام کیا، ان کے کلام سے فائدہ اٹھاتا رہا، ان کے آداب سیکھتا رہا، پھر میں تستر میں واپس آیا۔ اب میں نے اپنی غذا یہ قرار دی کہ میرے لئے نہایت قلیل مقدار میں جو لے کر پیس لیا جاتا تھا اور اس کی روٹی پکائی جاتی تھی، میں صبح کے وقت بغیر نمک اور سالن کے اس کا ناشتہ کر لیتا تھا، اس طرح ایک درہم سال بھر میرے لئے کافی ہوتا تھا، پھر میں نے یہ قصد کیا کہ متصل میں راتوں کو فاقہ کروں پھر ایک رات کو افطار کروں، اس طرح ترقی دیکر بیس راتوں تک پہونچاؤں۔ میں نے ایسی حالت میں بیس برس بسر کئے، پھر دو سال تک دنیا کی سیاحت کی، پھر تستر کو واپس آیا اور تمام تمام رات نماز پڑھتا رہتا تھا، احمد کا بیان ہے کہ انھوں نے تا دم مرگ نمک نہیں کھایا۔[۵]

اسلامی طریقۂ تعلیم	اسلامی طریقۂ تعلیم کا سنگ بنیاد چار چیزیں ہیں۔

(۱)۔ مقصد تحصیل علم

(۲)۔ استاد اور شاگرد کی باہمی معاشرت

(۳)۔ اخلاق جس سے اس موقع پر طلباء کے وہ مخصوص اخلاق مراد ہیں جن کا اثر تعلیم و تعلّم پر پڑتا ہے۔

(۴)۔ کیفیت تحصیل علم و طریقۂ درس۔

چنانچہ ہم اسی ترتیب سے اسلامی طریقۂ تعلیم کے تمام عنوانات کی تفصیل کرتے ہیں

مقصد تحصیل علم	اسلام میں ہر چیز کا دارومدار نیت پر ہے۔ صحیح حدیث شریف میں آیا ہے،

انما الاعمال بالنیات، اس بنا پر طلب علم سے پہلے اس کا مطمح نظر مقرر کر کے اس کی نیت کر لینی چاہیئے، آج کل اہل علم کے حلقے میں یہ فقرہ بار بار دوہرایا جاتا ہے کہ علم کو صرف علم

---

[۵] - احیاء العلوم مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۵۲ تا ۵۵ بیان الطریق فی ریاضۃ الصبیان فی اول نشوہم و تادیبہم و تحسین اخلاقہم۔

کے لئے پڑھنا چاہئے۔ لیکن اسلاف کا نقطہ نظر اس سے بھی بلند تھا، ان کے نزدیک علم کا مقصد خداوند تعالےٰ کی رضا جوئی، ثواب آخرت کی تمنا، ازالۂ جہالت احیار شریعت اور حفاظت اسلام وغیرہ تھا، اور وہ اُس کے ذریعہ سے مرجع عام بننا اور سلاطین کا تقرب ڈھونڈھنا نہیں چاہتے تھے۔ امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اگر تمام دنیا میری غلام ہوتی تو میں اُن کو آزاد کر دیتا۔ اور اُن کی وراثت[1] سے علیحدہ ہو جاتا۔ کیونکہ جس شخص کو علم کی لذت مل جاتی ہے وہ زید وعمرو کے مال و دولت کی پروا نہیں کرتا۔ البتہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تنفیذ حق اور عزت دین کے لیئے اگر جاہ و شہرت کی ضرورت ہو تو اُس کے حاصل کرنے میں مضائقہ نہیں۔

شاید یہ کہا جائے کہ ان چیزوں کی نیت صرف مذہبی علوم کی تحصیل میں کی جاسکتی ہے باقی جدید علوم وفنون تو دنیوی فوائد و منافع کا ذریعہ ہیں، اُن کے ذریعہ سے ان پاک مقاصد کی نیت کیونکر کی جاسکتی ہے؟ لیکن یہ سخت غلطی ہے۔ جدید علوم وفنون سے سینکڑوں مذہبی کام لئے جاسکتے ہیں، اور لئے جا رہے ہیں۔ یہ ہماری نیت ہی کی خرابی ہے کہ ان علوم کے پڑھنے کے ساتھ ہی دنیوی اغراض پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ ورنہ نیت ایک ایسی چیز ہے جو ایک شئے کی حقیقت کو بدل سکتی ہے۔ ایک ضعیف حدیث میں آیا ہے کہ بہت سے اعمال دنیوی اعمال کی شکل میں نظر آتے ہیں لیکن حسنِ نیت سے وہ اعمال اُخروی کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں اور بہت سے اعمال، اعمال اخروی کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں لیکن نیت کی خرابی سے دنیوی اعمال کی شکل اختیار کر لیتے ہیں[2]۔ بالخصوص علم میں تو قلب ماہیت کی خاص صلاحیت ہے

امام سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ ہم علم کو دنیا کے لئے حاصل کرتے تھے لیکن وہ ہم کو آخرت کی طرف کھینچ لے گیا۔ امام ابن عیینہ فرماتے تھے کہ ہم نے علم حدیث کو خدا

---

[1] غلام جب آزاد کیا جاتا ہے تو آقا اُس کے تمام متروکات و مملوکات کا وارث ہو جاتا ہے۔ [2] تعلیم المتعلم طریق التعلم للشیخ زرنوجی۔ صفحہ ۱۳ تا ۱۷۔

کے لئے نہیں سیکھا تھا، لیکن اُس کا جو نتیجہ ہوا تم خود دیکھ رہے ہو۔[1] بعینہٖ اسی طرح انگریزی علوم کے مقاصد بھی بدل سکتے ہیں۔ اگر دین کی تقویت و شوکت اور قوم و ملک کے رفاہ و ترقی کی نیت سے پڑھے جائیں تو حسنِ نیت کے دائرہ میں داخل ہو جائینگے۔

استاد اور شاگرد کی باہمی معاشرت

طالب العلم کا فرض ہے کہ وہ اُستاد کی عزت ہر ممکن طریقہ سے کرے، اُس کے آگے آگے نہ چلے، اُس کی جگہ یا اُس کے بہت قریب نہ بیٹھے۔ اُس کی اجازت کے بغیر کلام میں ابتدا نہ کرے، اُس کے سامنے بہت نہ بولے، اگر وہ تھکا ہوا ہو تو اس سے بات نہ پوچھے، اس کا دروازہ نہ کھٹکھٹائے۔ اُس کی اطاعت کرے، اس کے سامنے ہاتھ یا آنکھ سے اشارہ نہ کرے، اصرار کے ساتھ اُس سے کوئی سوال نہ کرے، اُس کا دامن نہ پکڑے، وغیرہ وغیرہ۔

اس تعظیم کے سلسلے میں یہ بھی داخل ہے کہ استاد کی اولاد کی بھی عزت کرے۔ ایک بار بخارا کے ایک عالم درس دے رہے تھے اور حالت درس میں کبھی کبھی کھڑے ہو جاتے تھے لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو بولے کہ میرے اُستاد کا لڑکا گلی میں کھیل رہا ہے۔ اس لئے جب میں اُس کو دیکھتا ہوں تو کھڑا ہو جاتا ہوں۔

امام فخر الدین ارسابندی مرو کے بہت بڑے امام تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں اپنے اُستاد کا کھانا پکایا کرتا تھا اور خود اس میں سے نہیں کھاتا تھا۔

ایک بار امام شمس الدین حلوائی ایک حادثہ کی وجہ سے ایک گاؤں میں ٹھیر گئے اُن کے تمام شاگرد اُن کی ملاقات کو آئے، لیکن قاضی ابو بکر زرنجی نے یہ سعادت نہیں حاصل کی، ایک بار اُن سے ملاقات ہوئی تو اس کی وجہ پوچھی بولے کہ میں والدہ کی خدمتگزاری میں مصروف تھا۔ فرمایا کہ تمھاری عمر دراز ہو گی لیکن تمھاری درس و تدریس کی گرم بازاری نہ ہو گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

---

[1] جامع بیان العلم صفحہ ۱۰۷۔

تعظیم اُستاد کے سلسلہ میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی علم کو خود انتخاب نہ کرے، بلکہ اُس کو اُستاد کے حوالے کر دے۔ وہ اپنے تجارب کی بنا پر طالب العلم کے رجحان طبیعت کے مطابق کسی علم کا انتخاب کر دے گا۔ شیخ الاسلام برھان الحق والدین فرماتے ہیں کہ قدیم زمانے میں طلبا اپنے تعلیمی امور کو اُستاد کے حوالے کر دیتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے لیکن اب طلبا خود مختار ہو گئے ہیں، اس لئے ناکامیاب رہتے ہیں۔

امام بخاریؒ نے امام محمد بن حسنؒ کے یہاں کتاب الصلوٰۃ شروع کی، لیکن انھوں نے علم حدیث کو اُن کی طبیعت کے لئے موزوں پایا اور کہا کہ تم جا کر علم حدیث پڑھو، چنانچہ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ آج سب کو معلوم ہے۔ ؎۱

تعظیم علم اسی سلسلہ میں علم کی تعظیم بھی داخل ہے اور درحقیقت اس سے بھی بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ انسان جس چیز سے عزت حاصل کرتا ہے خود اُس کی عزت نہ کرے۔ اگرچہ علم کی حقیقی عزت تو یہ ہے کہ اُس کو دنیوی اغراض سے آلودہ نہ کیا جائے۔ لیکن ایک طالب العلم ظاہری طور پر اُس کی عزت اس طرح کر سکتا ہے کہ کتاب کو بغیر طہارت کے نہ چھوئے، امام شمس الدین حلوائیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بغیر پاکی کے کبھی کاغذ کو ہاتھ نہ لگایا۔ شمس الائمہ سرخسی کو اسہال کی شکایت تھی اور اسی حالت میں وہ سبق کی تکرار بھی کرتے تھے، چنانچہ اس غرض سے انھوں نے ایک رات کو سترہ بار وضو کیا کیونکہ وہ بغیر طہارت کے تکرار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

علم کی ظاہری تعظیم کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تفسیر کی کتاب کو تمام کتابوں کے اوپر رکھے اور خود کتاب کے اوپر کوئی چیز نہ رکھے۔ ایک فقیہ نے کتاب کے اوپر دوات رکھ دی، تو اُن کے اُستاد نے کہا کہ تم کو علم کا پھل حاصل نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اگر کتاب کے نقل کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اُس کو خوش خط لکھے۔ اس کی تقطیع مناسب

؎۱ - تعلیم المتعلم از صفحہ ۲۳ تا ۲۸

اختیار کرے، درس کے وقت مسائل کو ادب و وقار کے ساتھ سُنے۔

شفقت استاد طالب العلم کے ساتھ استاد کو حسن لطف و محبت کے ساتھ پیش آنا چاہیئے اُس کی ترغیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہی چنانچہ ہرون عبدی اور شہر بن حوشب سے روایت ہی کہ جب ہم حضرت ابو سعید خدریؓ کے پاس آتے تھے (بغرض تحصیل علم) تو وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے موافق خوب آئے، آپ نے فرمایا تھا کہ تم کو فتوحات حاصل ہونگی اور تمھارے پاس ایک قوم یا کم سن بچے طلب علم کے لئے آئیں گے اور تم سے تعلیم حاصل کرینگے، اس لئے جب وہ تمھارے پاس آئیں تو اُن کو علم سکھاؤ، اُن کے ساتھ لطف و محبت سے پیش آؤ، اُن کو بیٹھنے کی جگہ دو، اور اُن کو حدیث سمجھاؤ۔ [لے]

حضرت حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک بار حضرت ابو ہریرہؓ کی عیادت کو گئے جب آدمیوں سے اُن کا گھر بھر گیا تو انھوں نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور فرمایا کہ ایک دن ہم لوگ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ لیٹے ہوئے تھے ہم لوگوں کو دیکھا تو اسی طرح پاؤں سمیٹ لئے اور فرمایا کہ میری بعد تمھارے پاس لوگ تحصیل علم کے لئے آئینگے ان کو مرحبا کہنا، تحیت دینا اور علم سکھانا۔ [ع]

اساتذہ کو طلباء کے ساتھ جس طرح پیش آنا چاہیئے اس کے لئے اگرچہ یہ حدیثیں کافی ہیں تاہم علماء نے اساتذہ و طلباء کی حُسنِ معاشرت کے متعلق اور بھی زیادہ تفصیلات کی ہیں۔ امام غزالیؒ نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہی اس کا خلاصہ یہ ہی کہ

(۱) اُستاد کو چاہیئے کہ طالب العلم کو بیٹے کے برابر سمجھے، اور جس طرح ایک باپ کے بیٹوں میں اُلفت و محبت، تعاون و تعاضد ہوتا ہی اُسی طرح ایک اُستاد کے شاگردوں میں بھی ہونا چاہیئے۔

(۲)۔ طالب العلم پر احسان نہ جتائے۔ اگرچہ لازمی طور پر اس کا احسان ہو جائیگا۔ اور جو اساتذہ طلباء سے اعانت و امداد کے متوقع ہوتے ہیں، اُن کو غلام بنائے رکھتے ہیں۔ اور

[لے]۔ جامع بیان العلم صفحہ ۷۶۔ [ع]۔ سنن ابن ماجہ باب الوصاۃ بطلبۃ العلم۔

اُن سے کام لیتے ہیں، اُن کو تو یہ کہنے کا حق ہی حاصل نہیں کہ وہ درس وتدریس کی خدمت محض اشاعت علم اور تقرب الٰہی کے لئے انجام دیتے ہیں۔

(۳)۔ استاد کو ہمیشہ طالب العلم کا خیر خواہ رہنا چاہیئے، اور جو علوم مضر ہوں اُن سے روکنا چاہیئے۔

علماء وفضلاء کے حالات پڑھنے سے اساتذہ کے لطف ومحبت کی بکثرت مثالیں مل سکتی ہیں جن میں ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ صدر اجل برہان الائمہ نے اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم کا وقت دوپہر کے بعد تمام طلباء کے اسباق کے بعد رکھا تھا۔ اُن دونوں نے شکایت کی کہ اس وقت ہم بالکل تھک جاتے ہیں، اور ہماری طبیعت افسردہ ہو جاتی ہے، لیکن اُنھوں نے کہا کہ جو طلباء میرے پاس دور دراز ملکوں سے آتے ہیں میرے لئے ان کے اسباق کا مقدم رکھنا ضروری ہے۔ [۱]

ایک بار حضرت سعید بن المسیب نے حضرت سعید بن مالک سے کہا کہ میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، لیکن آپ سے خوف معلوم ہوتا ہے، فرمایا اے بھتیجے اگر تم کو یہ معلوم ہو کہ مجھے کسی چیز کا علم ہے تو اُس کو ضرور پوچھ لیا کرو۔ [۲]

انتخاب علم اخلاقی حیثیت کے علاوہ طلباء کو استاد کے لطف ومحبت اور خیر خواہی کے بغیر حقیقی علمی فوائد بھی نہیں حاصل ہو سکتے مثلاً علوم وفنون کی سیکڑوں قسمیں ہیں، جن میں سے طالب العلم کو صرف وہ علوم انتخاب کرنے چاہییں جو دین، و دنیا میں اُس کے کام آئیں اور ان علوم میں سب سے مقدم علم توحید اور وہ علوم ہیں جو عہد نبوت اور عہد صحابہ میں پیدا ہوئے، یعنی حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ۔

علوم کی مختلف انواع واصناف کی طرح انسانی طبائع کی بھی مختلف قسمیں ہیں، بعض لوگوں کو صرف فقہ سے مناسبت ہوتی ہے، بعض لوگوں کو علوم عربیت سے لگاؤ ہوتا ہے۔ اور بعض

۱۔ تعلیم المتعلم صفحہ ۵۲ ۔ ۲۔ جامع بیان العلم صفحہ ۵۷۔

لوگ حدیث کے شیدائی ہوتے ہیں، لیکن خود ہر طالب العلم میں انتخاب کا مادہ نہیں ہوتا اس لیے
اُستاد کا فرض ہے کہ وہ علوم وفنون کے ساتھ طبائع انسانی کا بھی ماہر ہو، اور ہر طالب العلم کے
لئے وہی علم انتخاب کرے جو اس کے لئے موزوں ہو۔ اس موقع پر طالب العلم کا فرض یہ ہے
کہ وہ استاد کی اطاعت کرے اور اُس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے۔[۱]

طالب العلموں کی دو قسمیں ہیں، اور ان دونوں کے تعلیمی فرائض جدا جدا ہیں، ایک
طالب العلم وہ ہے جس کی ذہانت استعداد اور مناسبت طبعی کو دیکھ کر اُستاد خود اُس کو تعلیم کی
دعوت دیتا ہے۔ اس حالت میں اگر استاد کی دعوت اور طالب العلم کے شوق میں توافق و
اتحاد قایم ہو گیا تو اُس کے بہترین نتائج نکلتے ہیں۔

دوسری قسم عام طالب العلموں کی ہے جو کسی غرض سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، اس حالت
میں اگر اس تعلیم کا محرک مذہب ہے، اور طالب العلم میں ذہانت پائی جاتی ہے تو اُستاد کا فرض ہے
کہ وہ اُس کو خوب جی لگا کر تعلیم دے، اور اُس سے علم کا کوئی نکتہ مخفی نہ رہنے دے، لیکن
اگر وہ غبی ہے تو اُس کو تھوڑا بہت پڑھا دے لیکن اُس کی تعلیم میں اپنی پوری طاقت صرف نہ
کرے۔ لیکن اگر یہ محرک مذہبی نہیں ہے تو استاد کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز
ہو تو اُس کی تعلیم میں بھی سرگرمی کا اظہار کرنا چاہیے، کیونکہ بالآخر اس قسم کا طالب العلم بھی مذہب
کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ سفیان ثوری کا قول ہے کہ ہم نے غیر اللہ کے لئے علم کو سیکھا، لیکن
اُس نے خدا کے سوا کسی دوسرے کا ہونے سے انکار کیا۔ لیکن اگر یہ محرک ناجائز ہے تو
استاد کا فرض ہے کہ اس کو تعلیم سے روک دے، اور اس ناجائز کام میں اُس کی اعانت
نہ کرے۔ حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے کہ سور کے آگے موتی نہ بکھیر دو۔[۲]

علوم کی حقیقت اور علوم کی ضرورت اختلاف زمانہ سے بدل سکتی ہے، مثلاً قدما
منطق اور فلسفہ کو حرام سمجھتے تھے، لیکن امام غزالیؒ نے بقدر ضرورت اُن کے جواز کا فتویٰ دیا۔

---

[۱] شرح تعلیم المتعلم صفحہ ۲۷ و تعلیم المتعلم صفحہ ۱۷ تا ۱۸ - [۲] ادب الدنیا والدین۔

آج بھی یہ ضرورتیں بدل گئی ہیں، اس لئے قدیم علوم وفنون میں سے بہت سے علوم غیر ضروری ہو گئے ہیں، اور بعض جدید علوم کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ سید بدر الدین حلبی نے اپنے رسالہ تعلیم وارشاد میں سب سے پہلے اسی مسئلہ پر بحث کی ہے اور ایک موقع پر لکھا ہے۔

مدارس کی تمام قسمیں صرف اُن علوم کی تعلیم کے لئے قائم کی گئی ہیں جو دین و دنیا میں لوگوں کے کام آئیں۔ اس لئے طالب العلم جب تک مدرسہ کی چاردیواری کے اندر ہے اُس کو غیر ضروری علوم کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے، البتہ مدرسہ کی ڈگری حاصل کرلینے کے بعد اگر بعض علوم کمالیہ میں دستگاہ حاصل کرنا چاہے، تو کوئی ہرج نہیں، لیکن جس طالب العلم نے ضروری اور غیر ضروری دونوں علوم کو حاصل کرنا چاہا تو خیال یہ ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی نہ حاصل کرسکے گا۔

تم کو اوپر وہ علوم معلوم ہو چکے ہیں جن کی اسلام کو ضرورت ہے۔ اور ان سے بعض مصالح شرعیہ متعلق ہیں، اور اجنبی اور مضر علوم سے بھی تم کو واقفیت حاصل ہو چکی ہے۔[۱]

اُن کے نزدیک قرآن وحدیث کے سوا تفسیر، فقہ، اور علم کلام تک کی حقیقت متاخرین نے بدل دی ہے، اور اس میں غیر ضروری اجزا شامل کردیئے ہیں، اس لئے ان غیر ضروری اجزا سے بھی احتیاط واحتراز کی ضرورت ہے۔

موجودہ زمانے میں ندوۃ العلماء نے بھی اسی اصول پر اپنا تعلیمی نصاب مرتب کیا ہے۔ اس لئے اس مرحلہ میں وہ ایک روشن خیال اُستاد کے لئے دلیل راہ ہو سکتا ہے۔

طلباء کے مخصوص اخلاق طلباء کے مخصوص اخلاق میں سب سے نمایاں چیز صبر واستقلال ہے۔ جب سے ایک خاص نصاب درس متعین ہو گیا ہے جب سے تعلیم کی ایک خاص مدت محدود کردی گئی

۱۔ الارشاد والتعلیم صفحہ ۱۲۷ و ۱۲۸۔

ہی۔ اور جب سے علم کو دنیوی اغراض کا آلہ بنا لیا گیا ہی ہمارے اسلاف کے مخصوص علمی اخلاق فنا ہو گئے ہیں۔ انگریزی خواں طلبہ تو مدرسہ میں داخل ہونے کے ساتھ ہی اُس مبارک دن کا انتظار کرنے لگتے ہیں جس میں اُن کو نصاب تعلیم کے بارگراں سے جلد سبکدوشی حاصل ہو لیکن عربی خواں طلبار کی نگاہ بھی ابتدا ہی سے صدرا، شمس بازغہ، اور قاضی مبارک کی لوح پیشانی پر لگی رہتی ہی۔ اور جب یہ کتابیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے شاہد مقصود کو پا لیا، لیکن قدمار کے نزدیک اس منزل کا اوّل و آخر نہ تھا۔ وہ جس دن سے اس راہ میں قدم رکھتے تھے برابر چلتے رہتے تھے، یہاں تک کہ قبر کی منزل میں پہونچکر اُن کے سفر کا خاتمہ ہوتا تھا۔ فیضی نے کس قدر سچ کہا ہی۔

رہروان را خستگی راہ نیست عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل است

حضرت ابن مبارک سے کہا گیا کہ آپ کب تک تعلیم حاصل کرتے رہینگے؟ فرمایا مرتے دم تک۔ امام سفیان بن عیینہ سے پوچھا گیا کہ علم کا سب سے زیادہ محتاج کون ہی؟ بولے وہ جو سب سے زیادہ عالم ہے۔ کیونکہ اُس کی غلطی سب سے زیادہ بری ہی۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے بھائی مہاجرین تجارت میں، اور ہمارے بھائی انصار کھیتی باڑی میں مصروف رہتے تھے، اور ابو ہریرہؓ ہمہ وقت رسول اللہ صلعم کے پاس رہتا تھا تا کہ اپنا پیٹ پالے اور ان باتوں کو سیکھے جن کو مہاجرین و انصار نہیں سیکھ سکتے تھے۔ علماء نے اس حدیث سے متعدد لطائف اخذ کئے ہیں جن میں ایک یہ ہی کہ علم کے لئے تھوڑی سی معاش پر علمار کی صحبت میں ہمیشہ رہنا چاہیے اور علم کے لئے دنیوی مشاغل کو چھوڑ دینا چاہیے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ جب تک آدمی فقر و فاقہ کا لطف نہ اٹھائے علم کو نہیں حاصل کر سکتا۔ امام ربیعہ طلب علم میں اس قدر محتاج ہو گئے تھے کہ گھر کی چھت کی لکڑیاں بیچ کر گزر اوقات کرتے تھے اور مدینہ کی مو ریوں پر جو گرے پڑے منقے اور کھجوریں پا جاتے تھے اُن کو اٹھا کر کھا لیتے تھے۔

امام ابو یوسف کا بیان ہے کہ ہمارے ساتھ بکثرت لوگوں نے تعلیم حاصل کی لیکن صرف اُنھی لوگوں کو فائدہ پہنچا جن کے دلوں پر دودھ نے پالش کر دی، کیونکہ جب ابوالعباس خلیفہ ہوا تو اُس نے اہل علم کی وجہ معاش کا نہایت کافی سامان کیا، اس لئے ہمارے اہل و عیال ہمارے لئے دودھ میں چپڑی روٹی پکاتے تھے اور جب ہم پڑھ کے آتے تھے تو اُس کو کھا لیتے تھے، لیکن جو لوگ حلوے اور دوسری غذاؤں کی فکر میں رہتے تھے وہ ان تمام فوائد کو کھو دیتے تھے جو ہم کو حاصل ہوتے تھے۔

عربی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے ماترک الاول للآخر یعنی قدماء نے متاخرین کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، لیکن ہمارے بلند ہمت علماء نے کہا ہے کہ علم اور علماء کے لئے اس سے زیادہ مضر کوئی قول نہیں، اگر علم میں قناعت ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ اس پر قناعت کرنے کا کس کو حق حاصل تھا، لیکن انھوں نے کہا:

ھل اتبعک علیٰ ان تعلمنی مما علمت رشدا - کیا میں تمھارا ساتھ اس شرط پر اختیار کروں کہ جو کچھ ہدایت کی باتیں تم کو معلوم ہیں وہ مجھے سکھا دو گے۔

قدماء کے اس ذوق علم نے جن اخلاق کی پابندی اُن کے لئے لازم کر دی تھی اس کی سرخی قاضی عبد البر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں یہ قایم کی ہے۔ "باب الحض علیٰ استدامۃ الطلب والصبر علی اللاواء والنصب" یعنی یہ باب ہمیشہ طلب علم پر اور اس راہ میں جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اُن کے اوپر صبر کرنے کی ترغیب میں ہے اور اسی باب کے نیچے یہ تمام اقوال درج کئے ہیں۔[۱]

اخیر میں جب درس و تدریس کا طریقہ جاری ہوا، اور ایک نصاب تعلیم کی پابندی کر لی گئی تو اگرچہ یہ اخلاق فنا ہو گئے تاہم اب تک چونکہ قدماء کی صدائے بازگشت آتی تھی اس لئے متاخرین نے بھی اُن کی پابندی کو ضروری سمجھا، اور اس کے مختلف طریقے بتائے مثلاً یہ کہ طالب العلم کو ابتدائے شب اور آخر شب میں سبق کی تکرار لازمی طور پر کرنی چاہئے۔

---

[۱] یہ تمام اقوال جامع بیان العلم صفحہ ۹۴، ۹۸، ۱۰۰ میں مذکور ہیں۔

اور اگر طلب علم میں کسل لاحق ہو تو اُس کے طبّی اسباب کی جستجو کرنی چاہیئے، اگر یہ کاہلی کثرت بلغم سے ہی تو تقلیل غذا کی عادت ڈالنی چاہیئے، خشک روٹی کھانی چاہیئے، مسواک کرنی چاہیئے۔ قے کرنی چاہیئے۔ [۱]

تورع وتوکل آج عام شکایت ہی کہ قدیم تعلیم یافتہ لوگوں میں خودداری، عزت نفس اور غیرت کا مادہ نہیں پایا جاتا، اور اس زمانے میں بعض مدارس عربیہ میں طلباء و علماء کی جو حالت ہی اُس سے اس کی تائید بھی ہوتی ہی، لیکن ہمارے اسلاف نے تورع و توکل کو طلباء کا مخصوص اخلاق قرار دیا ہی، اور اس طرح اُن کی خودداری اور غرت نفس کا خود بخود تحفظ ہو گیا ہے، اس وقت عربی مدارس کے طلباء کے کھانے پینے کا جو انتظام ہی وہ نہایت ذلّت انگیز ہی۔ لیکن ہمارے علماء نے طلباء کو جن جن چیزوں سے احتراز کرنے کی ہدایت کی ہے، اُن میں ایک یہ ہی کہ جہاں تک ممکن ہو طالب العلم کو بازار کا کھانا نہیں کھانا چاہیئے کیونکہ بازار کا کھانا تقریباً نجس ہوتا ہی، اور فقراء کی نگاہیں اُس پر پڑتی ہیں، اس لئے اُس کی برکت جاتی رہتی ہی۔ شیخ محمد بن فضل اپنے زمانہ تعلیم میں بازار کا کھانا نہیں کھاتے تھے، بلکہ اُن کے باپ جو ایک گاؤں میں رہتے تھے، ہر جمعہ کو اُن کے کھانے پینے کا سامان لے کر آتے تھے اور اُن کے حوالے کر جاتے تھے، ایک دن اُنھوں نے دیکھا کہ اُن کے کمرے میں بازار کی روٹی رکھی ہوئی ہی، سخت برہم ہوئے تو انھوں نے عذر کیا کہ میں نے نہیں خریدی ہی بلکہ میرا ساتھی اُس کو لایا ہی، بولے اگر تم احتیاط کرتے تو تمھارے ساتھی کو اس کی جرأت نہ ہوتی۔ [۲] لیکن آج یہ حالت ہی کہ جامع ازہر کے طلباء عموماً بازاروں میں کھاتے ہیں۔ طلبار کی جاگیر کا ایک طریقہ یہ بھی ہی کہ نان بائیوں کے یہاں اُن کی روٹیاں مقرر کر دی جاتی ہیں۔ اور گھروں پر بھی جن طلباء کی جاگیریں ہوتی ہیں وہ بھی ذلّت دنائت سے خالی نہیں ہوتیں، اگر یہ لوگ توکل و تورع اختیار کرتے تو آج یہ حالت نہ پیدا ہوتی۔

---

[۱] تعلیم المتعلم طریق التعلیم از صفحہ ۲۹ تا ۴۰۔ [۲] شرح تعلیم المتعلم صفحہ ۵۶

تواضع جب سے علم دنیوی جاہ و اعزاز کا ذریعہ ہوا اور جب سے مناظرہ ومجادلہ نے مسابقت کا میدان کھول دیا، علماء وطلباء میں عجب وغرور کا مادہ پیدا ہوگیا، اور آج تو جو لوگ منطق و فلسفہ کے ماہر ہو جاتے ہیں، اُن کے ادعا کی کوئی حد باقی نہیں رہ جاتی لیکن درحقیقت جو اخلاق اہل علم کا زیور ہیں اُن میں ایک تواضع وخاکساری بھی ہے۔ اس لئے ہمارے علماء کا قول ہے کہ جو طالب العلم جس قدر متواضع ہوتا ہے اس کا علم بھی اُسی قدر زیادہ ہوتا ہے، جس طرح نشیب زمین کہ اُس میں اور مقامات سے زیادہ پانی جمع ہو جاتا ہے۔

اسی تواضع کی بناء پر ابو عمر کا قول ہے کہ اگر ایک عالم کسی فن کو اچھی طرح نہیں جانتا تو اُس کو اُس کا دعوے نہیں کرنا چاہئے۔ صرف اضطرار اور مجبوری کی حالت میں ایسا کیا جاسکتا ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دعوے کیا۔

اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم[ے] مجھ کو ملک کے خزانوں کا محافظ بنا دے میں محافظ ہونے کے ساتھ عالم بھی ہوں

کیونکہ جس وقت اُنھوں نے یہ دعوی کیا تھا کوئی دوسرا شخص ایسا موجود نہ تھا جو اُن کے حالات سے واقف ہوتا، حالانکہ اُن کو یہ نظر آتا تھا کہ اس وقت اُن کے سوا کوئی دوسرا شخص اس عہدے کا مستحق نہیں ہے۔

طریقۂ درس و تدریس اس قدر مسلم ہے کہ بچوں کی تعلیم بچپن ہی سے شروع ہو جانی چاہئے اور خود عہد نبوت ہی سے یہ طریقہ جاری ہو گیا تھا، چنانچہ جو اسیرانِ جنگ ناداری کی وجہ سے زر فدیہ ادا نہیں کرسکتے تھے، رسول اللہ صلعم نے اُن کا فدیہ یہ قرار دیا تھا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلعم نے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ یہ وقت علم کے اُٹھ جانے کا ہے، یہ سُن کر ایک صحابی نے کہا کہ کیا علم بھی اُٹھ سکتا ہے؟ حالانکہ

ے۔ جامع بیان العلم صفحہ ۷۵۔

ہم میں کتاب اللہ موجود ہے، اور ہم نے اپنے بچوں اور عورتوں کو اُس کی تعلیم دے دی ہے[۱]

قاضی عبدالبر نے جامع بیان العلم میں ایک مستقل باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے "باب فی فضل التعلم فی الصغر والحض علیہ" اور اس کے تحت میں متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد صحابہ اور عہد تابعین میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا اور اُن کو اس کی ترغیب دی جاتی تھی[۲]

یہ بھی مسلم ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ قرآن پاک سے شروع ہونا چاہئے، لیکن قرآنِ پاک کا طریقہ تعلیم مختلف ملکوں میں مختلف رہا ہے چنانچہ اہل مغرب بچوں کو ابتدا میں صرف قرآنِ پاک کی تعلیم دیتے تھے اور اُس کے ساتھ کسی دوسرے علم مثلاً حدیث، فقہ اور شعر وغیرہ کو مخلوط نہیں کرتے تھے، بربر لوگ بھی انھی کے مقلد تھے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اور لوگوں سے زیادہ قرآن مجید کے حافظ ہوتے تھے۔

اہل اندلس کا طریقہ یہ تھا کہ قرآنِ پاک کے ساتھ شعر، انشا پردازی، قواعد عربیت اور تجوید خط کی بھی تعلیم دیتے تھے۔ اور تجوید خط کا سب سے زیادہ لحاظ رکھتے تھے، اور نہیں تک پہونچ کر اُن کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا۔

اہل افریقہ بھی اگرچہ قرآن پاک کی تعلیم کے ساتھ حدیث اور بعض دوسرے علوم کی تعلیم کو ملا لیتے تھے، لیکن قرآن مجید اور اُس کے وجوہ قرأت کے ساتھ اُن کو سب سے زیادہ اعتناء تھا، اور تجوید خط ایک ضمنی چیز تھی، اُنھوں نے یہ طریقہ تعلیم اہلِ اندلس سے سیکھا تھا، اس لئے یہ اہل اندلس کے طریقہ تعلیم سے زیادہ مشابہ تھا۔

اہل مشرق بھی قرانِ مجید کے ساتھ اور علوم کی تعلیم دیتے تھے، لیکن تجوید خط کے ساتھ ان کو خاص اعتناء تھا، اور اس کے الگ قواعد مقرر تھے، الگ معلّم تھے۔ مستقل طور پر اور صنعتوں کی طرح اس کی تعلیم دیتے تھے، اور مکاتب کی تعلیم سے فارغ ہونے کے

۱۔ جامع بیان العلم ۲۔ ،، صفحہ ۸۰

بعد اس کی تکمیل کی جاتی تھی۔

اس اختلاف طریقۂ تعلیم کے نتائج بھی مختلف تھے، مثلاً اہل مغرب اور اہلِ افریقیہ نے چونکہ اپنی تمام تر توجہ قرآن پاک کی طرف مبذول کردی تھی، اس لئے اُن میں کسی علم کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا تھا، کیونکہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہی کہ اُس کے اسلوب بیان کا تتبع انسانی قدرت سے باہر ہی۔ اس لئے اُن میں اس کی تعلیم سے عربیت کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا تھا، البتہ اہلِ افریقیہ نے چونکہ اس کے ساتھ اور علوم بھی ملائے تھے اس لئے اُن میں انشاپردازی کا کسی قدر ملکہ پیدا ہوگیا تھا، لیکن اہل اندلس نے چونکہ تعلیم قرآن کے ساتھ شعر، انشاپردازی اور عربیت کی تعلیم کو بھی ملا لیا تھا، اس لئے اُن میں ادب ولٹریچر کا نہایت عمدہ ملکہ پیدا ہوگیا تھا، البتہ ان علوم کی شدت اعتنار کی وجہ سے اور علوم میں اُن کا پایہ نہایت پست تھا۔

کم وبیش یہی طریقۂ تعلیم تمام ممالک اسلامیہ میں جاری تھا، اور آج بھی جاری ہے، لیکن قاضی ابوبکر بن عربی نے اس کی مخالفت کی ہی، اور لکھا ہی کہ بچوں کو تمام علوم سے پہلے شعر اور عربیت کی تعلیم دینی چاہیئے، اس کے بعد حساب، اور حساب کی مشق کے بعد قرآن پاک پڑھانا چاہیئے۔ پھر حسب ترتیب، عقائد، اصول فقہ، جدل اور حدیث کی تعلیم دینی چاہئے اور ایک ساتھ دو علم کی تعلیم دینا بجز اس صورت کے کہ طالب العلم نہایت مستعد وذکی ہو، کسی حالت میں جائز نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کس قدر حماقت ہی کہ بچے کو خدا کی کتاب ایسی حالت میں پڑھائی جاتی ہی کہ وہ اس کو مطلق سمجھ نہیں سکتا۔ علامہ ابن خلدون نے بھی اس طریقہ کو پسند کیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ معذرت کی ہی کہ قرآن پاک کی تعلیم ابتداء میں اولاً تو تبرک وثواب کی غرض سے دی جاتی ہی، دوسرے باپ ماں کو یہ خوف لگا رہتا ہی کہ بچوں کی تعلیم میں بہت سے عوائق ومشکلات پیش آتے رہتے ہیں۔ وہ صرف بچپن ہی میں اپنے ماں باپ کا مطیع منقاد رہ سکتا ہی اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کم از کم بچہ قرآن پاک کی تعلیم سے

محروم نہ رہنے پائے اس لئے اسی سے بچہ کی تعلیم کا ابتدائی سلسلہ شروع کرتے ہیں، البتہ اگر یہ یقین ہو کہ بچہ ہمیشہ اپنے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھ سکیگا تو قاضی ابوبکر بن عربی نے جو طریقہ ایجاد کیا ہی وہ سب سے بہتر ہوگا۔ [1]

زمانہ طفلی کے بعد شباب آتا ہی، اور یہ تحصیل علم کا بہترین زمانہ خیال کیا جاتا ہی۔ [2] اور در حقیقت اسی زمانے سے استاد اور شاگرد کے اصلی فرائض شروع ہوتے ہیں، اور ان فرائض کے متعلق قدماء کی نصیحتیں حسب ذیل ہیں:

ابن شہاب فرماتے ہیں، علم کا مقابلہ نہ کرو، علم ایک میدان ہی، جس میدان کا سفر شروع کروگے تھک کر بیٹھ جاؤگے، اُس کو آہستہ آہستہ حاصل کرو، اور ایک ساتھ کُل کو نہ حاصل کرو، جس نے اُس کے کُل کو حاصل کرنا چاہا، اُس کے ہاتھ سے کُل گیا ایک کے بعد ایک آہستہ آہستہ۔ امام زہری حدیث بیان کرتے کرتے کہتے تھے، اب اشعار پڑھو، باتیں کرو، کیونکہ کان سننے سے انکار کرتے ہیں اور نفس چٹخارا چاہتا ہی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہی کہ دلوں کے لئے دلچسپ باتیں تلاش کرو، کیونکہ وہ بھی بدن کی طرح تھک جاتا ہی۔ امام قاسم بن محمد سے جب بہ کثرت سوال کئے جاتے تھے تو کہتے تھے کہ واقعات عرب اور لوگوں کی عام باتیں بھی کرنی چاہئیں، مجھ سے زیادہ سوال نہ کرو۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نکلے تو کہا کہ مجھے تمھارے اجتماع کی خبر تھی، لیکن میں خود گھر سے اس لئے نہیں نکلا کہ تمھیں ملول نہ کردوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی غرض سے ہم کو ناغہ دے دے کر نصیحت فرماتے تھے۔ [3]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ہفتہ میں ایک دن درس ادب کے لئے مخصوص کردیا تھا اور اُس کو وہ تحمیض (چٹنی چٹانا) فرماتے تھے۔

ان تمام اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ علوم وفنون کی تحصیل میں ایک خاص ترتیب اور

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۶۱۶ تا ۶۱۹ - [2] تعلیم المتعلم صفحہ ۵۱ [3] - جامع بیان العلم صفحہ ۵۲ و ۵۳ -

خاص مقدار کا لحاظ رکھنا چاہیے جو طلباء کی استعداد، قابلیت، صحت، طاقت اور نشاط کے لئے موزوں ہو، چنانچہ متاخرین نے اسی بناء پر چند تعلیمی اصول مقرر کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) سب سے پہلی طالب العلم کا فرض یہ ہے کہ وہ صرف اُن علوم کی تعلیم حاصل کرے جس کے ساتھ اُس کو طبعی مناسبت ہو اور جو علم اُس کی طبیعت اور استعداد کے لئے موزوں نہ ہو اُسکو ہاتھ نہ لگائے اس موقع پر استاد کا بھی یہ فرض ہے کہ اگر کسی طالب العلم کو کسی علم سے مناسبت نہ ہو تو اسکو فوراً اُسکی تعلیم سے روک دے ابو سعید سیرافی کا بیان ہے کہ میں نے خلیل بن احمد سے تین دن تک عروض سیکھا لیکن کچھ نہ آیا، چوتھے دن خلیل نے خود مجھ کو حلقۂ درس میں مخاطب کر کے کہا کہ تم اس شعر کی تقطیع کر سکتے ہو۔

اذا لم تستطع شیئاً فدعہ ۔۔۔ وجاوزہ الیٰ ما تستطیع

تم جس چیز کو کر نہیں سکتے اس کو چھوڑ کر اُس چیز کو کرو جس کو کر سکتے ہو

میں فوراً اُن کا مطلب سمجھ گیا، اور دوبارہ اس علم کی طرف توجہ نہیں کی، لیکن آج کسی مدرسے میں اس اصول پر عمل نہیں کیا جاتا، ایک طالب العلم ایک مدرسہ میں اپنی عمر صرف کر دیتا ہے اور اُس کو کچھ نہیں آتا، بااین ہمہ اُس کی طلب و تحصیل جاری رہتی ہے، نہ وہ خود باز آتا نہ کوئی شخص اُس کو باز رکھتا منتظمین مدارس اکثر طلباء کے متعلق عدم قابلیت یا عدم مناسبت کا علم رکھتے ہیں، لیکن اس پر روک ٹوک کرنا اشاعتِ علم بلکہ مذہب کے خلاف سمجھتے ہیں، مفتی محمد عبدہ نے طلبائے ازہر کے متعلق یہ تجویز پیش کی تھی کہ طلباء کے متعلق ایک مدت معین کر دی جائے۔ اگر اس مدت میں اُن کو استعداد علمی حاصل نہ ہو تو اُن کا نام کاٹ دیا جائے، لیکن یہ تجویز ناکامیاب رہی اور مخالفین نے اس کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ واقفین کی شرط کے خلاف ہے۔ [۱]

(۲)۔ تعلیم کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کوئی طالب العلم ایک ساتھ دو یا دو سے زیادہ علوم کی تعلیم حاصل نہ کرے، بلکہ ہر علم کو علیحدہ علیحدہ سیکھے، اور جب اُس میں کافی مہارت حاصل ہو جائے تو دوسرے علم کی طرف توجہ کرے، کیونکہ ایک ساتھ متعدد علوم و فنون کی تعلیم میں اُس کی دماغی قوتیں تقسیم ہو جاتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے طور پر کسی علم میں مہارت حاصل نہیں ہوتی۔

---

[۱] - الارشاد والتعلیم صفحہ ۲۳ تا ۲۴ -

تعلیم کا یہی بہترین طریقہ تھا جو آج بالکل متروک ہو گیا ہے، چنانچہ مذہبی مدارس کے طلباء ایک ساتھ تین تین علوم کی تحصیل کرتے ہیں، اور سرکاری مدرسوں میں تو ایک ساتھ سات سات علم پڑھائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان طلباء کی صحت عموماً خراب ہو جاتی ہے، اور کسی علم میں کافی مہارت نہیں حاصل ہوتی، لیکن بااین ہمہ اگر ایک طالب العلم اسی غیر مستحسن طریقہ پر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُس کو کم از کم علوم کی ترتیب اور اُن کے مقاصد کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے۔ مثلاً علوم کی دو قسمیں ہیں، آلی اور غیر آلی۔ آلی اُن علوم کو کہتے ہیں جو خود مقصود بالذات نہ ہوں بلکہ دوسرے علوم کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، جیسے صرف، نحو، منطق کہ علوم عربیت اور فلسفہ کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، اور غیر آلی علوم خود مقصود بالذات ہوتے ہیں، جیسے فلسفہ، کلام، اور ادب وغیرہ، اس لئے طالب العلم کو سب سے پہلے آلی علوم کی تحصیل کرنی چاہیے۔ لیکن ان میں صرف اتنا ہی وقت اور دماغ صرف کرنا چاہیے، جتنا غیر آلی علوم کی ضرورت ہے، خود ان علوم کو مقصود بالذات بنا لینا گویا ایک حقیقت کو دوسری حقیقت سے بدل دینا ہے۔

(۳)۔ پھر ان علوم کی تعلیم کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ طلباء کو اوّل اوّل ہر فن کے چند ابتدائی اور معمولی قواعد بتائے جائیں، اور اُن کی عقل و ذہانت کے مطابق اجمالی طور پر اُن کی شرح کی جائے، اگر درجہ میں بکثرت لڑکے ہوں تو اُن میں اُن لڑکوں کی استعداد و ذہانت کا لحاظ رکھا جائے جو تمام طلباء سے کم درجہ کے ہوں، کیونکہ اگر اس حد سے تجاوز کیا گیا تو ان کم استعداد لڑکوں کو نقصان پہونچے گا، لیکن خود ان کی حالت و استعداد کے مطابق تعلیم دینے سے ذہین لڑکوں کا کوئی ضرر نہ ہوگا۔

ان قواعد کی تعلیم میں بہ کثرت مثالیں دینی چاہئیں، اور یہ بتانا چاہیے کہ یہ مثال کیونکر اس قاعدہ کے تحت میں داخل ہے، پھر خود طلباء سے ان قواعد کے متعلق سوال کرنا چاہیے اس تدریجی رفتار سے طالب العلم کو اُس فن کی معمولی استعداد حاصل ہو جائے تو اب

اس فن کو نئے سرے سے شروع کرانا چاہیئے، اور اجمال کو چھوڑ کر مسائل کی کافی تشریح کرنی چاہیئے اور اختلافات بھی بتانے چاہئیں، اور وجہ اختلاف، اور اُن کے دلائل کی بھی توضیح کرنی چاہیئے، اس کے ساتھ طالب العلم سے عملی مشق بھی کرانی چاہیئے۔ مثلاً اگر وہ علم نحو کی تعلیم حاصل کرتا ہی تو اُس سے زیر درس کتاب کی کوئی عبارت پڑھوانی چاہیئے، اور اعراب کی وجہ پوچھنی چاہیئے، اگر وہ غلطی کرے تو اُستاد کو اُس کی غلطی کی وجہ بیان کر دینی چاہیئے، اور اگر وہ صحیح عبارت پڑھے تو بعض موقعوں پر اُس کو صحیح تسلیم کر کے وجہ اعراب دریافت کرنا چاہیئے، اور بعض موقعوں پر اُس کی صحت سے انکار کر دینا چاہیئے، اور اُس میں شک پیدا کرنا چاہیئے، تاکہ اُس کو اپنے علم پر یقین حاصل ہو، اور وہ ترقی کر کے ایک ملکہ کلی بن جائے۔

اس دور کے بعد طالب العلم کو اُس فن کے تمام مسائل پر کافی عبور ہو جائے گا، اور اب اُس کے بعد تیسرا دور شروع ہو گا، جس میں اُس کو اُس فن کے تمام دقائق و نکات بتانے چاہیئیں اور خود اُس طالب العلم سے اُس فن کی تعلیم دلوانی چاہیئے، مثلاً وہ اُستاد کے سامنے کھڑا ہو کر کوئی عبارت پڑھے اور اپنے رفقاء کو اس کا مطلب سمجھائے، اس حالت میں اُستاد کو چاہیئے کہ اس کی اعانت کرے اور اس کو بھولی ہوئی باتیں بتایا جائے اور اس پر اعتراض نہ کرے، اُس کو ڈانٹ نہ بتائے بلکہ اگر وہ غلطی کرے تو اُس کو نہایت نرمی کے ساتھ صحیح راستہ پر چلائے۔ اگر اُس کے درجہ میں بہت سے طلباء ہوں تو سب سے یہ ترتیب یہ کام لے، اور جو طلباء اُن میں ذہین و فطین ہوں اُن کی تعریف کرے، جس سے اوروں کے دل میں مسابقت کا حوصلہ پیدا ہو گا۔ لیکن اس مدح و ستائش میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔ مثلاً یہ کہ فلاں فلاں سے بہتر ہی۔ اور فلاں سے اچھا نہیں ہی کیونکہ اس سے بعض کے دل میں رشک و رقابت، بعض کے دل میں غرور و تکبر، اور باہمی طعن و تشنیع کا مادہ پیدا ہو گا۔

تین بار کے اس دور و تکرار کے بعد اب طالب العلم کو اس فن کا کافی ملکہ حاصل ہو جائیگا اگرچہ بعض ذہین طالب العلم دو ہی مرتبہ کے اعادے میں ایک فن کی مہارت حاصل کر لیتے ہیں

لیکن عام طور پر طلباء کو تین ہی بار میں یہ ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ ۱ؔ

تعلیم و تعلّم کا یہ طریقہ آج متروک ہو گیا ہے لیکن قدماء کے یہاں عام طور پر رائج تھا۔ قاضی عبدالبر نے جامع بیان العلم میں لکھا ہے کہ قدماء میں بعض لوگ تین بار سے زیادہ کسی مسئلہ کو نہیں دُہراتے تھے اور اسی کو مستحب سمجھتے تھے کیونکہ خود رسول اللہ صلعم سے مروی ہے کہ جب آپ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ کر دیتے تھے تاکہ ہر شخص اُس کو سمجھ لے۔ ۲ؔ

اگرچہ بعض لوگوں کو اس سے تکلیف ہوتی ہے، چنانچہ ایک واعظ سے اُن کی لونڈی نے کہا کہ آپ کا وعظ تو خوب ہوتا ہے لیکن آپ ایک ہی بات کا بار بار اعادہ کرتے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں ایسا اس لئے کرتا ہوں کہ ہر شخص سمجھ لے، اُس نے کہا لیکن جو لوگ پہلے ہی بار میں سمجھ جاتے ہیں دوبارہ اُن کو تکلیف و ناگواری ہوتی ہے، تاہم ایسے آدمیوں کی تعداد کم ہوتی ہے، اور اُن کو اس سے کوئی علمی نقصان نہیں پہونچتا اس لئے کثرت کو قلت پر ترجیح دینی چاہئے۔

لیکن آج یہ حالت ہے کہ ابتداء ہی سے طلباء کو مسائل متعلقہ بتائے جاتے ہیں، اور ان کو اُن کے حل کرنے کی تکلیف مالا یطاق دی جاتی ہے، مثلاً مصر میں یہ دستور ہے کہ جب اُستاد چھوٹے چھوٹے بچوں سے کوئی کتاب شروع کراتا ہے، تو سب سے پہلے بسم اللہ کے دقائق و نکات پر ایک تقریر کرتا ہے، اور جب نحو کی سب سے پہلی کتاب کفراوی پڑھاتا ہے تو بسم اللہ کے اعراب کی تشریح کرتا ہے، یعنی اس میں حرف جار کا متعلق کیا ہے، اسم یا فعل؟ اس کو عام ہونا چاہئے یا خاص، ظرف مستقر کس کو کہتے ہیں، اور ظرف لغو کس کو؟ وغیرہ وغیرہ۔

ایک بار عباس پاشا والی مصر نے اپنے صاحبزادے ہامی پاشا کی تعلیم کے لئے ایک بزرگ کو مقرر کیا، انھوں نے اُس کو سب سے پہلے منطق کی تعلیم دینی چاہی۔ اور سلم المنورق کو شروع کرایا جس کو علمائے ازہر بہترین کتاب سمجھتے ہیں۔ لڑکا اُن کے سامنے آیا تو انھوں نے کتاب کا یہ شعر پڑھا۔

۱ؔ۔ الارشاد و التعلیم صفحہ ۲۲۸ تا ۲۳۲۔ ۲ؔ کتاب مذکورہ صفحہ ۳۳

الحمد للہ الذی قد اخرجا   نتائج الفکر لا رباب الحجا

اور اس کی تشریح اس طرح کی کہ اگر وہ حکم مشتق پر معلق ہو تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ مصدر اُس کی علت ہی، اس لئے گویا مصنف نے یہ کہا ہی کہ خدا کی حمد نتائج فکریہ کے اخراج پر کی جاتی ہی، الہامی پاشا نے یہ تقریر سُنی تو مسکرا کر گردن جھکالی، اور ان سے پڑھنا چھوڑ دیا۔ ؎

(۴)۔ اوپر گزر چکا ہی کہ طالب العلم کو ایک ساتھ دو یا دو سے زائد علوم کی تعلیم نہیں دینی چاہیئے، لیکن اس سے بھی بلند نقطۂ نظر یہ ہی کہ ایک طالب العلم کو صرف ایک ہی فن کی تعلیم دی جائے، اور اُس میں اُس کو کامل الفن بنایا جائے۔ اس طریقہ تعلیم کی زیادہ توضیح کے لئے امور ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱)، تعلیم تمام پیشوں کی طرح ایک پیشہ ہی، فرق صرف یہ ہی کہ اس پیشے کا تعلق دماغ سے ہوتا ہی، اور دوسرے پیشوں کا جسم سے۔

(۲)۔ تمام پیشوں کا مقصد ضروریات انسانی کا پورا کرنا ہی، اور جس پیشے سے جس قدر انسان کو فائدہ پہونچتا ہی اُسی قدر اُس کی وقعت ہوتی ہی۔

(۳)۔ جب ایک شخص کو کسی پیشے میں مہارت حاصل ہو جاتی ہی تو دوسرے پیشے میں اُس کو کمال نہیں حاصل ہوتا۔

ان مقدمات کی بنا پر انسان کو صرف ایک علم کی تعلیم حاصل کرنا چاہیئے، جو دنیا کے لئے سب سے زیادہ مفید ہو، لیکن تعلیم کی حالت اور پیشوں سے کسی قدر مختلف ہے، دنیا کے اور پیشے مستقل بالذات ہوتے ہیں یعنی ایک پیشہ دوسرے پیشے پر موقوف نہیں ہوتا، مثلاً لوہار کا پیشہ بڑھئی کے پیشہ سے بالکل مختلف ہی اور ان دونوں میں باہم کوئی ربط و علاقہ نہیں ہی۔ لیکن ایک علم دوسرے علم پر موقوف ہوتا ہی، ادب بغیر صرف ونحو کے نہیں آسکتا اور فلسفہ کی تعلیم بغیر

؎۔ التعلیم والارشاد صفحہ ۲۲۲ تا ۲۲۴۔

منطق کے نہیں حاصل کی جا سکتی، اس بناء پر انسان کو دوسرے علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے تاہم اس کو اپنی تمام قوت صرف ایک علم پر صرف کرنا چاہیے جو اس کی طبیعت کے مناسب ہو اور دنیا کو اس سے فائدہ پہونچے، بقیہ علوم کو صرف اسی قدر حاصل کرنا چاہیے، جتنا اس علم کے حاصل کرنے میں ان کی ضرورت ہو۔

اس طریقہ تعلیم کی رو سے اگر مختلف علوم مختلف طلباء پر تقسیم کر دیئے جائیں تو چند سال میں قومی خدمات کے لئے کامل الفن اشخاص کا ایک گروہ طیار ہو سکتا ہے، اور قوم تمام علوم و فنون کے برکات سے مالا مال ہو سکتی ہے۔ ۵۱

ہمارے اسلاف کو اسی خیال اور اسی طریقہ تعلیم نے امام، مجتہد، اور محقق بنایا تھا۔ چنانچہ خلیل ابن احمد کا قول ہے کہ اگر تم عالم بننا چاہتے ہو تو صرف ایک فن کی تعلیم حاصل کرو، اور اگر ادیب بننا پسند کرتے ہو تو ہر چیز کا بہترین حصہ لے لو، بعض علماء کہتے ہیں کہ جو شخص حافظ بننا چاہتا ہے اس کو ایک علم سیکھنا چاہیے، اور جو شخص عالم بننا چاہتا ہے اس کو ہر علم سے بہرہ اندوز ہونا چاہیے۔

ابو عبید قاسم فرماتے ہیں کہ مجھ سے متعدد علوم کے جاننے والے شخص نے مناظرہ کیا تو میں نے اس کو مغلوب کر لیا، لیکن یک فنی عالم نے مجھ سے مناظرہ کیا تو اپنے فن میں مجھ پر غالب آ گیا۔ ۵۲

کسی خاص فن کی تعلیم انھیں علماء سے حاصل کرنی چاہیے جو یک فنی ہوں، یعنی خصوصیت کے ساتھ اسی فن میں کمال اور اسی فن کا ذوق رکھتے ہوں، لیکن ان علماء کا اخلاقی فرض ہے یہ کہ وہ دوسرے علوم و فنون کی تحقیر نہ کریں۔ مثلاً جو لوگ فقہ کا درس دیتے ہیں وہ طلباء کے سامنے علم حدیث اور علم تفسیر کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو صرف نقلی اور سماعی علوم ہیں، جو بوڑھی عورتوں کے لئے موزوں ہیں عقل و نظر کو ان میں دخل نہیں

۵۱۔ التعلیم والارشاد از صفحہ ۲۴۲ تا ۲۴۳ - ۵۲۔ جامع بیان العلم صفحہ ۶۵ - ۶۶

اسی طرح علم کلام کے اساتذہ فقہ سے نفرت دلاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ توحیض و نفاس کے مسائل کا مجموعہ ہے، خدا کی ذات وصفات کے مباحث سے اس کو کیا نسبت ہے؟ غرض ہر علم کے ماہر کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے علوم کی تحقیر کرتا ہے، لیکن اساتذہ کے لئے یہ سخت بداخلاقی اور مذموم فعل ہے۔ بلکہ اس کے بجائے اُن کو دوسرے علوم وفنون کی طرف طلبار کو رہنمائی کرنا چاہیئے۔[۵۱]

(۵)۔ اگر تعلیم سے علمی استعداد اور علمی ملکہ کا پیدا کرانا مقصود ہے تو اُس کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ درس کے اوقات میں بہت زیادہ بعد و انقطاع نہ ہونے پائے، مثلاً اگر کسی علم کی تعلیم ہفتہ میں صرف دو دن دی جائے تو اس سے تعلیمی سلسلہ میں ایک طویل انقطاع پیدا ہو جائے گا، اور ملکہ علمی نہ حاصل ہو سکے گا۔ کیونکہ کسی چیز کا ملکہ اُس کے تکرار و اعادہ سے حاصل ہوتا ہے، اس لئے اُس کے لئے تسلسل و مداومت ایک لازمی چیز ہے۔

آج جدید مدارس میں جو نظام تعلیم قائم ہے اُس کی رو سے طلباء کو بعض علوم کی تعلیم صرف ہفتہ میں ایک دن دی جاتی ہے، اور تعطیلوں کی کثرت سے تو یہ سلسلہ ہفتوں بلکہ مہینوں کے لئے منقطع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو کسی فن کی مہارت حاصل نہیں ہوتی، قدیم عربی مدارس کی حالت اگرچہ اس معاملہ میں جدید مدارس سے ہزار درجہ بہتر ہے، وہاں جو کتاب شروع کرائی جاتی ہے، اول سے آخر تک روزانہ پڑھائی جاتی ہے تعطیلیں بھی بہت کم ہوتی ہیں لیکن اُن میں یہ تعلیمی سلسلہ کا انقطاع ایک دوسری مخفی وجہ سے ہو جاتا ہے، یعنی وہاں ایک کتاب شروع ہوتی ہے تو کئی سال میں ختم ہوتی ہے، اس لئے طالب العلم کو یہ یاد بھی نہیں رہتا کہ اس کتاب کے اول میں اُس نے کیا پڑھا تھا۔[۵۲]

(۶)۔ اسباق کی مقدار میں اُستاد کو ایک خاص ترتیب کا لحاظ رکھنا چاہیئے، مبتدی کو پہلے دن صرف اسی قدر سبق پڑھانا چاہیئے کہ وہ دو مرتبہ میں اُس کو یاد کر سکے، اس کے بعد روزانہ

۵۱۔ احیاء العلوم جلد اول باب آداب المعلم والمتعلم۔ ۵۲۔ الارشاد والتعلیم از صفحہ ۲۳۵ تا ۲۳۶

ایک ایک فقرہ کا اضافہ کرنا چاہئے، یہاں تک کہ وہ اس طریقے کے خوگر ہو جانے سے بڑے سے بڑا سبق دو بار کے اعادہ و تکرار میں یاد کرلے گا۔

ابتداء میں صرف وہی کتاب پڑھانی چاہئے جو ایک مبتدی کی سمجھ میں آجائے۔ قدماء کا طریقہ یہ تھا کہ ابتداء میں چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھاتے تھے، اور اُن کتابوں میں مسائل ایسے ہوتے تھے جو عام طور پر پیش آتے رہتے ہیں۔

شاگرد کا بھی یہ فرض ہے کہ اُستاد جو کچھ پڑھائے اُس کو غور سے سُنے، اُس کو سمجھے، اُس کو یاد کرے، اور پھر اُس پر عمل کرے۔ ابن مبارک کا قول ہے کہ علم کی ترتیب یہ ہے۔ پہلے نیت کرنا پھر سننا، پھر سمجھنا، پھر یاد کرنا، پھر عمل کرنا، پھر اُس کی اشاعت کرنا۔ [۵۱]

قدیم زمانہ میں ایک نہایت مفید طریقہ جاری تھا کہ طلبا، جو کچھ پڑھتے تھے اُس کو یاد کر کے لکھ لیتے تھے اور اُس کو تعلیق کہتے تھے۔

آموختہ اور سبق کے یاد کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کل کا پڑھا ہوا سبق پانچ مرتبہ، پرسوں کا چار مرتبہ، ترسوں کا تین مرتبہ، اور اُس سے پہلے کا ایک مرتبہ روزانہ دُہرائے اور اس تکرار و اعادہ میں آواز نہ بہت پست ہو نہ بہت بلند بلکہ خیر الامور اوسطہا کا لحاظ رکھے حفظ و تنشیط ذہن کے لئے مناظرہ، مذاکرہ اور مطارحہ بھی ضروری چیزیں ہیں، لیکن اُن کے ذریعے جو بد اخلاقیاں مثلاً رشک و حسد، حیلہ جوئی و ملمع سازی اور ہٹ دھرمی وغیرہ پیدا ہو جاتی ہیں، اُن سے احتراز کرنا چاہئے۔ [۵۲]

طریقۂ تادیب اصول تعلیم کی ناواقفیت کی بنا پر اگرچہ آج ہمارے مکاتب و مدارس میں شیخ سعدیؒ کے اس مصرع پر عمل ہو رہا ہے۔ ع

جورِ استاد بہ ز مہر پدر

لیکن خود شیخ نے ایک شعر میں اس کی مخالفت کی ہے۔

---

[۵۱] جامع بیان العلم صفحہ ۵۹۔ [۵۲] تعلیم المتعلم از صفحہ ۴۰ تا ۴۹۔

نو آموز را ذکر و تحسین و زہ ز توبیخ و تہدید استاد بہ

اور اسلام میں تمام مصلحینِ تعلیم کے خیالات بھی یہی ہیں، امام غزالیؒ نے احیاء العلوم باب آداب المعلم والمتعلم میں لکھا ہے:

الوظیفة الرابعة وھی من دقائق صناعة التعلیم ان یزجر المتعلم عن سوء الاخلاق بطریق التعرض ما امکن ولا یصرح وبطریق الرحمة ولا بطریق التوبیخ فان التصریح یھتک حجاب الھیبة ویورث الجرأة علی الھجوم بالخلاف ویھیج الحرص علی الاصرار ولان التعریض یضا یمیل النفوس الفاضلة والاذھان الزکیة الی استنباط معانیه فیفید فرح التفطن بمعناه رغبة فی العمل به	چوتھا فرض جو پیشہ تعلیم کی باریکیوں میں ہے وہ یہ ہے کہ طالب العلم کو بد اخلاقی سے تعریضاً و اشارةً جہاں تک ممکن ہو روکا جائے، اور اس کی تصریح نہ کی جائے، اور نیز یہ طریقہ مہربانی پر مبنی ہو، توبیخ پر مبنی نہ ہو کیونکہ تصریح ہیبت کا پردہ چاک کر دیتی ہے اور مخالفت کی جرأت دلاتی ہے، اور اس بد اخلاقی پر اصرار کرنے کی حرص پیدا کرتی ہے، اس کے علاوہ تعریض نفوس فاضلہ اور اذہان طیبہ کو اپنے معانی کے استنباط کی طرف مائل کرتی ہے اس لئے اُس کے معنی کا سمجھنا اس پر عمل کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔

اور علامہ ابن خلدون نے ایک مضمون میں نہایت تفصیل کے ساتھ تعلیم میں جبر و تشدد کے نقصانات بتائے ہیں۔ چنانچہ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

> تعلیم میں سختی طلبار، بالخصوص چھوٹے بچوں کے لئے سخت مضر ہے جس طالب العلم کی تربیت کا دارومدار سختی پر ہوگا، اس کا انبساط و نشاط فنا ہو جائیگا اور یہ سختی اس میں کاہلی اور سستی پیدا کریگی اور سزا سے بچنے کے لئے اس کو کذب و خباثت یعنی نفاق اور مکر و فریب کی طرف مائل کرے گی اور یہ چیزیں اس کی ایک عادت بلکہ اُس کا خلق بن جائیں گی، اور انسانیت کی اجتماعی خصوصیات یعنی حمیت اور مدافعت فنا ہو جائیں گی، اور وہ

اس میں دوسروں کا محتاج ہو جائے گا۔

جس قوم نے اس قسم کے جبر و تشدد کے ساتھ زندگی بسر کی اُس میں یہ تمام بداخلاقیاں پیدا ہو گئیں۔ یہود کو دیکھو کہ اُن کی بداخلاقیاں یعنی ان کی خباثت اور اُن کی مکاری کس قدر ضرب المثل ہو گئی ہے، اس بنا پر طالب العلم کے متعلق معلّم کا اور بچے کے متعلق باپ کا فرض یہ ہے کہ ان کی تادیب میں جبر و استبداد کا طریقہ نہ اختیار کریں۔ محمد بن ابو زید نے معلّمین و متعلّمین کے احکام کے متعلق جو کتاب لکھی ہے اُس میں لکھا ہے کہ بچوں کے مودّب کو بوقت ضرورت تین کوڑے سے زیادہ کوڑے لگانا سزاوار نہیں۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ جس شخص کو شریعت نے ادب نہیں سکھایا خدا اُس کو ادب نہ سکھائے، اور اس قول کا مقصد یہ ہے کہ تادیب کی ذلت سے نفوس کی حفاظت کی جائے اور اُس کی جو مقدار شریعت نے مقرر کر دی ہے وہ کافی ہے، تعلیم کا بہترین طریقہ وہ ہے جس کی تلقین رشید نے اپنے بیٹے امین کے معلّم کو کی، اُس نے کہا کہ اے احمر! امیر المومنین نے اپنی روح اور اپنے دل کا پھل تیرے سپرد، اور تیرے ہاتھ کو اس پر دراز، اور تیری اطاعت کو اس پر واجب کر دیا ہے۔ اب امیر المومنین نے تیرا جو درجہ مقرر کیا ہے اُس پر قائم رہ، اُس کو قرآن پڑھا، اُس سے اشعار کی روایت کروا، اُس کو احادیث سکھا۔ اور ہنسنے کے اوقات کے علاوہ اس کو ہنسی سے روک، کوئی وقت ایسا نہ گزرنے پائے کہ تو اُس کو کوئی فائدہ نہ پہونچائے، لیکن اس کے ساتھ اس کو غمگین نہ کر کہ اُس کا ذہن مردہ ہو جائے، اور اس قدر نرمی بھی نہ اختیار کر کہ وہ عیش و فراغ کا خوگر ہو جائے، جہاں تک ممکن ہو تقرب و تلطف کے ساتھ

اس کی تربیت کرے لیکن اگر وہ ان سے متاثر نہ ہو تو سختی کر سکتا ہے۔ ۱؎

سفر اسلامی تعلیم و تربیت کا ایک لازمی جزو سفر ہے۔ آج بہت سے دنیوی مقاصد و اغراض کو پیش نظر رکھ کر علمی سفر کئے جاتے ہیں، لیکن قدیم زمانے میں ایک ایک حدیث کے لئے طویل سفر اختیار کئے جاتے تھے، حضرت جابر بن عبداللہؓ نے ایک حدیث کے لئے شام کا سفر کیا حضرت ابوایوب انصاریؓ ایک حدیث کے لئے مصر تک تشریف لے گئے، اور جب وہ حدیث سن لی تو فوراً مدینہ کو واپس آئے، مصر میں اپنے اونٹ کا کجاوہ تک نہیں کھولا۔

صحابہؓ کے بعد تابعین نے بھی یہ روش قائم رکھی، حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ میں نے ایک حدیث کے لئے کئی دن اور کئی رات کا سفر کیا ہے، بسر بن عبیداللہ الحضرمی کہتے ہیں کہ میں نے صرف ایک حدیث کے لئے شہروں کی خاک نوردی کی ہے۔ طلب حدیث کے لئے سفر ایک ایسی لازمی چیز ہو گئی تھی کہ اگر کوئی محدث کسی شخص کو بلا سفر کئے ہوئے کوئی حدیث بتا دیتا تھا تو اس پر اپنا احسان جتاتا تھا۔ ایک بار امام شعبی نے ایک شخص کو ایک حدیث بتائی تو ساتھ ساتھ یہ کہا کہ میں نے تم کو مفت میں یہ حدیث بتا دی، لوگ اس سے کم کے لئے مدینہ تک کا سفر گوارا کرتے تھے۔ ۲؎

اندلس اور مصر و شام اور بغداد اس زمانہ کے مغرب و مشرق تھے لیکن طلب علم نے اس زمانہ میں باوجود صعوبت سفر کے مشرق و مغرب کو ایک کر دیا تھا، چنانچہ علامہ مقری کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ انہی علماء کے حالات میں ہے جو اسپین سے مصر و شام و بغداد کو گئے یا ان مقامات سے چل کر اسپین میں داخل ہوئے۔ ۳؎

علامہ ابن خلدون نے علمی سفر کے متعلق ایک خاص عنوان قائم کیا ہے، اور اس کے تحت میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱؎۔ مقدمہ ابن خلدون از صفحہ ۶۱۹ تا ۶۲۰۔ ۲؎۔ جامع بیان العلم از صفحہ ۴۶ تا ۴۷

۳؎۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم صفحہ ۲۔

انسان علم، اخلاق، مذہب اور دوسرے فضائل کو کبھی تو تعلیم و تعلم کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے، اور کبھی نقل، تقلید اور میل جول سے، لیکن جو ملکہ میل جول سے حاصل ہوتا ہے وہ زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ اس لئے شیوخ کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اُسی قدر ملکہ مستحکم اور قوی ہوگا۔

طالب العلم پر تعلیمی اصطلاحات بھی مشتبہ ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض طالب العلم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ علم کا جزو ہیں، اور یہ شبہ علماء کے میل جول کے بغیر زائل نہیں ہوسکتا کیونکہ اساتذہ کے تعلیمی طریقے مختلف ہوتے ہیں، اس لئے متعدد مشائخ کے ملنے سے وہ ان طرق مختلفہ کو نفس علم سے الگ کرے گا اور سمجھنے لگے گا کہ یہ صرف تعلیمی طریقے ہیں، خود علم ان سے الگ چیز ہے۔ [۵]

التربیۃ الاستقلالیہ جدید طریقۂ تعلیم و تربیت کی اصلاح میں اگرچہ قدیم طریقۂ تعلیم و تربیت سے بھی بہت کچھ مدد لی جاسکتی ہے، تاہم آج کل تمام دنیا میں جو طریقے رائج ہیں، ان کی اصلاح کے لئے ایک مستقل تنقید کی ضرورت تھی اور اس کتاب کے ذریعہ سے اسی ضرورت کو پورا کیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کو مختلف قدرتی حصّوں میں تقسیم کرکے ہر حصہ کے مطابق تعلیم و تربیت کے فطری اصول بتائے گئے ہیں۔

اس بنا پر کتاب چار حصّوں میں منقسم ہوگئی ہے۔

پہلی کتاب۔ اس میں حالت حمل میں ماں کی نگہداشت، اور صغیر سن بچوں کی حفاظت اور تربیت کے اصول درج ہیں۔

دوسری کتاب۔ اس میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے اصول مذکور ہیں۔

---

[۵] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۴۲۰

تیسری کتاب۔ اس میں قریب البلوغ لڑکے کی تعلیم و تربیت کے قواعد بیان کئے گئے ہیں۔

چوتھی کتاب۔ اس میں نوجوان لڑکے کی تعلیم و تربیت کے اصول و نتائج سے بحث کی گئی ہی۔

یہ کتاب خطوط کا ایک مجموعہ ہی اس لئے بجائے ابواب و فصول کے تمام مباحث ان ہی خطوط میں درج ہیں۔ اور ہم نے ان ہی خطوط سے ان مباحث کو اخذ کرلیا ہی۔

پہلی کتاب

ماں کے متعلق

ساتواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر ارسم

تربیت اولاد کی اہمیت اور اس کا احساس

آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ خوش گوار زمانے میں ہماری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ خدا ہم کو ایک اولاد دے، اور اب اس تخیل سے میرا بدن کانپ کانپ اٹھتا ہے بایں ہمہ اس وقت حمل کے احساس کا جو نتیجہ ہے اُس کا چھپانا مناسب نہ ہوگا، اور وہ یہ ہے کہ چند دنوں کے رنج و ملال کے بعد میں نے محسوس کیا کہ عزت اور مسرت کی ایک شعاع میرے رنج و غم کی اس تاریکی میں چمک رہی ہے اور آپ کے یہاں سے واپس آنے کے بعد میں یکہ و تنہا نہیں ہوں بلکہ آپ کو کھو کر میں نے آپ کو دوبارہ پالیا ہے، میں نہایت فخر و غرور کے ساتھ محسوس کر رہی ہوں کہ میرے پہلو میں جو وجود مخفی ہے، وہ گویا آپ ہی کی ذات، آپ ہی کی زندہ مثال، آپ ہی کے گوشت کا ایک ٹکڑا، اور آپ ہی کے خون کا ایک قطرہ ہے، لیکن بایں ہمہ جس چیز سے میں گھبرا رہی ہوں وہ یہ ہے کہ اس بچہ کا طریقۂ تربیت کیا ہوگا؟ کیونکہ میں نے آپ کو اکثر ان فرائض

پر جو تربیت اولاد کے متعلق والدین پر عائد ہوتے ہیں، ایسے بلیغ اور ایسے پر اثر الفاظ میں گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے کہ میرا دل اس خوف سے کانپ اٹھتا ہے کہ اس تقریر کا موضوع بھی بچہ نہ رہا ہو. برحال آج ہماری یہ اُمید پوری ہو گئی ہے، اور میں اُس سے گھبرا رہی ہوں، اب ان فرائض کو جن سے آپ خوب واقف تھے کون ادا کرے گا؟ آپ مجھ سے کہتے تھے کہ اگر خدا مجھ کو اولاد دے گا تو اُس کی تعلیم و تربیت پر اپنی زندگی وقف کر دوں گا، اور اسی سلسلے میں بچوں کے موجودہ طریقۂ تربیت کی بھی سخت مخالفت کرتے تھے، آپ کی یہ تمام باتیں مجھ کو یاد ہیں، لیکن جس قدر مجھے آپ کے خیالات پسند ہیں، اُسی قدر اُس ذمہ داری سے کانپتی ہوں جس کا بوجھ تنہا میرے سر پر پڑنے والا ہے کیونکہ انسانی قانون نے ہمارے اور آپ کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل کر دی ہے کہ ایسے نازک وقت میں جب کہ مجھے آپ کی اخلاقی اعانت کی سخت ضرورت تھی میں آپ تک نہیں پہنچ سکتی خدا جانے اس لڑکے کا جو اپنے باپ کی نگرانی و حفاظت سے محروم ہے۔ بڑے ہونے پر کیا حال ہو گا؟ اور میں اُس کے لیے اس ضعف و علالت کے ساتھ کیا کر سکوں گی؟

دسواں خط

از ڈاکٹر ارسم بنام ہیلانہ

حالتِ حمل میں ماں کی طبی نگہداشت

جانِ من: مجھے تمہاری محبت پر اعتماد کامل ہے، لیکن میں تمہیں پاک سے پاک چیز کی قسم دلاتا ہوں کہ اب تم میرے پاس آمد و رفت کا سلسلہ بند کر دو، آج سے مہینہ دو مہینہ پیشتر جب کہ مجھے تمہارے حاملہ ہونے کا علم نہ تھا، غایت مسرت کے ساتھ میں تمہاری اس مخلصانہ ملاقات کو پسند کرتا تھا، لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں اور اب ہم دونوں اپنی کسی چیز کے مالک

نہیں ہیں یہاں تک کہ ہماری باہمی اُلفت و محبت بھی ہم سے رخصت ہو گئی ہے، اور جو چیز میاں اور بی بی کے درمیان عادۃً قرب و اتصال کا ذریعہ بنتی ہے وہی ہماری مفارقت کا سبب ہو گئی ہو، کیا اُس وجودِ ناقص کے لئے جس کو ابھی موجود کے لفظ سے تعبیر بھی نہیں کیا جا سکتا ہم کو ان حالات کا خیر مقدم نہیں کرنا چاہیئے؟ میں تم سے بحیثیت شوہر اور بحیثیت طبیب کے، اور اگر عجلت پسندی کا خوف نہ ہو تو بہ حیثیت باپ کے کہتا ہوں کہ اس وقت تم کو نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیئے، اور اپنے وطن کی سرزمین کو جو ہمیشہ فتنہ و فساد کے زلزلوں سے حرکت میں رہتی ہے خیرباد کہنا چاہیئے، انگلستان میں ایک ڈاکٹر میرا دوست ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہاں کی اقامت کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوگی اُن کے متعلق وہ تمھاری رہنمائی کرے گا، اور میں نے محنت و مشقت کے ساتھ تھوڑا بہت جو مال جمع کر لیا ہے وہ تمھاری ضروریات زندگی کے لئے کافی ہوگا۔ اس لئے اُس کے ذریعہ سے عیش و آرام کے تمام سامان جمع کر لو، اور جو کچھ بچ جائے اُس کو بچے کی تربیت کے لئے محفوظ رکھ کر جلد سے جلد سفر کی تیاری کر دو۔

بارھواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر ارسم

دیہاتی زندگی کا اثر زچہ و بچہ کی صحت پر

آپ کی ہدایت کے بموجب میں نے انگلستان پہنچنے کے دوسرے ہی دن آپ کے دوست ڈاکٹر وارنگٹن سے ملاقات کی اور اُن کو آپ کا خط دیا، وہ ابھی پورا خط بھی نہ پڑھ چکے تھے کہ اُن کو آپ کا نام یاد آ گیا، اور وہ فطری وقار کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوئے اونھوں نے مجھ سے فرنچ زبان میں جس میں وہ اچھی طرح گفتگو کر سکتے ہیں

اور کہا کہ تمھارے شوہر نے تم کو ایک اجنبی ملک میں بھیج کر اپنی اصابت رائے کا ثبوت دیا ہے انگلستان کے قیام میں اعتدالِ صحت کی وجہ سے تم کو راحت نصیب ہوگی، لیکن میں تم کو دیہات میں زندگی بسر کرنے کا خیر خواہانہ مشورہ دیتا ہوں کیونکہ وہاں کی ہوا صاف اور خوش گوار ہوتی ہے، اور حالت حمل میں بڑے بڑے شہروں کا قیام تمھارے اور نیز تمھارے بچے کے لئے موزوں نہ ہوگا، خود لندن کے بڑے بڑے تاجر دیہاتی زندگی کا فائدہ سمجھنے لگے ہیں، اس لئے وہ لندن کی تفریحی زندگی کے متعدد مواقع کو چھوڑ کر دن میں دو بار ریل کا سفر کرتے ہیں، تاکہ اپنے اہل و عیال کو دیہات کی سرسبزی، اور کھلی ہوئی دھوپ سے فائدہ اُٹھانے کا موقعہ بہم پہنچائیں، اگرچہ دیہات کی زندگی ہر شخص کے لئے مفید ہے، لیکن بچّوں کو اس سے خصوصیت کے ساتھ فائدہ پہنچتا ہے، صرف عیش پسند اور لہو و لعب کے ساتھ زندگی بسر کرنے والی عورتیں دیہات کے قیام کو ناپسند کرتی ہیں، لیکن اُن کے خوش رکھنے کی کیا تدبیر ہے؟ ماں کو بہ حیثیت ماں کے اپنے فرائض لازمی طور پر ادا کرنے ہوں گے۔

جو لڑکے بڑے بڑے شہروں میں زندگی بسر کرتے ہیں غور سے دیکھو تو اُن کا رنگ متغیر، اور جسم مریض نظر آئے گا، کیا تمھارا خیال ہے کہ اس جسمانی ضعف اور خرابی صحت کے معاوضہ میں اُن کی عقل بڑھ جاتی ہے؟ لیکن میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں، شہروں کی آب و ہوا کو جن لذائذ اور جن اشغال نے خراب کر دیا ہے وہ کسی حالت میں عقلی نشو و نما کے لئے موزوں نہیں ہیں، شہروں کی مصنوعی حرارت سے لڑکے سنِ رجولیت کو تو بہت جلد پہنچ جاتے ہیں لیکن وہ کامل ترین نہیں ہوتے،

تیرھواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر ارسم

بچوں کے لیے مستقل کمروں کی ضرورت

آج ہم اُس مکان کے دیکھنے کے لئے گئے، جس کے کرایہ پر لینے کی ڈاکٹر واڈنگٹن نے ہم کو

ہدایت کی تھی یہ مکان ایک ریگستانی ٹیلے پر تعمیر کیا گیا ہے، اس لئے مجھے خوف تھا کہ جو تند ہوائیں سمندر سے چلیں گی اس پر اُن کا سخت حملہ ہوگا، لیکن مجھے لوگوں نے یقین دلایا ہے کہ یہ ہوائیں ہر موسم میں سست رفتار اور صحت بخش ہوتی ہیں۔

مکان کا فرنیچر نہایت سادہ اور میری حالت کے لئے موزوں ہے، مجھے سب سے زیادہ حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ اس مکان کے بالائی حصہ میں دو کمرے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل علٰحدہ ہیں، اور اُن میں ظاہری حیثیت سے کوئی خوشنمائی نہیں پائی جاتی، لیکن باوجود اس سادگی کے اُن کا منظر اور موقع ایسا عمدہ ہے کہ اُن میں آفتاب کی روشنی بلا روک ٹوک آسکتی ہے، کیونکہ اُن کے جھروکے بالکل کھلے ہوئے ہیں اگرچہ باہر سے ان جھروکوں پر لوہے کی سلاخیں لگا دی گئی ہیں، جن کو دیکھ کر پہلے پہل مجھے انقباض سا پیدا ہوا۔ لیکن بعد کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ کمرے بچوں کے لئے بنائے گئے ہیں، اور یہ سلاخیں اس لئے لگائی گئی ہیں کہ بچوں کو کوئی حادثہ یا خطرہ نہ پیش آجائے، تو یہ انقباض و تکدر جاتا رہا ان دونوں کمروں میں سے ایک میں بچے سُلائے جاتے ہیں، اور دوسرے میں دن کو جب سردی اور بارش ہوتی ہے تو کھیلتے ہیں، لوگوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ ہر انگریزی گھر میں اس قسم کے دو کمرے بنائے جاتے ہیں اس بات نے میرے دل پر خاص اثر کیا کیونکہ ہمارے یہاں پیرس میں اگرچہ مکانات نہایت مکمل ہوتے ہیں یعنی اُن میں کھانے کا کمرہ الگ، ملاقات کا کمرہ الگ، اور سونے کا کمرہ الگ ہوتا ہے، لیکن باوجود اس تقسیم و ترتیب کے صرف ایک ذات۔ بھلا دی جاتی ہے یعنی بچہ کے لئے کوئی مستقل کمرہ نہیں ہوتا اس بنا پر ہمارے یہاں بچوں کو مجبوراً بڑوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں اپنے شب و روز گزارنے پڑتے ہیں، اور وہ اپنی عصبی المزاج ماں اور کاروباری باپ کے ساتھ ایک مضطرب الحال مہمان، اور غمگین قیدی کی سی زندگی بسر کرتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اثاث البیت کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور اُن کو خراب کر دیتا ہے، کتابوں کو ہاتھ میں لیتا ہے اور پھاڑ ڈالتا ہے، چینی کے برتنوں کو اُٹھاتا ہے اور توڑ ڈالتا ہے، اور ان خفیف نقصانات کے جرم میں، اُس کو ایک دائمی جھڑکی سہنی پڑتی ہے، اور ان الفاظ و سرزنش پر

اُس کے باپ ماں اُس کو ڈا نٹتے رہتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی گھر کی تنگی سے وہ باپ ماں کے کمرے سے نکال دئے جاتے ہیں اور اس حالت میں صحن کے سوا اُن کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا، لیکن تم کو معلوم ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں صحن کیسے ہوتے ہیں؟ وہ چوہے کے بل سے زیادہ وسیع نہیں ہوتے، انگریزوں نے بچوں کی خانگی زندگی کی ضروریات کو ہم سے بہتر سمجھا ہے اس لئے وہ بچوں کو ایک مستقل شخص خیال کرتے ہیں اور اُن کے لئے ایک مستقل کمرہ تعمیر کراتے ہیں۔

چودھواں خط

از ڈاکٹر ارسم بنام میلانہ

حاملہ کے مختلف حالات کا اثر بچّے پر

دیہات میں قیام کا جو مشورہ ہمارے دوست وارنگٹن نے تم کو دیا ہے، وہ نہایت صحیح ہے، اس وقت تمھارا سب سے بڑا فرض صحیح اور تندرست رہنا ہے، کیونکہ ہر بچہ جو دنیا میں اوّل اوّل آتا ہے وہ مختلف امراض کا آماج گاہ بن کے آتا ہے، جن کے علل و اسباب کی حقیقت کا پتہ لگانا تقریباً محال ہے، تاہم ہم کو یہ کامل یقین ہے کہ بچوں میں جو خلقی بدنمائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اکثر اُن کا سبب عورت ہوتی ہے، تم کو وہ خوبصورت لیڈی یاد ہوگی جس نے پورا ایام سرما پیرس کے ہالوں میں ناچ کر بسر کیا، یہاں تک کہ اُس نے وضع حمل کے وقت تک اس تفریحی مشغلہ کو جاری رکھا، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اُس کے لڑکی پیدا ہوئی تو وہ خلقۃً کوزہ پشت تھی۔

جب یہ ثابت ہو چکا کہ عورت کے مشاغل کا اثر بچّے پر پڑتا ہے، تو ہم عورت کے روحانی حالات اور بچّے کے اخلاق میں بھی علّت و معلول کا تعلق قائم کر سکتے ہیں، انگلستان کا مشہور حکیم

سوٹ اپنی طبعی بزدلی کا یہ سبب بیان کرتا تھا کہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھا تو اسپین کے باشندے سواحل انگلستان کا حملہ آورانہ چکر لگایا کرتے تھے، اور اس وجہ سے اس کی ماں خوف زدہ رہتی تھی۔

تم نے وقائع انگلستان میں پڑھا ہوگا کہ شاہ جیکب ثانی اس قدر بزدل تھا کہ برہنہ تلوار دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا، لیکن اس بزدلی کا سبب وہ مصائب و آلام تھے، جن میں اُس کی حاملہ ماں اسٹوارٹ مریم مبتلا رہتی تھی۔

اگرچہ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عورت کے نظام عصبی کے اضطراب و حرکت کا اثر بچے پر کس قدر پڑتا ہے، تاہم اس شبہ کی بنا پر بھی ماں کو ہر قسم کے انفعالات و تاثرات سے بچنا لازمی اور ضروری ہے، عورت نوعِ انسانی کا قالب ہے، جس میں وہ ڈھل کر ایک خاص شکل اختیار کرتی ہے، اس بنا پر اُس کو اپنی صحت کی سخت حفاظت کرنی چاہئے، اور حالتِ حمل میں جسمانی اور دماغی دونوں حیثیتوں سے مطمئن اور فارغ البال رہنا چاہئے۔ لیکن بہت کم عورتیں ہیں جو اس حالت میں تمام لذتوں، تفریحی جلسوں، اور تھیٹروں کو چھوڑ کر، بہتر اولاد پیدا کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتی ہیں، بلکہ اُن کو تو اس کا رونا رہا ہے کہ جس طرح دودھ پلانے کے لئے اُجرت پر دائیاں مل جاتی ہیں، اُسی طرح وظائف حمل کے ادا کرنے کے لئے عورتیں نہیں ملتیں، اگر اس قسم کی عورتیں مل سکتیں تو بہت سی دولت مند عورتیں نیچ قوم کی عورتوں کا پیٹ اپنے حمل کی حفاظت کے لئے اجرت پر حاصل کر لیتیں۔

لیکن نیچ قوم کی عورتوں کا یہ حال ہے کہ اُن کو اپنی ضروریاتِ زندگی کی وجہ سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ اپنی اولاد کے متعلق کافی اہتمام کر سکیں، میں نے بہت سی عورتوں کو جن کے وضع حمل کا زمانہ قریب آگیا تھا دیکھا کہ جاڑے کے زمانے میں نہر کے کنارے اپنا کپڑا دھو رہی ہیں، یا بازاروں میں بوجھل گاڑیاں کھینچ رہی ہیں، یا ایسا وزنی بوجھ اُٹھا رہی ہیں جس سے قوی سے قوی قلی بھی کانپ اُٹھتے ہیں، عورت جس قدر ضعیف ہوگی اُسی قدر نسل انسانی بھی کم زور ہوگی،

اس بنا پر اگر سوسائٹی بہتر، قوی، اور مستقل اولاد پیدا کرنے کی خواہش مند ہے تو اس کو تقسیم عمل کے عادلانہ اصول پر عمل کرنا چاہیئے، اور عورت کے ادب و احترام کا لحاظ کرنا چاہیئے۔

پندرھواں خط

از ڈاکٹر اراسم بنام ہیلانہ

تربیت اولاد کا مقصد

میں اس وقت جس حالت میں ہوں اُس کے لحاظ سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لڑکا مجھے نہ کبھی پہچانے گا، نہ دیکھے گا اور مجھ پر الزام لگائے گا کہ میں نے اُس کے فرائض اور حقوق نہیں ادا کئے، اس لئے میں سخت مکدر اور تنگ دل رہتا ہوں، تاہم اس عجز و بیچارگی کی حالت میں میں مستحق ملامت نہیں ہو سکتا، البتہ باپ ہونے کا فرض دوسرے قسم کے رویہ سے ادا کرتا ہوں یعنی میں ان خطوط کے ذریعہ سے اُس کے حقوقِ تربیت کا فرض ادا کرتا ہوں کیونکہ اس کے سوا میرے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں۔ لیکن سب سے پہلے ہم کو اپنی جدّ و جہد کی منزل متعین کر لینی چاہیئے، مجھے کسی ایسے سانچے کا علم نہیں جس میں بڑے بڑے لوگ ڈھل کر نکلتے ہوں، اور اگر کوئی سانچہ ایسا ہے تو اُس میں تربیت کو کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ مشیت خداوندی جس کو چاہتی ہے بنا دیتی ہے، اس بنا پر اگر میری اولاد نرینہ پیدا ہوئی تو اُس کی تربیت کا مقصد صرف یہ ہو گا کہ وہ ایک آزاد آدمی کی صورت میں نمایاں ہو، میں کسی حالت میں اُس کو بہت بڑا آدمی بنانا نہیں چاہتا۔

سترھواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر اسمم

انگریزی تربیت اولاد اور اُس کا مقابلہ فرنچ تربیت اولاد سے

میں اس شہر میں عام لوگوں سے بالکل علیحدہ زندگی بسر کرتی ہوں، صرف لیڈی وارنگٹن کے یہاں کبھی کبھی جاتی ہوں، جہاں سب سے زیادہ اطراف لندن کی لیڈیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے، ان لیڈیوں کے میل جول میں مجھے جو چیز سب سے زیادہ اہم نظر آتی ہے وہ اُن کا طریقہ تربیت اولاد ہے، اور میں اُن کو دیکھ کر فرائض مادری کے سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

انگلستان کی عورتیں تضمیط اولاد (یعنی لڑکے کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کپڑے میں لپیٹ کر جھولے میں سلا دینے) کے طریقہ کو نہایت ناپسند کرتی ہیں، اور ہم سے تمسخر انگیز طریقے پر کہتی ہیں کہ تم لوگ لوگوں کے دکھانے کے لئے بچوں کو تھیلے میں بند کر دیتی ہو، اور اگر تم کو موقع ملے تو تم اُن کو دیواروں کی کھونٹیوں میں لٹکا دے سکتی ہو، اُن کو یہ کہنے کا موقع اس لئے ملا ہے کہ اُن کے بچے اپنی نقل و حرکت میں کامل آزادی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، کیونکہ وہ فلالین کا ایک لمبا کُرتہ پہنتے ہیں، جس میں وہ بقدر طاقت اپنی ذات پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ مجھے یہ طریقہ نہایت پسند ہے کیونکہ میں نے اکثر نہایت ناگواری کے ساتھ دیکھا ہے کہ لڑکوں کو چند تنگ کپڑوں میں کس دیا جاتا ہے اور ادھر اُدھر آلپینیں لگا دی جاتی ہیں، اس حالت میں وہ کفن میں لپٹی ہوئی ایک مردہ لاش معلوم ہوتے ہیں۔

لڑکوں کے لئے بید کی بائیسکلیں، اور گھٹنوں کے بل چلنے کے لئے لڑھکنے والے جس قدر آلات ہیں انگلستان کے ڈاکٹر اُن کو سخت ناپسند کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان کے استعمال سے بچہ کا سینہ بدنما ہو جاتا ہے، اور چونکہ ان کے استعمال میں تمام جسم کا بوجھ صرف ایڑیوں پر پڑتا ہے، اس لئے

پنڈلیاں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں بلکہ ڈاکٹر واشنگٹن تو نہایت اصرار کے ساتھ کہتے ہیں کہ ابتدا ہی سے بچّوں کے تمام اعمال و حرکات کی بنیاد اُن کے قصد و ارادہ پر رکھنی چاہیئے، اور مصنوعی آلات کے ذریعہ سے اُن کے کھڑے کرنے اور چلانے کے طریقے کو چھوڑ دینا چاہیئے، کیونکہ اس حالت میں بچہ اپنی قوت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، وہ سمجھتا ہے کہ وہ خود چلتا ہے حالانکہ وہ نہیں چلتا بلکہ مصنوعی آلہ چلتا ہے اور یہ ایک ایسا وہم ہے جس کا اثر عمر بھر اُس کے تمام اعمال و حرکات سے ظاہر ہوتا ہے انگلستان میں لڑکے بذات خود چلنا پھرنا سیکھتے ہیں، وہ بالکل آزاد چھوڑ دیے جاتے ہیں، اور ایک فرش بچھا دیا جاتا ہے جس پر وہ لڑھکتے پھرتے ہیں، اس طرح اُن کو آہستہ آہستہ کھڑے ہونے کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر اثاث البیت کے سہارے سے چند قدم اُٹھاتے ہیں اور اگر ضعف کی بنا پر لڑکھڑانے لگتے ہیں تو اُن کی ماؤں کے ہاتھ اُن کو گرنے سے روک لیتے ہیں۔

یہ طریقہ تربیت جو بالکل فطری ہے انگلستان سے زیادہ امریکہ میں رائج ہے، چنانچہ ایک انگریزی سیّاح نے ولایات متحدہ امریکہ میں ایک دو تین برس کے لڑکے کو دیکھا کہ وہ ایک پُل کے کنارے جس کے نیچے پانی کا سخت دھارا جاری ہے، ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، وہ سخت گھبراہٹ کی حالت میں اُس کی ماں کو ڈھونڈھنے لگا، جو اس دریا کے کنارے نہایت اطمینان کے ساتھ کپڑے دھو رہی تھی، اُس نے اُس سے نہایت گھبراہٹ کے ساتھ اُس کے لڑکے کی خطرناک حالت بیان کی، لیکن اُس نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ جواب دیا کہ "لڑکا اپنی حفاظت کا خوگر ہے، اور اگر میں اُس کو اس خطرے سے بچانے کے لئے دوڑوں اور گھبراہٹ کا اظہار کروں تو یہ خود اس کی طبعی رہنمائی اور اصابت رائے کو صدمہ پہنچائے گا"۔ سیّاح نے یہ فقرے سنے تو لڑکے کو دیکھنے لگا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے خود اپنے آپ کو خطرے سے نکال لیا۔

مجھے اگر تمام دنیا مل جائے تب بھی اس حالت میں اپنے بچے کو دیکھنا نہ پسند کروں گی لیکن اگر اس عورت نے اپنے بچے کو خطرے میں ڈال دیا تو کوئی غلطی نہیں کی، بلکہ اُس نے فرائض مادری کو ہم سے بہتر سمجھا، بچوں کی تربیت کا یہی طریقہ ہے، جس کی بنا پر شمالی امریکہ کے لوگوں میں مخاطرہ

اور استقلال کا میلان پایا جاتا ہے۔

تمام انگریزی مائیں بچوں کے سر کا ڈھانکنا ناپسند کرتی ہیں، اور ان کو وہ ٹوپیاں جن کے اندر اون بھرا ہوتا ہے نہیں پہناتیں، اُن پر اگرچہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس حالت میں گرنے سے لڑکوں کے سر میں چوٹ آسکتی ہے لیکن وہ اولاً تو اس کا یہ جواب دیتی ہیں کہ خود اُن کی حفاظت بچوں کو اس خطرے سے محفوظ رکھتی ہے، ثانیاً یہ کہ جب لڑکا یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اُس کی حفاظت کرنے والا نہیں، تو وہ خود اپنی آپ حفاظت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اس لئے بچپن ہی سے اپنی حفاظت اور مدافعت کا خلقی استقلال اُس میں پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ حفاظت کے محتاطانہ طریقوں پر جو اکثر غیر مفید ہوتے ہیں اعتماد نہیں کرتا۔

متحرک جھولے جو ہمارے یہاں بچوں کے لئے ضروری خیال کئے جاتے ہیں انگلستان میں بہت کم مستعمل ہیں، یہاں بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے کھٹولے بنائے جاتے ہیں جن کو ہاتھ سے حرکت نہیں دی جاتی، انگریز لڑکوں کو حرکت دینے کے سخت مخالف ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس طریقہ سے اُن کو بغیر مصنوعی ذرائع کے نہ سونے کی عادت ہو جاتی ہے اور اس عادت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا جسمانی آرام دوسروں کے پاس تلاش کرنے لگتے ہیں، حالانکہ فطری طریقے کے مطابق انسان کو اپنا آرام خود اپنے پاس تلاش کرنا چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ انگلستان کے بچے بہ نسبت ہمارے بچوں کے بہت کم روتے ہیں، بچے عموماً کسی عارضی تکلیف سے روتے ہیں، اور یہاں بچوں کو جو آزادی دی گئی ہے، اون کی صحت کا جس قدر لحاظ کیا جاتا ہے اور غذا کی باقاعدگی جس طرح اُن کی صحت اور نشو ونما کو ترقی دیتی ہے، اُس کے لحاظ سے وہ بہت کم تکلیفوں میں مبتلا ہوتے ہیں انگریز مائیں اپنے بچوں کو خود دودھ پلاتی ہیں، اور اسی وجہ سے دائی کا لفظ یہاں اُس معنی میں مستعمل نہیں جس کے لئے یہ لفظ ہمارے یہاں وضع کیا گیا ہے، اس لفظ سے یہاں صرف وہ عورت مراد ہوتی ہے جو تربیت اولاد کا بار اُٹھاتی ہے۔ بہرحال یہاں دودھ پلانے والی عورتوں کی دو قسمیں ہیں

جو ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہیں، ایک کو خشک دائیاں اور دوسرے کو تر دائیاں کہا جاتا ہے، لیکن یہاں ان کی تعداد بہت کم ہے، اور صرف اُس حالت میں اُن سے کام لیا جاتا ہے، جب ماں دودھ پلانے سے بالکل مجبور ہو جاتی ہے، بلکہ اکثر انگریزی عورتیں دودھ پلانے والی شیشی کو دائیوں پر ترجیح دیتی ہیں، انگریزی عورتیں اس بارے میں ہم کو سخت ملامت کرتی ہیں، اور میرے نزدیک اُن کی ملامت بجا بھی ہے، کیونکہ بہت سی دولت مند فرنچ عورتیں اپنی عزیز ترین اولاد کو دیہاتی، خشک طبع، اور گندہ بدن عورتوں کے حوالے کر دیتی ہیں۔

پاکیزگی اور صفائی، انگریزوں کے یہاں بچوں کی صحت کا سنگ بنیاد ہے، یہاں تک کہ فقرا بھی صبح کے وقت اپنے بچوں کو غسل دیتے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب ہم گزشتہ خوشگوار زمانے میں ٹویلیری کی سیرگاہ، یا لوکسمبرگ کے باغ میں تفریح کو جاتے تھے، تو اکثر اُن بچوں کو دیکھ کر ہمیں رنج ہوتا تھا، جن کے ماں باپ اُن کو ہمہ تن زیب و زینت بنا کر لاتے تھے اور نکلنے سے پہلے اُن کو سر سے پاؤں تک قیمتی کپڑے پہناتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک خوش رو لڑکا، نہ لڑکا کا خیال کیا جاتا تھا، اور نہ اُس کے باہر نکالنے سے اُس کی تفریح و ترویح مقصود ہوتی تھی بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ اُس کے دیکھنے سے دوسروں کو لطف و مسرّت حاصل ہو، اس لئے جب وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے زمین کو کریدتا تھا، یا ہوا کے رُخ چلتا تھا، اور ہوا کی تھپیڑے اُس کے آراستہ و پیراستہ گھونگر والے بالوں کو پراگندہ کر دیتے تھے، تو اُس پر ڈانٹ پڑتی تھی کہ اُس نے اپنے آپ کو میلا کر دیا، اور اس کو سکون و وقار کی جو ہدایت کی گئی تھی اُس پر عمل نہیں کیا، بہرحال اُس کے مربی اُس کی تفریح نہیں چاہتے تھے، بلکہ اُس کو ایک نمائش کی چیز خیال کرتے تھے، اور اس سے اُن کا یہ مقصد نہ تھا کہ لڑکا دھوپ اور فضا میں چل پھر کر اپنی صحت، اور اپنے اعضا کو فائدہ پہنچائے، بلکہ وہ اُس کو ایک خوشنما کھلونا بنا کر لاتے تھے

تاکہ اُس کو دیکھ کر دوسری ماؤں کا غرور ٹوٹ جائے، اس لئے جب ایک ماں اپنی لڑکی کو ریشمی کپڑوں میں اکڑتے ہوئے دیکھتی تھی تو فخر و غرور کے ساتھ دل ہی دل میں کہتی تھی کہ اگر فلاں لیڈی اس کو دیکھتی تو رشک و حسد سے اس کا کلیجہ پھٹ جاتا۔

انگلستان کی عورتیں بھی اپنے بچوں کو قیمتی کپڑے پہنا کر سیر گاہوں میں لے جاتی ہیں، بلکہ کبھی کبھی اس میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہیں، لیکن یہ آرائش صرف اتوار کے دن کے لئے مخصوص ہے، باقی دیہاتی بچے تو اُن کو مہینوں باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اُن کے مربّی اُن کو خانہ باغ میں آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور وہ دھوپ میں کھیلتے پھرتے ہیں، لڑکیوں کے جسم پر چھوٹے چھوٹے کرتے اور بچوں کے بدن پر باریک باریک اونی قمیصیں ہوتی ہیں، اور اسکے ماں باپ اُن کے کھیل کود میں اُن سے بالکل تعرض نہیں کرتے لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نے لڑکوں کی ہر چیز کو قاعدہ وقانون کی پابندیوں میں جکڑ دیا ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ ہم ایک لیڈی کے ہال میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اسی حالت میں اُس کا چار سالہ یا پانچ سالہ لڑکا جس کے چہرے سے تکدر کے آثار نمایاں تھے آیا اور اپنی ماں سے کہا کہ "میں کیونکر اپنا دل بہلاؤں"؟ مجھے یاد ہے کہ اس سوال سے ہم سخت حیرت زدہ ہو گئے تھے، اور ہم نے باہم اس کا خوب مذاق اُڑایا تھا، حالانکہ اس غریب بچے کے لئے ایک دائیہ مقرر تھی جو گراں قیمت تنخواہ لیتی تھی، اسی دل بہلانے کے لئے وہ اُس کے سپرد کیا گیا تھا، بہت سے انگریزی خاندانوں میں بھی دائیاں مقرر ہیں، لیکن وہ اپنی صغیر السن رعایا پر اُسی طرح حکومت کرتی ہیں جس طرح ملکۂ انگلستان اپنی رعایا پر حکومت کرتی ہے، یعنی وہ لڑکوں کے کھیل کود اور اُن کے تفریحی مشاغل میں بالکل دست اندازی نہیں کرتیں، ہمارے انگریز پڑوسی اس معاملہ میں لڑکوں کی آزادی کو بدلائل ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بڑے لوگ لڑکوں کے کھیل کود میں شریک ہو جاتے ہیں تو لڑکوں کے ذوق زیادہ خود اپنے مذاق کا لحاظ رکھتے ہیں اس لئے لڑکوں کے اختیار و ارادہ کے سلب کر دینے سے اُن کی اختراعی روح فنا

ہو جاتی ہے اور عمل کا طبعی شوق زائل ہو جاتا ہے گویا ہم اپنے طبعی میلان کے ذریعے خود بچوں کے طبعی میلان کو فنا کر دیتے ہیں، لڑکا جب چاق وچست ہوتا ہے تو وہ خود اپنی تفریح کا سامان کر لیتا ہے، اور جب وہ اس کا خوگر ہو جاتا ہے، تو اپنے کھیل کود میں دوسرے کا محتاج نہیں رہتا، لڑکوں کے عدم استقلال کی یہی عادت تھی جس نے گزشتہ بادشاہوں کو کاہل اور افسردہ بنا دیا تھا، اس لئے وہ مجبوراً اپنے مصاحبین میں بہت سے مسخروں کو شامل کر لیتے تھے جن کا کام صرف ہنسنا اور ہنسانا ہوتا تھا۔

جو شخص کسی انگریزی گھر میں داخل ہوتا ہے اس کو بداہتہً نظر آتا ہے کہ ان کے تعلقات میں مضبوطی اور استحکام نہیں ہے، باپ ماں بچوں سے بہت کم دلاویزی ظاہر کرتے ہیں، اسی طرح بچے بھی اجنبیوں سے بہت کم مانوس ہوتے ہیں اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ باہمی تعلقات کی یہ حالت انگریزوں کا فطری خاصہ ہے، یا تربیت کے اصول وقواعد کا نتیجہ ہے، تو میری اس گفتگو کو سننا چاہئے، جو مجھ میں اور ایک دایہ میں جس نے تربیت وتعلیم کے متعلق مجھ پر بہت سے احسانات کئے ہیں اس موضوع پر ہوئی ہے، اس نے اثنائے گفتگو میں کہا کہ انگریز اپنے بچوں کے ساتھ بہت زیادہ لطف ومراعات اس لئے نہیں کرتے، کہ ان میں خیالاتِ فاسدہ پیدا نہ ہونے پائیں۔ لیکن ہم فرنچ لوگ بچوں کے ساتھ عورتوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں اس لئے یہ دونوں اس سے زیادہ محبت کے خوگر ہو جاتے ہیں جتنی ان کے لئے ضروری ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے برتاؤ سے نازپرور عورتیں، اور ضدی بچے پیدا ہوتے ہیں، محبت محبت کو پیدا کرتی ہے، لیکن خوشامد، چاپلوسی، اور خداعی سے جرائم غرور کی نشوونما ہوتی ہے، اس لئے جو لوگ امراء کی طرح بچوں کی خوشامد کرتے ہیں، ان کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ تمام لوگ ہمارے زیر فرمان ہیں، اور ہم کسی کے زیر فرمان نہیں۔

انیسواں خط

از ڈاکٹر اراسم بنام ہیلانہ

طریقہ تربیت سے متعلق روشو کی غلطی اور اُس کی صحت

شورش فرانس کا اثر خانگی زندگی پر

تربیت اولاد کی ترقی، اور معاملات زن و شوئی، حکومت کے ساتھ وابستگی تعلیم کے طریقے کی غلطی تعلیم کا مقصد آزادی ہے، حکومت کی غلامی نہیں ہے۔ استبدادی حکومت اور تعلیم عام فرنچ طریقہ تربیت میں تقلید اور قوت حافظہ کی ترقی، مدرسہ کے بعد انسان کا خود اپنی تربیت کرنا شاذ ہے۔

تم نے اپنے خط کے اخیر میں مجھ سے دریافت کیا ہے کہ بچے کا کیا نام رکھا جائے؟ اگر اولاد نرینہ پیدا ہو تو اُس کتاب[1] کی یادگار میں جس کو میں راتوں کو تمھیں پڑھ کے سُناتا تھا، اُس کا نام "امیل" رکھنا چاہیئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ چند روز سے ہمارے اہل نظر جان جاک روشو کو ناشائستہ الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور اُس کو حقیر سمجھتے ہیں حالانکہ اُس کا صرف یہ گناہ ہے کہ عام طور پر سوسائٹی کی جو اصلاح مردوں پر موقوف سمجھی جاتی تھی اُس نے اپنے ہمعصر فلاسفہ سے اس بارے میں اختلاف کر کے اپنی توجہ بچوں اور ماؤں کی طرف مبذول کی اور اس معاملہ میں اُن کو اپنا مخاطب بنایا اگر ہم اس کتاب کا خلاصہ کرنا چاہیں تو اُس کے تمام مباحث کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ بچوں کی تربیت بالکل فطری طریقے پر ہونی چاہیئے، اور اُن کے ساتھ عقلمندوں کا سا برتاؤ کرنا چاہیئے،

---

[1] یعنی جان جاک روشو کی کتاب "اٹھارہویں صدی کا امیل"۔

لیکن اگر تمام معاملات میں فطرت کی پیروی کی جائے تو اس سے بچہ دورِ وحشت کی طرف رجوع کر جائے گا، با ایں ہمہ اس حکیم کے نزدیک تربیت کی غایت کمال یہ ہی تھی، اور وہ اگرچہ وحی اور الہام پر ایمان نہیں رکھتا تھا، تاہم وہ اس کا معتقد تھا کہ معیار کمال خود فطرت کے اندر موجود ہے، اور اس کے لئے وحی اور الہام کی ضرورت نہیں۔

لیکن لڑکوں کے ساتھ عقلمندوں کا سا برتاؤ کرنے کی جو ہدایت اس حکیم نے کی ہے، اُس کے لئے وہ ہر ممکن تعریف کا مستحق ہے، لیکن بخلاف تمام قوائے انسانی کے بچپن میں عقل کی نشو و نما بہت کم ہوتی ہے اس لئے اس مخفی قوت پر کیونکر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

روسو نے اپنی کتابوں میں بچّوں کی حمایت اور اُن کے حقوق کی حفاظت کر کے اُن کی خدمت اس طرح کی ہے کہ اس نے ان کتابوں کے ذریعہ سے فرنچ لوگوں میں شورش انگیزی کی روح پیدا کی ہے، جب سے شورش فرانس کا آغاز ہوا ہے، لوگوں نے اس کا اندازہ بالکل نہیں کیا کہ اس حادثہ نے خانگی نظام زندگی میں کیا تغیر پیدا کیا ہے؟ لوگوں کی لاعلمی میں اس واقعہ نے ولایت پدری کا بوجھ عجیب و غریب طریقہ سے ہلکا کیا ہے، چنانچہ ۱۷۸۹ء اور ۱۷۹۹ء کی شورش کے بانیوں کو اُن خانگی اخلاق و عادات کے تغیّرات کا حال معلوم نہیں جو اُن کے زمانے میں پیدا ہوئے، اور خود اُن کے سامنے آئے، کیونکہ کوئی شخص تمام لوگوں کے اعمال و افعال کو پیش نظر نہیں رکھ سکتا، اس لئے اس قسم کے تغیرات کے دریافت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سترھویں صدی کے اخیر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل میں جو اخلاقی کتابیں لکھی گئی ہیں، اُن کی طرف رجوع کیا جائے، اس طریقہ سے معلوم ہو سکتا ہے، کہ اُس وقت میاں، بی بی اور ماں اور بچے کے تعلقات کس قدر مصنوعی، بے کیف ، اور ناخوش گوار تھے، اُس وقت خانگی زندگی کی بنیاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ونس وصیتوں میں سے اس وصیت پر تھی کہ "اپنے باپ اور ماں کی عزت کرو" لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ماں باپ کی محبت کی وصیت نہیں کی تھی۔

اُس وقت اکثر عورت اپنے شوہر کو "آقا" اور شوہر اپنی بی بی کو "میڈیم" کے لفظ سے خطاب

کرتا تھا، لیکن شورش کے بعد تمام گھروں میں ضمیر مفرد کے ساتھ خطاب کیا جانے لگا، اور پہلی اولاد اور اُس کے دوسرے بھائیوں کے حقوق مساوی طور پر تسلیم کئے گئے، اس طرح اختلاف و تباین کی جڑ کٹ گئی اور عورت کا درجہ بلند تر ہو گیا، اور گھروں میں مصالح عامہ پر آزادانہ مباحثے ہونے لگے، اور میاں بی بی کی آواز پہلے سے زیادہ بلند ہو گئی۔

۱۷۸۹ء کی شورش سے پہلے بچے پر گرجے کے حقوق ماں باپ سے بھی زیادہ تھے، کیونکہ مائیں اکثر گرجوں میں تربیت پاتی تھیں، اس لئے گرجوں کی قساوت اور صلابت گھروں میں منتقل ہو کر آجاتی تھی، لیکن میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ شورش سے پہلے ماں بچے سے محبت ہی نہیں کرتی تھی، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ شورش نے اس محبت کو تصنع و تکلف کی پابندیوں سے آزاد کر دیا اور محبت ہی تمام اعمال انسانی کا مبدا ہے۔

موجودہ طریقہ تربیت اُس وقت قائم کیا گیا جب شورش فرانس کا خاتمہ ہو چکا تھا، حکام نے تعلیم قدیم کی بنیاد کو از سر نو قائم کیا اور اس تعلیم نے حکومت استبدادیہ کے اصول کی تلقین کی، اور یہی حاکمانہ طاقت مدارس کی مہتمم، مذہبی تعلیم کی پروفیسر، فوجوں کی سپہ سالار، اور مقننِ اعظم غرض کل صوبوں کی مجموعی طاقت بن گئی، اور اس طرح پرائمری، سکنڈری بلکہ کل درجوں کی تعلیم قانونی شکنجے میں جکڑ گئی، اس طریقے سے علوم و معارف کی جو اشاعت ہوئی میں اُس پر پشیمانی کا اظہار نہیں کرتا، لیکن اگر تعلیم کا یہ مقصد ہے کہ آزاد اشخاص پیدا کئے جائیں تو مجھے شک ہے کہ حکومت کے اعمال کا اس مقصد پر کوئی اثر پڑا ہے، میں نے بار بار سنا ہے کہ جہالت سب سے زیادہ آزادی کا سنگ راہ ہے، اور میں خود اس کو تسلیم کرتا ہوں، جن لوگوں کا یہ قول ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حکومت نے تعلیم کو مفت اور جبری کر دیا ہے، اس لئے اب اصل مقصد حاصل ہو جائے گا، لیکن میں اس کو تسلیم نہیں کرتا، اور اُن لوگوں کے سامنے چین کی مثال پیش کرتا ہوں، یہاں کا ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا ہے، اور یہاں پرائمری اور سکنڈری مدارس کثرت سے ہیں، اور امتحان کے متعدد طریقے جاری ہیں چینیوں نے یورپ سے پانچسو برس پہلے

چھاپے خانے ایجاد کئے تھے، جو تغیرات عالم کے لئے سب سے زیادہ مؤثر چیز ہیں، بااین ہمہ اس تعلیم نے سوسائٹی کی بندشوں کو اور بھی زیادہ سخت اور مضبوط کر دیا۔ جس قوم میں تعلیم و تربیت کا یہ مقصد ہوگا کہ ایک خاص سانچے میں حکومت کے لئے رعایا ڈھالی جائے اُس کا یہی حشر ہوگا، اس حیثیت سے خود یورپ کی قوموں کا وہی حال ہے جو چینیوں کا ہے کیونکہ پرائمری تعلیم میں مذہبی اور سیاسی طاقت کی مداخلت روز بروز بچوں میں اندھا دھند اطاعت کا مادہ پیدا کرتی جاتی ہے، اور استاد حکام کے ہاتھ کا ایک آلہ بنتے جاتے ہیں۔

یہ خیال کرنا غلطی ہے کہ استبدادی حکومتیں قصداً تعلیم عام کی ترقی کو ناپسند کرتی ہیں، البتہ قوم کے لئے جو چیز سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ اختیاری غلامی ہے، جن ہتھکڑیوں سے غلاموں کے ہاتھ جکڑے جاتے ہیں وہ آسانی سے توڑی جاسکتی ہیں لیکن امراء کے نوکروں کا سرکاری لباس ایک طویل مدت تک اُن کے جسم پر قائم رہتا ہے، قوم نے تربیت فاسدہ اور ذاتی منفعت کی بنا پر اطاعت و انقیاد کا طریقہ سیکھ لیا تو ان کے مربی کا مقصد حاصل ہوگیا،

جو لوگ تعلیم میں حکومت کی مداخلت کو پسند کرتے ہیں، اُن کے اس اعتقاد کی بنیاد تمام تر تقلید پر ہے، اور یہ لوگ طلباء سے دماغی اور عملی استقلال کی توقع نہیں رکھتے وہ لوگ صرف یہ چاہتے ہیں کہ طلباء سے جو کچھ کہا جائے وہ اُس پر بلا چون و چرا عمل کریں، اس مقصد کے علاوہ یہ لوگ اور کسی چیز کی پروا نہیں کرتے، بلکہ اُن کی محبوب ترین خواہش یہ ہے کہ اس طریقہ پر مدرسہ سے متوسط درجہ کے لوگ نکلتے رہیں، کیونکہ اس طرح قوم نہایت مطیع اور فرمانبردار ہوجاتی ہی۔

ہم نے نصف صدی سے علوم ریاضیہ، طبیعہ اور اقتصادیہ وغیرہ کے حاصل کرنے کے طریقے بدل دئے ہیں، صرف تربیت اطفال کا طریقہ اپنی قدیم حالت پر قائم رہ گیا ہی، حالانکہ تغیر کی ابتداء اُسی سے ہونی چاہئے تھی، میں جب اپنے پرائمری اور سکنڈری مدارس میں داخل ہوتا ہوں تو مجھے مجبوراً اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان مدارس کی جو عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں، طلباء کے لئے جو نظام تعلیم مقرر کیا گیا ہے، اور تعلیم کے تمام طریقوں کو ملا جُلا کر جو ایک معجون مرکب تیار کر لیا گیا ہے،

اُس کا مقصد یہ ہے کہ طلباء کے جسم اور عقل دونوں کو قید کر لیا جائے، جس طرح مصریوں نے مرغیوں کے پکانے کے لئے چولھے ایجاد کئے تھے، اُسی طرح ہم نے طلباء کے پخت وپز کے لئے چولھے تیار کئے ہیں، اور اس مصنوعی حرارت سے جن قوتوں کی پخت وپز کی جاتی ہے، وہ قوتِ حافظہ اور قوت تقلید ہیں اور تمام قوائے انسانیہ میں ملکات صحیحہ کے اظہار کے لئے یہ دونوں قوتیں نہایت کم درجہ کی تسلیم کی گئی ہیں اس طریقہ سے تعلیم کے نگراں کار لوگوں کا اصلی مقصد یہ ہی کہ ابتدا ہی سے تمام لوگ یکساں اور ہموار ہو جائیں، بہت سے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جمہوری حکومت کے حاصل کرنے کے لئے یہ اتحاد اور ہمواری لازمی چیز ہے، لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ علمی اور اخلاقی اتحاد کا مساوات حقوق پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ولایاتِ متحدہ کے باشندے سب سے زیادہ جمہوری نظام حکومت کے شیدائی ہیں، لیکن بایں ہمہ اُن میں استقلال ذاتی کا احساس جو کہ آزادی کا سرچشمہ ہے روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔

ہر صاحب عزم نوجوان اگرچہ بذات خود اُن علوم کو نئے سرے سے حاصل کر سکتا ہی جن کی عمدہ تعلیم اُس نے مدرسے میں نہیں پائی ہے، لیکن الف وعادت کی اُن بیڑیوں سے وہ کیونکر آزاد ہو سکتا ہے جن میں وہ بچپن ہی سے جکڑا ہوا ہے؟ اور وہ اپنے مستقبل کے متعلق صرف اُن علوم سے کیونکر ہدایت حاصل کر سکتا ہے جن کو اُس نے حاصل کیا ہے، حالانکہ ابتدا ہی سے وہ مستقلاً کسی کام کے کرنے کا عادی نہ تھا، بلکہ جو کچھ کرتا تھا اساتذہ کے سامنے کرتا تھا؟ اور وہ اپنی اُن قوتوں کو کیونکر زندہ کر سکتا ہے جن کو جانوروں کی سی تربیت نے مردہ کر دیا ہے؟ اور ملامت ضمیر کے کیا معنی ہو سکتے ہیں جب کہ نوجوانوں کا احساس ہی سلب کر لیا گیا ہے؟

یہ سچ ہے کہ بہت سے مشاہیر جو بچپن میں سخت پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے، لیکن اُن کے مستقبل پر اُن کا کچھ اثر نہیں پڑا مثلاً ڈی والٹر نے پادریوں کی گود میں تربیت پائی تھی، لیکن ۱۷۸۹ء میں جو شورش خود اُن پادریوں کے خلاف ہوئی اُس کا وہ ایک سرغنہ تھا، لیکن میں افراد سے بحث نہیں کرتا، میں عام قوم سے بحث کر رہا ہوں، اور تم کو یقین کرنا

چاہیئے کہ انسان جب اپنا ذاتی اختیار کھو چکا تو وہ آسانی سے اُس کے واپس کرلینے کی طاقت نہیں حاصل کر سکتا۔

بیسواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر ارآہم

ایامِ حمل

حاملہ کے لئے ریاضتِ جسمانی، سیر و تفریح، اور مناظر طبعی کے مشاہدہ کی ضرورت اور محرکات جذبات سے اجتناب

ڈاکٹر وارنگٹن اپنے اہل و عیال کے ساتھ یہاں آئے اور دو دن بسر کئے، اُنھوں نے میرے طرز بود و باش کے متعلق گویا ایک قانون بنا دیا ہے جس پر مجھے عمل کرنا چاہیئے، اور اکثر انگریز حاملہ لیڈیاں اس پر عمل کرتی ہیں اُنھوں نے مجھے ہمیشہ ریاضتِ جسمانی اور سیر و تفریح کا مشورہ دیا ہے اور حسب ذیل ہدایتیں کی ہیں:-

"تم کو اُن قصص و حکایات سے اجتناب کرنا چاہیئے جن کا مطالعہ نفس میں ہیجان اور لغو خیالات پیدا کرتا ہے، یونانی لوگ حالت حمل میں مشہور مصوّروں کی خوشنما تصویریں عورتوں کے ارد گرد رکھتے تھے اگرچہ مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ صرف اسی بنا پر اُن کی اولاد خوبصورت پیدا ہوتی تھی، تاہم بہرحال یہ تصویریں نفس میں انبساط کی کیفیت پیدا کرتی ہیں، اور مزاج اور طبیعت کو معتدل بناتی ہیں، اس لئے حفظان صحت کا ذریعہ بنتی ہیں، حالتِ حمل میں بہت سی لیڈیاں بیکاری کی وجہ سے افسردہ، مضمحل اور ضعیف ہو جاتی ہیں کیونکہ وہم و خیال کی جولانی کے سوا اُن کا کوئی مشغلہ نہیں ہوتا، لیکن چونکہ میں تم کو خانگی مناظر کا شیدائی پاتا ہوں اس لئے تم کو قدرت کی صناعیوں کے مشاہدہ کی ہدایت کرتا ہوں، تم اپنے لئے

کچھ کام مقرر کرو جس میں تمہارے ہاتھ اور دماغ دونوں مشغول رہیں"۔

میں نے ان نصائح کو مفید سمجھ کر ان پر عمل شروع کر دیا اور دوسری ہی دن گھر کے کام دھندے سے فارغ ہو کر سیر کو روانہ ہو گئی، اور صرف ساحل سمندر کے گلگشت پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ پر فضا دیہات میں نکل گئی، اور اس سیر و تفریح کی حالت میں مجھے آپ کا یہ فقرہ یاد آ گیا کہ "میں نے اس بچے کو تمہارے سپرد کیا"۔ اس وقت میری زبان سے بے اختیار یہ فقرے نکل گئے "میں خود اپنے لڑکے کی معلّمہ کیوں نہ بنوں"؟ کیا عام طور پر یہ مشہور نہیں ہے کہ ولایات متحدہ کی عورتیں اپنے بچوں کو خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں خود تعلیم دیتی ہیں، بلکہ ماہرینِ فنِ تعلیم کا تو یہ خیال ہے کہ اس معاملے میں ان کو مردوں پر ترجیح حاصل ہے اور میں خود اس کا تجربہ کروں گی۔

اکیسواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر ار اسم

مدارس میں ورزش

انگریزی مدارس ورزش کا طریقہ، انگریزوں کی آزادانہ تربیت، انگریزوں کا اعتماد بچوں پر، تعلیم کے گھنٹوں کی قلت اُن کی کثرت سے بہتر ہے، لڑکوں کے عمل پر اعتماد، فطری تربیت اخلاق طلباء کے لئے ایک محکمہ عدالت

مجھے چند ہفتے آپ کے دوست ڈاکٹر وارنگٹن کے یہاں قیام کا اتفاق ہوا، جہاں مجھ سے ایک باوقار معمر شخص سے ملاقات ہوئی جس نے بہت سے ممالک کی سیاحت کی ہے، اور دورانِ سیاحت میں انگلستان اور یورپ کے اکثر مدارس کو دیکھا ہے، اور طریقہ تربیت کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے، چونکہ ہمارا اور اُس کا موضوعِ بحث ایک ہے، اس لئے میں نے خصوصیت کے ساتھ اُس کی

باتوں کو سُنا ہی، اُس نے مجھ سے دورانِ گفتگو میں کہا کہ "برطانیہ عظمیٰ کے باشندے سب سے پہلے بچوں کے قوائے جسمانی کی نشو ونما کا لحاظ رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ ورزش اور کھیل کود کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں، اگرچہ انگلستان کے مدارس میں جمناسٹک کا بھی رواج ہے، لیکن انگریز طالب العلم اس کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے، وہ کشتی، دوڑ دھوپ، فٹ بال اور کرکٹ کو زیادہ پسند کرتے ہیں، انگلستان کے مدارس میں قوانین صرف قیام نظام تعلیم و تربیت کے لئے بنائے گئے ہیں، ان پر عمل نہیں کیا جاتا، چنانچہ ایک بڑے مدرسے کے مہتمم نے ایک مرتبہ خلاف عادت یہ حکم دے دیا کہ کھیل کود میں طلباء کی نگرانی کی جائے، لیکن چند ہی روز میں اُس کو اپنی غلطی معلوم ہو گئی، اور اُس نے ندامت کے ساتھ اعتراف کیا کہ یہ تشدد بچوں کو انحطاط کی طرف لے جاتا ہے۔

انگریز طالب العلم چھٹی کے اوقات میں بالکل آزاد ہوتے ہیں، اور ادھر اُدھر شہروں اور کھیتوں میں آزادانہ گھومتے رہتے ہیں، کوئی اُن کا نگراں اور محافظ نہیں ہوتا، اُن کے اساتذہ اُن سے صرف یہ مطالبہ کرتے ہیں، کہ اخلاقی حیثیت سے اُن کو ہر حال میں جنٹلمین رہنا چاہیئے۔

انگریز کہتے ہیں کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمھارا لڑکا بچپن ہی میں مرد ہو جائے تو اُس کے ساتھ مردوں کا سا برتاؤ کرو، یہ ایک اصول ہے جس پر اُن کے نزدیک تربیت کی بنیاد قائم ہے، تم کو یہ دیکھ کر حیرت ہو گی کہ تعطیل کے زمانے میں نہایت کثرت سے انگریز کم سن لڑکے، تجارتی جہازوں، عام سواریوں، اور ریلوں میں تنہا اپنے باپ ماں کی اجازت سے سفر کرتے ہیں، اور اس پر خطر سفر کے خطرات سے بچنے کے طریقے جانتے ہیں، انگریزوں کا خیال ہے کہ دنیا میں مستقل طور پر زندگی بسر کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔ اس قسم کی تربیت کا بچوں پر ایک روحانی اثر پڑتا ہے اور اُن میں بہت سے کاموں کی جن میں بہت زیادہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے قابلیت پیدا ہو جاتی ہے، اس بڈھے شخص نے مثال کے طور پر مجھ سے

بیان کیا کہ لندن کا ایک بہت بڑا تاجر چودہ برس کے سن سے بہت سی تجارتی دوکانوں کو اپنے باپ کے نام سے چلاتا تھا، انگریز صرف تجارت اور صنعت وحرفت ہی کے کاموں میں اپنی اولاد پر اعتماد نہیں کرتے، بلکہ اس اعتماد کا اظہار فنون عقلیہ مثلاً شاعری اور انشا پردازی میں بھی ہوتا ہے، انگریز دوسرے لوگوں سے زیادہ عالم نہیں ہوتے، لیکن چونکہ بچپن ہی سے اُن کو استقلال کی تعلیم دی جاتی ہے، اس لئے وہ ہر چیز میں ہم سے زیادہ مستقل نظر آتے ہیں۔

بہ نسبت مدارسِ فرانس کے انگریزی مدارس کے اوقاتِ درس کے گھنٹے چھوٹے ہوتے ہیں، اور لوگوں کا بیان ہے کہ اس سے ترقی تعلیم پر کوئی مضر اثر نہیں پڑتا، کیونکہ لڑکا صرف کتاب ہی کے ذریعہ سے تعلیم نہیں حاصل کرتا، بلکہ مناظر قدرت کی نیرنگی، ساتھیوں کی گفتگو، اور ماں باپ کی روزانہ زندگی سے بھی اُس کو بہت سے سبق ملتے ہیں، اس لئے صبح سے شام تک لڑکوں کے دماغ وعقل کو مقید رکھنا کوئی دانشمندی نہیں ہے، بلکہ انگریزوں کے نزدیک ورزشی کھیلوں سے لڑکوں کی ذہانت کو ترقی ہوتی ہے، اور اُن کی عقل کو تقویت پہنچتی ہے، اُن کے سامنے ایک مدرسہ کی عملی نظیر موجود ہے جس میں تعلیم کے گھنٹے کم کرکے لڑکوں کو عملی کام سکھائے گئے، اور اس سے اُن کی قوت ادراک اور قوت فیصلہ دوگنا بڑھ گئی، انگریزوں کے نزدیک اساتذہ کی تعلیم چنداں قابل لحاظ نہیں، اصلی تعلیم وہ ہے جس کو طالب العلم خود حاصل کرتا ہے، اس خیال کی تائید کے لئے ایک نظیر موجود ہے، اور وہ یہ کہ ایک مدرسہ میں دو قسم کے طالب العلم تھے، بورڈر، اور غیر بورڈر، مہتمم مدرسہ کی تمام تر توجہ بورڈروں کی طرف مبذول تھی، اور وہ دوسرے روز کے سبق کی تیاری کے لئے اُن کے ساتھ شب بیداری کیا کرتا تھا، لیکن نتیجہ اُس کی توقعات کے خلاف نکلتا تھا، یعنی غیر بورڈر لڑکے جو غریب کاشتکاروں کے بچے تھے، اور مدرسہ کے آس پاس کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے، بورڈروں سے علانیہ ممتاز نظر آتے تھے، مہتمم مدرسہ اس حالت کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوگیا، اور اُس نے اس کے اسباب کی تحقیقات کی، تو معلوم ہوا کہ بورڈروں کو خود مہتمم مدرسہ کی تعلیم پر اعتماد رہتا تھا، اور وہ

اُس کے ہاتھ کا ایک آلہ بن گئے تھے، جس کو وہ جدھر چاہتا تھا حرکت دیدیتا تھا، لیکن یہ جھونپڑوں کے رہنے والے طلباء چونکہ بذاتِ خود تمام مسائل کی مشکلات کو حل کرتے تھے، اس لئے اُن کی ذہانت میں ترقی ہو گئی، اور اُن کو بورڈروں پر تفوق حاصل ہو گیا۔ مہتمم مدرسہ نے اس تجربہ کی بنا پر بورڈروں کو بالکل یکہ و تنہا چھوڑ دیا، اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں اپنے غیر بورڈر حریفوں کے برابر ہو گئے۔

بہرحال تمام دنیوی معاملات کی طرح ہمارے پڑوسیوں کی تربیت کا موٹو یہ ہے،

"تم خود اپنی مدد کرو تو اُستاد تمھاری مدد کرے گا"

ایڈنبرگ میں بہت سے پرائمری اسکول ہیں، جن میں طلباء کو صرف علوم کی تعلیم نہیں دی جاتی، بلکہ فطری طریقے پر اُن کی اخلاقی اصلاح بھی کی جاتی ہے، اور اس کے لئے صرف قانون و قاعدہ نہیں سکھایا جاتا، بلکہ انسانی فضیلت کی یاد دہانی کی جاتی ہے، اس لئے ان اسکولوں کے طلباء خود اپنے افعال کے حُسن و قبح کا اندازہ کرکے اُس کا فیصلہ کرتے ہیں، میں صرف ایک مثال بیان کرتی ہوں جس سے تم کو اس طریقۂ تربیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

دو چہار سالہ یا پانچ سالہ بھائی ایک دن پندرہ منٹ کی دیر کر کے مدرسہ میں پہنچے، مہتمِم مدرسہ نے اُن کی تاخیر کا سبب دریافت کیا اور یہ قرار دیا کہ اگر وہ اس تاخیر پر کوئی معقول عذر پیش کر سکے تو اُن کو سزا نہ دی جائے گی، اور عذر کی صحت اور عدم صحت کا فیصلہ جیسا کہ اس مدرسہ میں رواج ہے، اُس اعزازی عدالت پر محول کر دیا جو طلباء کے مقدمات کے لئے قائم ہے، اس عدالت کے سامنے یہ دونوں صغیر السن مجرم کھڑے کیئے گئے تو اُنھوں نے تاخیر کا یہ عذر کیا کہ اُن کو راستے میں ایک کیڑا نظر آیا جس کو اُنھوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا، وہ عجیب و غریب شکلیں بدلتا تھا جو اُن کی آنکھوں کے لئے بالکل ایک نئی چیز تھیں، وہ کبھی اپنی دُم کے بل پر کھڑا ہو جاتا تھا، کبھی زمین پر پھیل جاتا تھا، اور کبھی کُنڈلی مار کر

بیٹھ جاتا تھا، وہ یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ وہ ایک جھاڑی میں رینگ کر پہونچا اور غائب ہوگیا۔

ابھی وہ اپنا بیان ختم بھی نہیں کرنے پائے تھے کہ مہتمم نے اُن سے سوال کیا

تم نے اُس کیڑے کو مار کیوں نہیں ڈالا؟

لڑکے اُس کی طرف دیکھ کر خاموش رہ گئے اور کوئی جواب نہیں دیا، اُس نے پھر دوسرا سوال کیا۔

کیا تمھارے پاس اُس کے مار ڈالنے کے لئے کوئی چیز نہ تھی جس سے اپنی تاخیر کے سبب کا ازالہ کر سکتے؟

بڑے بھائی نے جواب دیا

"بے شبہ ہم اُس کو مار ڈال سکتے تھے لیکن اگر ہم ایسا کرتے تو یہ ایک سنگ دلی کا کام ہوتا"

اس جواب کی تمام لوگوں نے نہایت تعریف کی اور وہ دونوں بری کر دیے گئے؟

لڑکوں کے مقدمات کے فیصلہ کرنے کا یہ محکمہ اُن کے سامنے چوری کی نظیر پیش کرتا ہے جو آزادی کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے، انگریزوں کے نزدیک اگر ایسی حکومت کا قیام مقصود ہو جس کو بچے دل سے قبول کر سکیں تو اُن کو ابتدا ہی سے اس طریقہ پر اس کا خوگر بنانا چاہئے، مجھ سے اس معمر بزرگ نے کہا کہ میں کسی ملک کو اس طریقہ تربیت کے اختیار کرنے کا مشورہ نہ دوں گا جب تک وہاں کے باشندوں میں ہمارے ملک جیسی آزادی نہ پیدا ہو جائے، ہم اپنے ملک کے قانون کے لحاظ سے اُن اشخاص کے محتاج ہیں جو فطرۃً مستقل ہوں، اگر دوسرے ممالک میں ہمارے طریقہ تربیت کی پیروی کی جائے گی تو ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے، جن پر حکومت مشکل ہو جائے گی۔

بائیسواں خط

از میلانہ بنام ڈاکٹر اسہم

انگریزوں میں تقلید و استقلال کا اجتماع

کوئی کمال نقصان سے اور کوئی ہنر عیب سے خالی نہیں ہوتا، انگریزوں کے جو اخلاقی اوصاف میں نے دیکھے ہیں وہ بعض حالتوں میں اس معمر بزرگ کے بیان کے مطابق ہیں، لیکن ان اوصاف کا بغور مطالعہ مجھ کو اُن کی مبالغہ آمیز تعریف کرنے کی اجازت نہیں دیتا، میں لیڈی وارنگٹن کے یہاں جن لیڈیوں سے ملتی ہوں اُن کے متعدد بچے ہیں، اور سب کے سب اوہام و خرافات میں مبتلا ہیں، وہ اگرچہ بہت کچھ نادان ہیں تاہم ایک عام آدمی، اور ایک جنٹلمین، اور ایک عام عورت، اور ایک شریف ترین لیڈی میں وہ فرق و امتیاز کرتے ہیں، اور اپنے خدمت گزاروں پر اپنی فضیلت اور تعظیم کو ضروری سمجھتے ہیں، بڑے بڑے لوگوں کے کیرکٹر کی تقلید ان کا سب سے بڑا فخر ہے، نہ اس لئے کہ یہ ان کا مقصود ہے، بلکہ اس لئے کہ ان لوگوں نے جو اخلاقی قوانین مرتب کئے ہیں اُن میں اُن کو کوئی عیب ہی نظر نہیں آتا، واقعہ یہ ہے کہ انگریز اگرچہ نہایت آزاد ہیں، تاہم عام رائے کے سامنے اُن کی گردن نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ جھک جاتی ہے اور انگلستان میں اس کو جو اقتدار حاصل ہے وہ ملکہ وکٹوریہ کو بھی نصیب نہیں، ہمارے پڑوسی بچپن ہی سے غلام مختار پیدا کئے گئے ہیں، اس لئے عام لوگ جس چیز کی تعظیم کرتے ہیں، یہ لوگ بھی بلا غور و فکر کے اُس کی عزت کو ضروری خیال کرتے ہیں، ہر انگریز اپنے کیرکٹر اور اپنی رائے میں دوسرے کا غلام ہے، اور اُس کے اقتدار و شہرت پر اعتماد رکھتا ہے، وہ اپنی محفلوں میں بہت کم بولتے ہیں، اور عرف عام نے جو حدود مقرر کر دیئے ہیں گفتگو میں اُن سے آگے نہیں بڑھتے۔

اب تک میں نے انگریزوں سے اس قدر واقفیت نہیں حاصل کی ہے کہ ان متضاد اوصاف کی علت معلوم کرسکوں، مبا ایں ہمہ ان کے جوانوں اور بوڑھوں کے خیالات باوجود عملی استقلال کے سخت مقلدانہ ہیں، اور اُن کے بچوں کا بھی یہی حال ہے، وہ اپنے حرکات وارادہ میں نہایت آزاد ہیں، لیکن اس ارادہ کا تعلق صرف اُن ہی کاموں کے ساتھ ہوتا ہے جن میں اُن کے ماں باپ، اور گذشتہ لوگوں کی مخالفت نہیں پائی جاتی گویا یہ قوم کشتی کی طرح آزادی کے سمندر میں بہی چلی جارہی ہے، اس لئے اپنے ٹھہرنے کے لئے ایک بندرگاہ کی محتاج ہے، اور وہ بندرگاہ اُن کا خانگی اخلاق، اُن کے قومی عادات، اور مذہبی اصول ہیں۔

چوبیسواں خط

از ڈاکٹر وارگٹن بنام ڈاکٹر ارسم

امیلؔ کی ولادت کا مژدہ

میں تم کو ایک حسین لڑکے کے تولد کا مژدہ سناتا ہوں جس کی ولادت آج تین بجے صبح کو ہوئی، بعض علامات کی بنا پر مجھے کل شام کو خوف پیدا ہوگیا تھا کہ اُس کی ماں کسی مرض میں نہ مبتلا ہو جائے لیکن اپنی طبعی قوت، اور اخلاقی پاکیزگی سے وہ خطرے سے نکل گئی، اور ہمارے توقعات کے مطابق صحیح و تندرست ہے۔

پچیسواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر اراسم

انگلستان کی دائیاں اور حفاظت اولاد کے متعلق ڈاکٹر وارنگٹن کے نصائح

میں نے ایک نہایت ہوشیار دایہ کو ملازم رکھ لیا ہے، اور انگلستان میں اس قسم کی دایوں کی ایک مستقل جماعت موجود ہے جو زچہ اور بچے کی طبّی رہنمائی کرتی ہیں اور اطبّا جو علاج تجویز کرتے ہیں، اُس پر عمل کرانا ان کا فرض ہوتا ہے، خود اُن کے پاس بعض امراض کے لئے مرکب دوائیاں ہوتی ہیں جو تیر بہ ہدف ثابت ہوتی ہیں جو دایہ میں نے مقرر کی ہے، اُس میں اس سے زیادہ اوصاف موجود ہیں، وہ ایک نہایت ہوشیار اور تجربہ کار عورت ہے، اور اوصاف مادری اُس کی فطرت بن گئے ہیں، ایک بڑے شفاخانے میں وہ نرس مقرر کی جارہی تھی لیکن اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اُن لوگوں کے بقائے حیات کی خدمت انجام دوں گی جو نئے نئے دنیا میں آتے ہیں، نہ کہ اُن لوگوں کو رخصت کروں گی جو دنیا کو چھوڑ کر جانے والے ہیں۔

ڈاکٹر وارنگٹن نے چلنے سے پہلے مجھ سے کہا تھا کہ جب ولادت کا وقت قریب آئے تو اُن کو اطلاع دی جائے، چنانچہ یہ وقت آیا تو اُن کو اطلاع دی گئی، اور وہ قبل درد زہ شروع ہونے کے آ گئے، اُنھوں نے صرف یہی احسان نہیں کیا کہ اپنی طبّی قابلیت سے مجھے خطرہ سے بچا لیا، بلکہ بچے کے بارہ میں مجھے حسب ذیل مشورے دئے۔

میرے ہم پیشہ لوگوں نے تمام ممالک میں صغیر السن بچوں کی ہیبت ناک موت سے لوگوں کو متنبہ کیا ہے، اور اس عام مصیبت کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً ماں باپ کی فاقہ کشی، اُن کی بد اخلاقی، اور غربت کی زندگی، لیکن اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مائیں بچوں کی حفاظت کے طریقوں سے ناواقف ہوتی ہیں۔

تربیت اولاد کے بارے میں ہماری حالت دوسری قوموں سے بری نہیں ہے، ہماری قوم کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے، اور اب ہماری سرزمین میں اُن کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے ہم اُن کو دوسرے ممالک میں بھیجتے ہیں، اور وہاں وہ اپنی نوآبادیاں قائم کرتے ہیں اس سے تم کو معلوم ہو گا کہ قوموں کی ترقی پیدا ہونے والے بچوں کی نسبت سے نہیں ہوتی، بلکہ مرنے والوں کے تناسب سے ہوتی ہے اور میرے خیال میں اس قابلِ رشک نتیجہ کے تین سبب ہیں،

(۱) انگریزی خون میں زندگی کی صلاحیت ہے، (۲) اور عورتیں خانگی زندگی کی سخت شیدائی ہیں (۳) اور ماہرین فن کا عام لوگوں پر سخت اثر ہے، اس لئے بہت سی مشہور اطباء قوم میں پرورشِ اولاد کے خیالات پھیلاتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر وارنگٹن نے اس گفتگو کے بعد دستِ عمل بڑھایا اور میرے کمرے میں جس چیز کو غیر مرتب دیکھا اُس کو مرتب کیا، مثلاً "امیل" کا گہوارہ غلطی سے کھڑکی کے سامنے قائم کیا گیا تھا، ڈاکٹر نے اُس کو اس جگہ سے ہٹا دیا، اور کہا کہ بہت سے لڑکے اس لئے اندھے، یا احول ہو گئے کہ پیدا ہونے کے بعد اُن کو سخت روشنی میں رکھا گیا۔

اٹھائیسواں خط

ازہیلانہ بنام ڈاکٹر ار اسم

تربیت کی تعریف اور اُس کا ابتدائی اور انتہائی زمانہ

ہم کو جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں میں اُس کا گلہ نہیں کرتی بلکہ اُس کے برداشت کرنے پر فخر کرتی ہوں البتہ ہمارے بچے کے لئے وہ زمانہ آگیا کہ اُس کی تربیت شروع کریں، تو بتایئے کہ تربیت کیا چیز ہے؟ وہ کب شروع ہوتی ہے؟ اور کب اُس کا خاتمہ ہوتا ہے؟ میں آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔

دوسری کتاب

بچّے کے متعلق

پہلا خط

از ڈاکٹر اراسمس بنام ہیلیانہ

تربیت کے ابتدائی اور انتہائی زمانے کا تعین سخت مشکل ہے

تربیت کی تعریف

تم نے اپنے خط کے اخیر میں مجھ سے دریافت کیا ہے کہ تربیت کی ابتداء کب سے ہونی چاہیئے؟ اس کی ابتداء تو زمانہ ولادت سے مدتوں پہلے کرنی چاہیئے، کیوں کہ یہ یقینی طور ثابت ہو گیا ہے کہ نسل انسانی میں متعدد موروثی قابلیتیں ہوتی ہیں، جو باپ دادا سے بیٹوں اور پوتوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں وحشی کا لڑکا وحشی اور متمدن آدمی کی اولاد متمدن ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان میں آثار زندگی کے پیدا ہونے سے پیشتر بہت سے قواء موجود ہوتے ہیں، جو اس کے ملکات کے درجہ کو متعین و محدود کر دیتے ہیں جن چیزوں کو ہم فطری اور جبلی کہتے ہیں، وہ وہی چیزیں ہیں جن کو ہم نے اجتماع انسانی سے وراثتاً پایا ہے، یعنی یہ ان لوگوں کی عقل کے عملی نتائج ہیں جو ہم سے پیشتر گذر چکے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم مر کر دوبارہ دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔

ہمارے دماغ کے ایک خانے میں گذشتہ لوگوں کے اعمال و افکار کے اثر کا ظاہر ہونا ایک نسل سے دوسری نسل میں مادہ حیات کا منتقل ہونا، اور بچّے کا ان اعضاء کے ساتھ پیدا ہونا

جن کو تقدم و ترقی نے درجۂ کمال تک پہونچایا ہے، نشو و نما کے ان اسباب خفیہ میں ہیں جن کا تربیت میں خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے، لیکن چونکہ یہ اسباب ہمارے احاطہ قدرت سے باہر ہیں اس لئے ان سے بحث کرنا فضول ہے، لیکن ان اسباب کے علاوہ بہت سے طبعی حالات ہیں، جو علمی حیثیت سے قابو میں آسکتے ہیں، مثلاً علم منافع الاعضاء کے علماء یہ متعین کرسکتے ہیں کہ عورت اور مرد کے سن و سال، ان کی صحت، اور طریقہ غذا کا اثر نسل انسانی پر کیا پڑتا ہی؟ اس علم کے بہت سے مشہور علماء نے اس طرف توجہ بھی کی ہے، اور جب ان کو کافی معلومات حاصل ہو جائیں گی تو علم منافع الاعضاء بھی فن تربیت نفس کی ایک شاخ ہو جائے گا ان بیانات سے جب تم کو یہ معلوم ہو چکا کہ تربیت کی ابتدائی زمانے کی تحدید سخت مشکل ہی، تو تم پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس کا انتہائی وقت بھی متعین نہیں ہو سکتا، کیوں کہ تربیت کا تعلق انسان کی پوری مدت حیات سے ہی البتہ تربیت کی حقیقت کے متعلق میں تمہیں نہایت آسانی کے ساتھ ایک صحیح جواب دیسکتا ہوں، اور وہ جیسا کہ تربیت کے لغوی معنی سے مستنبط ہوتا ہی، یہ ہے کہ بچے کی عقل کی تکمیل، اور اس کی تمام مخفی طاقتوں اور قابلیتوں کے نمایاں کرنے اور نشو و نما دینے کا نام تربیت ہے، کیوں کہ تربیت ربا سے ماخوذ ہے، جس کے معنی زیادتی و نمو کے ہیں، لیکن چوں کہ اس تعریف میں کسی قدر ابہام ہے اس لئے میں اس کی توضیح کرتا ہوں علماء اخلاق کے نزدیک تربیت کا مقصد یہ ہے کہ انسان میں جو صفات کمالیہ موجود ہیں ان کو حاصل کر کے ایک انسان کامل پیدا کیا جائے، تربیت کا مقصد اگرچہ بظاہر عقل کے بالکل مطابق ہے، لیکن وہ بہت سے اعتراضات کا آماجگاہ بھی بن سکتا ہے، مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کامل بذات خود ایک خیالی چیز ہی، جس کا وجود واقع میں نہیں ہی، ہم نہایت آسانی کے ساتھ ایک ایسی ذات کا تصور کر سکتے ہیں جو ہزاروں خیالی اوصاف کمال کے ساتھ متصف رہی، لیکن اس ذات کو آسمان سے زمین پر کون اُتار سکتا ہے؟ لیکن مسئلہ تربیت پر یہ اعتراض اس وقت ہو سکتا تھا، جب انسان واجب الوجود ہوتا، لیکن وہ اس کے برعکس ایک تغیر پذیر ذات ہی، جس کو ایک حالت پر قیام نہیں، رحم میں اس پر مختلف

حالات گذرتے ہیں، اوراس کی زندگی اول سے آخر تک تغیرات واستحالات کی ایک مسلسل زنجیر ہوجاتی ہی اس کے بال کے رنگ میں متعدد بار کس قدر تغیرات ہوتے ہیں، جس قدر وہ بڑا ہوتا جاتا ہی، اس کے جسم کا رنگ، اس کے چہرے کی ساخت، اوراس کا ڈھانچہ کس قدر نئے نئے رنگ بدلتا جاتا ہی، خدا نے تمام زندہ مخلوقات کے دور نمو میں وقتی اعضا پیدا کئے ہیں، جو اس کے وقت کو گذر جانے کے بعد فنا ہو جاتے ہیں، اور ان کے قائم مقام دوسرے اعضا پیدا ہو جاتے ہیں، قوائے جسمانی اور ملکات نفسانی کا بھی یہی حال ہے، بچہ کھلنے سے پہلے چکھتا ہے، اور دیکھنے سے پہلے سنتا ہی، اس میں قوت حاکمہ سے پہلے قوّت حافظہ پائی جاتی ہے اور قوّت فکریہ سے پیشتر احساس کا مادہ موجود ہوتا ہے اس طرح زندگی بچپن سے لیکر جوانی تک اور جوانی سے لیکر بڑھاپے تک مختلف آنے جانے والی قوتوں کی نمائش گاہ ہوتی ہے جو ایک دوسرے کی پرورش کرتی ہیں۔

اب اس دائمی حرکت کے بعد ہمارے ٹھیرنے کا مقام کہاں ہوگا؟ اور ہم منزل مقصود تک کیوں کر پہونچ سکینگے؟ پس ایسی حالت میں تربیت کے متعلق صرف یہ لحاظ رکھنا چاہئے کہ ہر سن کی قوتوں کو بہترین طریقے سے نشوونما دی جائے، لیکن میں صرف بچپن کے زمانہ کی تربیت پر اپنی بحث کو محدود رکھتا ہوں

دوسرا خط

ازڈاکٹر اراسمس بنام سلانہ

ولادت کے ابتدائی مہینوں میں ماں کا فرض، اوراس میں عورتیں بچے کے ساتھ جو برتاؤ کرتی ہیں اس پر نکتہ چینی

ولادت کے دو پہلے ہفتوں، بلکہ دو پہلے مہینوں میں بچّے کی تربیت صرف یہ ہی کہ اس کو مودیات

خارجیہ سے محفوظ رکھا جائے، بچہ جیسا کہ علم منافع الاعضار کے علماء کا خیال ہی پیدا ہونے کے ساتھ ہی مستقل زندگی اختیار کرلیتا ہے، لیکن اس کا یہ استقلال کس قدر ضعیف ہے؟ اس میں غذا حاصل کرنے کا جو فطری مادہ ودیعت کیا گیا ہے، اس کے لحاظ سے وہ ماں کی چھاتیاں چوستا ہوا نظر آتا ہی، اس لئے وہ دوسرے کا تابع، اور اپنی ضروریات زندگی میں دوسرے کا محتاج ہی، اور اس لحاظ سے اس کا استقلال ذاتی کسی قدر مبہم اور مخفی چیز ہے، یہ غریب بچہ اندھا ہی، جب تک ٹٹول نہ لے اپنی ماں کی چھاتیاں نہیں پاسکتا، اس کے پاس دو آنکھیں ہیں، لیکن وہ ان سے نہیں دیکھتا، دو کان ہیں لیکن وہ ان سے نہیں سُنتا، دو ہاتھ ہیں لیکن وہ ان سے پکڑنا نہیں جانتا، لیکن باوجود اس ضعف و عجز کے وہ ایک بڑا فرض انجام دیتا ہے، اور وہ فرض اس کی نشوونما ہے۔

اس حالت میں ماں کا فرض صرف یہ ہی کہ وہ اس مخفی اور فطری کام میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کری، چڑیوں کی مادہ ماں کے سامنے اس بارے میں جو مثال پیش کرتی ہے وہ میرے نزدیک نہایت حیرت انگیز ہی، وہ اپنے اس زندہ ذخیرے کو لوگوں کی نگاہ سے مخفی رکھتی ہے، اور اس میں اس قدر مبالغہ کرتی ہی کہ اپنے مخفی گھونسلے کو درختوں کی شاخوں میں چھپا دیتی ہے، لیکن عورت کو اولاد کے حق کا چڑے کی اس مادہ سے بھی کم علم ہے، کیوں کہ وہ اکثر اُلفت و محبت سے اپنے بچے کو کھلونا بنا لیتی ہے، اور اس کو دوسروں کو دکھاتی ہے، اس طرح وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گردش کرتا رہتا ہے، اور ان حرکات و اشارات سے اس کے جذبات و انفعالات میں ہیجان پیدا ہوتا ہی، وہ محبت کے جنون میں اس کو طرح طرح کے لاڈ پیار سے دُکھ پہونچاتی ہی، اور اس معاملے میں اپنے دل بہلانے کا تو زیادہ لحاظ رکھتی ہے، لیکن بچے کے مصالح سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

تیسرا خط

از ڈاکٹر اراسمس بنام میلانہ

بچہ کے ابتدائی علم کا ذریعہ

لڑکے کے ابتدائی علم بذریعہ حواس کے حاصل ہوتے ہیں، حواس کی تربیت، تمدن کا اثر قوت حاسہ پر، دیہات میں امیل کے تربیت کی ترجیح کا سبب، ماں کا کام حواس کی مشق کے متعلق

زندگی کے جس دور میں ہم سب سے زیادہ تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ، وہ زمانہ ہے، جس میں ہمارے مربی ہم کو باقاعدہ کوئی تعلیم نہیں دیتے، تمام ماؤں کو معلوم ہے کہ بچہ اپنی ولادت کے پہلے دو مہینوں سے لیکر چھٹے مہینے تک تحصیل علوم میں غیر معمولی ترقی کرتا ہے، علم منافع الاعضار کے بعض علماء کو معلوم ہے کہ بچہ ابتدائی دو مہینوں سے لیکر دو یا تین سال کی عمر تک متوسط درجے کے لوگوں کی علم کا تہائی حصہ حاصل کرلیتا ہے، اور اس تعلیم و تربیت میں اگرچہ ماں کو بھی بہت کچھ دخل ہے، تاہم ان علوم کے حاصل کرنے میں سب سے زیادہ بچے کے حواس اس کو مدد دیتے ہیں، علم انسانی کا اصلی سرچشمہ یہی ہے، اور اس لئے میں تم کو خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ دلاتا ہوں۔

ولادت کے ابتدائی ہفتوں میں بچے کے اعصاب دماغی نہایت نرم و نازک ہوتے ہیں اسلئے وہ اپنے ماحول میں کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا، وہ تمام چیزوں کو دیکھتا ہی، لیکن ان میں تمیز نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ اس کو ان چیزوں کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔

کیا بچہ دیکھنا اور سننا سیکھتا ہے یا یہ چیزیں اس کو خود بخود آجاتی ہیں؟ علماء منافع الاعضار کے نزدیک اس سوال کا کوئی متفقہ جواب نہایت مشکل ہی، اس لئے وہ اس میں مختلف الرائے ہیں، تاہم وہ اس پر متفق ہیں کہ مشق و تمرین سے ان دونوں کاموں کو ترقی دی جاسکتی ہے، اور سنت الٰہی بھی یہی ہے کہ مواظبت و مزاولت سے ہر عضو کے وظایف باحسن وجوہ انجام پانے لگتے

ہیں، اور اس سے بڑھکر یہ کہ آلات علم سے کام لینے میں بچّے کو جو لذّت حاصل ہوتی ہے، وہ روز بروز اس کی انفعالی قوّت کو ترقی دیتی ہے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ تمام لذّتوں میں احساس کی لذّت قوی ترین لذّت ہے۔

بچّوں میں احساس خود بخود پیدا ہوتا ہے اس کے لئے تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی، کوئی بچّہ ٹٹولنے، چکھنے، دیکھنے، اور سُننے میں تعلیم کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ وہ فطرتاً ان کاموں کو کرتا ہے، البتہ فطرت کو ان فرائض کے ادا کرنے میں نہایت آسانی کے ساتھ مدد دی جا سکتی ہے، بلکہ میرے نزدیک بچّوں کی قوّت تقلید، دوسروں کا مقابلہ، اس کے سامنے جاذب نظر چیزوں کا وجود، اس کی حواس کو اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مدد دیتے ہیں اور ان کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں بہت سے جانور ہمیشہ اپنے بچّوں کی قوّت سامعہ و باصرہ سے کام لیتے رہتے ہیں اس کا یہ نتیجہ ہے کہ بہت سی جانوروں میں حیرت انگیز قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح وحشی لوگوں کی تربیت صرف حواس تک محدود رہتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بعض قوٰی میں ان کو ہم پر تفوق حاصل ہوتا ہے، اور عادت، ریاضت اور طرز بود و ماند سے وحشی قبائل میں بہت سے احساسات و ادراکات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو معجزہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ متمدن انسان نے اس فطری عطیہ کو کیوں ضائع کر دیا؟ تو اس کے جواب میں وہ حیوانات پیش کئے جا سکتے ہیں، جو جنگل سے پکڑ کر پالو بنا لئے گئے ہیں، یہ کس کو معلوم ہے کہ پالو خرگوش تین پشت کے بعد پتھروں کو کھود کر اپنی بھٹ بنا لینے کا فطری طریقہ بھول جاتا ہے؟ بکری کے بچّے جو اب اطاعت اور فرمانبرداری کے مثال بن گئے ہیں، ہمیشہ ایسے ہی نہ تھے، یہ ان وحشی مینڈھوں کی اولاد ہیں جو پہاڑوں میں اپنی دلیری کے جوہر دکھاتے ہیں، اور اپنے شکاریوں کا دلیرانہ مقابلہ کرتے ہیں۔

اسی طرح جب انسان تمدّنی اخلاق سے آراستہ ہوتا ہے، تو اپنی وحشیانہ زندگی کے بعض خصائص کو چھوڑ دیتا ہے، جب کہ دوسرے لوگ راتوں کو جاگ جاگ کر اس کا پہرا دیتے ہیں،

تو اُسے اپنی حفاظت کے لئے شب بیداری کی ضرورت نہیں ہوتی دور سے موذی جانوروں کی دیکھ بھال اور دو یا تین ہزار فیٹ کے فاصلے سے دشمن کے پاؤں کی آہٹ کی طرف کان لگائے کی ضرورت صرف امریکہ اور آسٹریلیہ کے اصلی باشندوں کو ہوتی ہے، لیکن ہم اس تمدّنی حالت میں اس سے بے نیاز ہیں، ہم نے ان خطرات کے لئے کانسٹبل اور چوکیدار ملازم رکھ لئے ہیں، جو دشمنوں کے خطرات سے ہماری حفاظت کرتے ہیں، اس طرح جب وحشیانہ زندگی کے خطرات تمدّن نے دور کردیئے، تو لازمی طور پر سامعہ و باصرہ کے وہ حیرت انگیز کارنامے بھی مٹ گئے جو حفاظت خود اختیاری کے لئے ضروری تھے۔

یہ سچ ہے کہ تمدّنی ترقی نے بہت سی ایسی قوتیں پیدا کردی ہیں، جن کے مقابل میں یہ وحشیانہ طاقتیں بالکل ہیچ ہیں، تاہم میرے نزدیک اس تمدّنی دور میں بھی انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اندر ان تمام قوّتوں کو پیدا کرے جو ہمارے زمانے سے پیشتر کے لوگوں میں موجود تھیں۔

بے شبہ تمدّن لوگوں کے معاملات میں استحکام پیدا کردیتا ہے، اجتماعی تعلقات کو مضبوط کردیتا ہے، اور فطرت پر غالب آکر ان مصائب کو کم کردیتا ہے، جو وحشیوں کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیتی تھیں، اس میں بھی کلام نہیں کہ پولیس ہماری جان اور مال دونوں کی حفاظت کرتی ہے، لیکن بایںہمہ حفاظت کا یہ طریقہ ہماری قوت حاسہ کو ضعیف اور مضمحل کردیتا ہے، خود متمدّن قوموں نے اس کو محسوس کرلیا ہے، اور بہت سی قدیم وحشیانہ عادتوں کو (مثلاً شکار اور کشتی وغیرہ) بلا ضرورت اب تک قایم رکھا ہے، اور یہ غیر ضروری عادتیں صرف اسلئے باقی رکھی گئی ہیں، کہ فطری قوتیں زندہ اور محفوظ رہیں، اگر کچھ لوگ راستے میں کشتی کریں تو پولیس ان کو گرفتار کرکے عدالت کے حوالے کرے گی، حالانکہ ان لوگوں نے وہی کیا ہے، جو ہمارے نوجوان طلبا اپنی ورزش گاہوں میں کرتی ہیں، میرا خیال تو یہ ہے کہ ہماری ضروریات زندگی کے انجام دینے کے لئے جس قدر آلات ایجاد کئے جائیں گے، اسی قدر ہم کو اپنی عصبی طاقت کے استعمال کی ضرورت زیادہ پڑتی جائے گی، ورنہ انسان ان آلات کی بنا پر اپنے چلنے پھرنے میں ایک عضو معطل کی حیثیت اختیار کرلے گا۔

علمی حیثیت سے ہمارے اعضاء کے نقصانات کی تکمیل کے لئے جو آلات ایجاد کئے گئے ہیں میں ان کی بہایت قدر کرتا ہوں، اور میرے نزدیک تلسکوپ ایک بہایت مفید چیز ہے، لیکن امریکہ کا ایک وحشی کنارۂ افق کے ایک نقطے کے دریافت کرنے کے لئے کسی ایسی چیز کا محتاج نہیں ہوتا ہے جو اس کی حدِ نگاہ میں طول پیدا کرے، وہ صرف اپنی جبلی عادت کی بنا پر اپنی شعاع نگاہ کو دور تک پہونچا دیتا ہے جو اس کے سامنے چیزوں کی اصلی صورتیں پیش کر دیتی ہے معینِ حواس آلات انسان سے فطری اعتماد کو بہت کچھ کھو دیتے ہیں، اور وہ اپنی اصلی طاقت کو فراموش کر دیتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں صنعتی ایجادات کا مخالف ہوں، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ تمدنی ترقیوں کو لڑکوں کے عیش پسند، بزدل، کوتہ نگاہ بنانے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ تمدنی عیش پرستیوں نے ہمارے جن فطری خصائص کو زائل کر دیا ہے کیا وہ دوبارہ حاصل کئے جا سکتے ہیں؟ تو میں اس کا جواب اثبات میں دوں گا، جنوبی امریکہ کی سیاہ فام قومیں، سفید رو قوموں کے بچوں کی تربیت کا فرض انجام دیتی ہیں، ان کی عورتیں ان بچوں کو دودھ پلاتی ہیں، اور ان کے مردان کی قوت سامعہ و باصرہ کو مشق و تمرین کے ذریعہ سے ترقی دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ امریکن بچوں کی تربیت ہمارے بچوں سے زیادہ عقل کے مطابق ہے، کیوں کہ یہ لوگ عقل سے پہلے ان میں حواس پیدا کرتے ہیں، اگرچہ پیدا کرنے کا لفظ غلط ہے کیونکہ تربیت بچے میں کوئی چیز پیدا نہیں کرتی، بلکہ اس کی اندرونی قوتوں کو نشو و نما دیتی ہے۔

اگرچہ ہماری سوسائٹی میں بھی تنبیہ احساس کے اسباب موجود ہیں، تاہم اس مصنوعی ماحول میں بچوں کو فطری ذوق بمشکل حاصل ہو سکتا ہے، اس لئے میں دیہات میں ”امیل“ کی تربیت کو ترجیح دیتا ہوں، جہاں کی ہر چیز اپنی اصلی صورت میں لڑکوں کے دماغ تک پہونچتی ہے۔

علم منافع الاعضاء کے تمام علماء، تربیت حواس کی اہمیت کے معترف ہیں، بلکہ بعضوں نے بچپن میں باصرہ، سامعہ اور لامسہ کی تربیت کے متعلق ہدایتیں بھی کی ہیں، لیکن میرے نزدیک اس قسم کی ریاضتیں بہت کم مفید ہیں، تنبیہ حواس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لڑکوں کے سامنے دلکش اور جاذب

نظر چیزیں اس طرح پیش کی جائیں کہ اس کو تعلیم و تربیت کا احساس نہ ہو، کیونکہ عملی تربیت اور عملی ریاضت اس کو تھکا کر ملول اور رنجیدہ بنا دیتی ہے، البتہ اس حالت میں ماں کا یہ فرض ہے کہ آواز شکل، رنگ اور خوشبو وغیرہ سے جو احساسات پیدا ہوتے ہیں ان کا انتخاب کرے، ان کی نوعیت اور ان کے مدارج متعین کرے، اور حالات کے لحاظ سے ان سے کام لے کیونکہ عالم خارجی کی تمام چیزیں حواس کے ذریعہ سے لڑکوں کے دماغ کے اندر داخل ہونا چاہتی ہیں، اس کے اس دروازے کو ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیئے، البتہ بوقت ضرورت لڑکے کو متنبہ کرتے رہنا چاہیئے، کہ فلاں چیز تنبہ و شعور کی مستحق ہے۔

جسمانی اور نفسانی قوتیں اگرچہ باہم مختلف اور متمائز ہیں، تاہم ان میں خاص قسم کی وابستگی ہے، ذہن میں محسوسات کی جو صورتیں آتی ہیں ان ہی سے فکر کا مادہ پیدا ہوتا ہے اس لئے تربیت حواس کا مقصد تربیت عقل ہونا چاہیئے۔

چوتھا خط

ازڈاکٹرارسم بنام ہیلانہ

بچّہ کے احساسات عالیہ

لڑکے کا یہ احساس کہ وہ حیوانات سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے اس کا تمام عالم کو حقیر سمجھنا، لڑکے میں ایک نقص ہے، بی بی کو یہ ہدایت کہ وہ "ایمیل" کی طبیعت کا اندازہ کرے، اور اس معاملہ میں مربیوں کی غفلت

لڑکا اپنے تمام علوم عالم خارجی سے حاصل کرتا ہے لیکن وہ حیوانات کی طرح صرف موثرات اجنبیہ سے متاثر ہونے پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی رو کر اپنی آزادی کا کامل ثبوت دیتا ہے، اور اس طریقہ سے اپنے درد دکھ کو دور کرتا ہے، اس کے سامنے جو لوگ اور جو چیزیں

ہوتی ہیں، اگر وہ اس کے منشار کے مطابق نہیں ہیں، تو وہ رو کر ان سے اپنی ناگواری کا اظہار کرتا ہے اور باوجود اس عجز و ماندگی کے تقدیر سے شاکی نہیں ہوتا ہے۔

ولادت کے چند ہفتوں یا چند مہینوں کے بعد وہ فضائے دنیا میں آہستہ آہستہ اپنی کانوں اور آنکھوں کو کھولتا ہے، اور قوائے عالم کی طغیانیوں کو دیکھکر کانپ اٹھتا ہے، وہ اگرچہ ان کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، تاہم وہ نہایت اطمینان کے ساتھ کرہ ارضی کا مطالعہ کرتا ہے، اور اس پر اپنی نگاہ کو دوڑاتا ہے، وہ اگرچہ اس حالت میں فطرت کا غلام ہوتا ہے، تاہم وہ ایک دن اس کا حاکم مستبد ہو جائے گا، اور اپنی مبہم الفاظ میں ماں سے سردی اور گرمی یعنی اضداد کے جمع کرنے کا مطالبہ کرے گا، بلکہ اپنی لذت و مسرت کے لئے آسمان سے چاند توڑنے کی خواہش کرے گا، چونکہ ماں اس کے سامنے نوع انسانی کی ایک زندہ مثال ہے، اس لئے وہ بھی اپنے آپ کو اس نوع کی طرف منسوب کر کے اپنے آپ کو سادہ طور پر تمام عالم کا فرمانروا خیال کرتا ہے، اور اس احساس کے سامنے مادہ کی ضخامت کا اس کی نفس پر مطلق اثر نہیں پڑتا۔

لڑکا جیسا کہ عام خیال ہے ایک سادہ صفحہ نہیں ہوتا، جو ہر قسم کے ادراک نقش و نگار سے خالی ہے، بلکہ وہ ایک نفس رکھتا ہے جس کو اپنے وجود کا احساس ہے، اور مخصوص طریقہ زندگی، اور مخصوص اختیاری احساسات، اور مخصوص قوائے فطری یہی نفس کی وجود کی دلیل ہیں، جس طرح اس کی قوت حاسہ اس میں اور اس کی ماحول کی چیزوں میں ایک قسم کا تعلق پیدا کر دیتی ہے بعینہ اسی طرح اس کا میلان طبعی اس کو ان لوگوں سے قریب کر دیتا ہے جس کے درمیان وہ زندگی بسر کرتا ہے، یہ سچ ہے کہ ابتدا میں اس کے احساسات خارجی اثرات سے پیدا ہوتے ہیں چنانچہ وہ غیروں سے اس لئے محبت کرتا ہے، ان کو دیکھکر اس لئے کہتا ہے ان سے اس لئے بات چیت کرتا ہے کہ یہ لوگ بھی اس سے محبت رکھتے ہیں، اس سے ہنستے ہیں، اور اس سے بولتے ہیں، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے اندرونی میلان اور اندرونی نفرت کا اظہار کرنے لگتا ہے، اور اس کی طبیعت کا ظہور ہونے لگتا ہے، جس پر میں دوسری جگہ بحث کروں گا، میں نے اس خط میں تربیت کے متعلق تمہارے تمام سوالات کا جواب نہیں دیا، اس وقت پر صرف یہ ہدایت ہے

کہ کامل غور و فکر کے ساتھ امیل کی نگرانی کرو، کیونکہ بہت سے لوگ لڑکوں کی نگہداشت سے غفلت کرتے ہیں۔

پانچواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر اراسم

تربیت اطفال کی متعلق ڈاکٹر وارنگٹن کی رائے

میں اگرچہ "امیل" سے غایت محبت رکھتی ہوں، لیکن یہ محبّت فرائض تربیت میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرے گی اور میں آپ اور آپ کے دُوست ڈاکٹر وارنگٹن کی ہدایتوں کو اپنے میلان قلب پر مقدم رکھوں گی ڈاکٹر وارنگٹن نے اس پر ایک نہایت جامع المقدمات دلیل کی ہے، اور نہایت فصاحت کے ساتھ مجھے یہ ہدایت کی ہو کہ

"خدا نے تمام جانوروں کے اعضا ایسے بنائے ہیں جو ان کی مدافعت کے لئے ہتھیار کا کام دیتے ہیں لیکن لڑکے کا ہتھیار صرف اوس کا چیخنا چلاّنا ہے، لیکن ان کے ذریعہ سے وہ ہمارا سخت مقابلہ کرتا ہی، اس لئے تربیت اطفال میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے، کہ ہمارا حق ان پر قایم رہے، ان کا حق ہم پر نہ قایم ہونے پائے، کیونکہ بسا اوقات باپ ماں لڑکے کی خواہش کے مطابق اس کو ایک چیز کا خوگر بنا دیتے ہیں، اور جب وہ اس کو نہیں پاتا تو اس کے لیے روتا ہی، اور اگر وہ اس کی اس خواہش کو پورا نہیں کرتے، تو وہ گھنٹوں رویا کرتا ہی، یہاں تک کہ قریب بہ ہلاک ہو جاتا ہی، اور ایسی حالت میں اس کی مخالفت اور بھی مضر ہوتی ہے، اس بنا پر لڑکے کی مرغوبات میں صرف اس وقت رکاوٹ پیدا کرنی چاہیے، جب کہ یہ رکاوٹ اس کے لئے مفید ہو، اور اس وقت ہمارا عزم و ارادہ اس قدر مضبوط ہونا چاہیئے کہ قانون کی طرح اٹل ہو۔

ساتواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر اراسم

بچوں کے اضمحلال حواس کا سبب اور علاج

بچوں کے اضمحلال حواس کا سبب خود حواس کا ضعف نہیں ہے، بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ محسوسات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، تنبہ حواس کی ضرورت، لڑکوں کو خود اپنی محافظت کا خوگر بنانا چاہئے۔

میں نے امیل کی تربیت کے متعلق تمہاری ہدایات اور تعلیمات کو یاد رکھا ہے، اس لئے نہایت کوشش کے ساتھ اس کو وہ تمام چیزیں پہنچواتی ہوں جو اس کے اِرد گرد ہیں، اور اس موقع پر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ضعف حواس سے زیادہ بچے کے اضمحلال حواس کا سبب یہ ہے کہ وہ محسوسات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، لیکن اگر اس کے کان اور آنکھ سے کام لیا جائے تو وہ اچھی طرح اشیائی خارجیہ کی آواز اور ان کے رنگ کو محسوس کر سکتا ہے، لیکن چونکہ یہ چیزیں اس کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتیں اس لئے وہ ان سے غفلت برتتا ہے، مختصر یہ کہ اس کے آنکھ اور کان صرف انہی چیزوں کے لئے بنائے گئے ہیں جن کا دیکھنا اور سُننا وہ پسند کرتا ہے، اب اس کی محبوب اور غیر محبوب چیزوں کے شناخت کا کیا طریقہ ہے؟ میں نہایت ذلت کے ساتھ اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے اکثر ان چیزوں کی شناخت میں غلطی کی ہے میں اُنکی قوت لامسہ کے لئے جن چیزوں کا انتخاب کرتی ہوں ان میں وہ ہر چیز کو ننھے ننھے ہاتھوں سے چھونا پسند نہیں کرتا، میں جن رنگوں کو بہترین رنگ سمجھتی ہوں وہ اس کی نگاہ کے سامنے سے سایہ کی طرح گذر جاتے ہیں اور وہ ان کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، میرا خیال ہے کہ مائیں اس معاملے میں لڑکے کو اپنے مذاق کا پابند بنانے پر مجبور ہیں امیل اب آفتاب پرست ہو گیا ہے، اور جب اس کو دیکھتا ہے تو اس کی روشنی کی طرف

نہایت مسرت کے ساتھ ہاتھ بڑھاتا ہے، مجھے محسوس ہوا کہ جب تک ہم لوگ اس کے ساتھ رہتے ہیں وہ ہماری حفاظت پر اعتماد کرتا ہے، اس لئے میں نے چاہا کہ خود اس کو اعتماد علی النفس کی تعلیم دوں، اور اس لئے میں نے خادمہ کو اس کے پاس سے پاس ہٹ جانے کو کہدیا، اور اس سے الگ ہو کر ایک گوشے میں چھپ گئی، اور ابتدا میں تو وہ کسیقدر گھبرایا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے دل کو مضبوط کر لیا، اور آنکھیں کھول کھول کر ہر چیز کو دیکھنے لگا، اور اپنے ہاتھوں کو اس طرح حرکت دینے لگا گویا وہ کچھی ڈرا رہا ہے، اس وقت میں نے اپنے دل سے عہد کر لیا کہ کبھی کبھی اس کی حفاظت چھوڑ دیا کروں گی اور جب اس کو یہ معلوم ہو جائے گا تو دوسروں سے بے نیاز ہونے کی تعلیم حاصل کرے گا۔

میں فرائض مادری پر غور کرتی ہوں تو مجھے اس کی جو حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ دوسری عورتوں کے فرائض مادری سے مختلف ہے، مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر امیل بڑا ہو جائے تو مجھے ہر وقت اس کی دیکھ بھال نہیں کرنی چاہیئے، بچوں کے حواس کی نشو و نما، اور انکے طبعی بے استقلالی میں اصلی رکاوٹ بھی ہے کہ نہایت اہتمام کے ساتھ ہر وقت ان کی حفاظت کی جاتی ہے جس سے وہ خود اپنی ذات کا اہتمام نہیں کرتے، اور ان کی حالت مشرقی بادشاہوں کی سی ہو جاتی ہے جو نہایت مسرت کے ساتھ اپنے ارکان دولت کو اپنا کان اور آنکھ بنا لیتے ہیں، اس لئے ایسا محفوظ لڑکا جو حفاظت کے اسباب سے گھرا ہوا ہے، کسی دن تنہا کسی خطرے میں مبتلا ہو جائے، تو وہ رنج و غم کے لحاظ سے بدترین شخص ہوگا، اور اس کی حالت اس شخص کے مشابہ ہو جائے گی جو اپنے سایہ سے ڈرتا تھا۔

امیل کے اعمال و افعال کی بنا پر مجھے ہر چیز کے متعلق غور و فکر کرنا پڑتا ہے، بچوں کے نزدیک بعد مسافت کوئی چیز نہیں ہے، اور اسی وجہ سے وہ اکثر مشاہدات میں غلطیاں کرتے ہیں، میں باغ میں تھی، اور میری خادمہ اس مکان کے جھروکے میں کھڑی تھی، جو میرے مکان کے اوپر ہی امیل اس کے سامنے تھا، اور اس نے اوپر سے مجھ کو جو نہیں دیکھا نہایت مسرت

کے ساتھ چڑیوں کے بازوؤں کی طرح اپنے ہاتھ پھیلادیئے، لیکن جب اس کے ہاتھ مجھ تک نہیں پہونچے تو اس پر حیرت طاری ہوگئی، یہانتک کہ غصّے سے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔

آٹھواں خط

ڈاکٹر اراسم بنام ہیلانہ

بچّوں کی بُری خواہشوں کے اسباب اور علاج

ہیلانہ کی رائے کی صحت کا اعتراف "امیل" کی ذوق شناسی کے متعلق، ان والدین پر نکتہ چینی جو اپنی طبیعت اور اپنے ذوق کے مطابق بچّوں کی تربیت کرتے ہیں، طبیعت کی ماہیت اور بچّوں کے احساسات ان کے اسباب اور ان کے علاج کا بیان، بُری خواہشوں کے ساتھ تربیت کے مقابلہ کی ضرورت، اور اس امر کی تشریح کہ اس مقابلے کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ بچّے کو بہلاکر وہ بھلادی جائیں، دوسری یہ کہ اس کو ان محرکات سے الگ رکھا جائے جو اس قسم کی خواہش پیدا کرتے ہیں

امیل کے طبعی ذوق کے معلوم کرنے کا تم کو جو اہتمام ہے، اس میں میں تم کو حق بجانب پاتا ہوں، عام طور پر باپ ماں اپنی اولاد کی تربیت اپنی طبیعت اور اپنے مذاق کے مطابق کرتے ہیں، حالانکہ اس سے سخت احتراز کرنا چاہئے، کیونکہ لڑکا جب مربیوں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن جاتا ہے، اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہوتا رہتا ہے تو وہ تمام باتوں میں ان کی موافقت کرنے کا خوگر ہوجاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں صحیح طور پر بہت کم مستقل آدمی پیدا ہوتے ہیں، ہماری تمام استعدادیں، ہماری مخصوص قابلیتیں، اور ہمارا مضبوط کیریکٹر روز بروز اس لئے فنا ہوتا جاتا ہے کہ ہماری ابتدائی تربیت صحیح اصول پر نہیں ہوتی۔

میں سب سے پہلے طبیعت کی حقیقت سے بحث کرتا ہوں، علماء کی اصطلاح میں اس

لفظ کا اطلاق قوائے فطریہ کے مجموعے پر ہوتا ہے، جن میں باطنی و ظاہری اسباب کی بنا پر ہمیشہ تغیر و تجدد ہوتا رہتا ہے، ان اسباب باطنیہ میں پہلا سبب ارادہ ہے جو ہمارے جذبات و خواہشات پر یک گونہ اثر رکھتا ہے، یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ خود یہ ارادہ فطری ہے یا کسبی؟ لیکن میرے نزدیک وہ فطری بھی ہے اور کسبی بھی، کیوں کہ بچے میں ولادت ہی کے وقت سے اس کا ظہور ہوتا ہے، اور جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا ہے، مشق و تمرین سے اس کو قوت حاصل ہوتی جاتی ہے، اس لئے وہ ان دونوں حیثیتوں کا جامع ہے۔

ظاہری اسباب میں متعدد اسباب ہیں، یعنی خاندان، تربیت، اور لوگوں کا میل جول، مثلاً ایک عیسائی فرنچ چین میں ایک ایسے باپ کے صلب سے پیدا ہو جس نے کونفوشیوس کی تعلیمات کے مطابق پرورش پائی ہے، تو وہ یقیناً اخلاقی حیثیت سے ہم سے مختلف ہوگا۔

جن قواء سے بچے کی طبیعت مرکب ہوتی ہے، وہ اس کی ولادت کے ابتدائی ایام میں اس کے احساسات کے پردے میں مخفی رہتے ہیں، وہ اس وقت صرف اپنی ذات کا احساس کرتا ہے، اور یہ احساس اس پر بعض اوقات نہایت غالب ہو جاتا ہے، لیکن حرکات ارادیہ کے سوا اس کا اظہار اور طریقوں سے بہت کم ہوتا ہے، ان حرکات سے وہ ہیجان، لرزش، اور وہ چیخ پکار مراد ہے جن کا ظہور بچے سے ہوتا ہے، کیوں کہ جو چیز بچے کو دکھ پہونچاتی ہے یا اس کو غصہ دلاتی ہے وہ لازمی طور پر ان خارجی علامات کو پیدا کرتی ہے، اکثر اوقات بچے سے خلاف عقل حرکتیں بھی صادر ہو جاتی ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان سے اس کا مقصد کسی لذت کا حاصل کرنا یا رنج کا دور کرنا تھا مثلاً ایک دو یا تین برس کا لڑکا جب اپنی دایہ سے ایک چیز مانگتا ہے اور وہ نہیں دیتی، تو زمین پر لیٹ جاتا ہے، اس پر لوٹنے لگتا ہے، اور غصے سے اپنے بال نوچتا ہے۔ یہ افعال اگرچہ بظاہر مجنونانہ ہیں لیکن ان کے ہیجان عصبی کے سکون کے لئے مفید ہیں، جن سے اس کا غصہ زائل ہو جاتا ہے، رونے کا مقصد بھی یہی ہے، اور اس سے بھی جسمانی تکلیف زائل ہوتی ہے۔

بڑے ہونے کے بعد بھی اس قسم کی بعض فطری حرکات باقی رہ جاتی ہیں، مثلاً بہت سے لوگ جب کوئی خبر بد سنتے ہیں تو ماتھا پیٹ لیتے ہیں، بعض لوگوں کے نتھنے پھڑکنے لگتے ہیں، بعض لوگ بستر پر لیٹ جاتے ہیں، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شدت انفعال کی حالت میں عقلمند سے عقلمند لوگ بھی ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں جو صرف پاگلوں سے صادر ہوسکتی ہیں۔

اب لڑکے کی آزادی کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ وہ اپنی فطری حرکات میں بااختیار ہو، میں اگرچہ ایسے لڑکے کا دیکھنا پسند نہیں کرتا، جس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو، انفعال نفسانی اس کو جنون کے درجے تک پہونچا دے تاہم اس غصے کی علامات کے اظہار کو اس جبر اقتدار سے کم مضر سمجھتا ہوں، جو اس غصے کے ازالہ کے لئے اختیار کیا جاتا ہے، کیوں کہ نتائج کے لحاظ سے اس قسم کا جبر بدترین چیز ہے، لڑکے کو آیندہ خود معلوم ہو جاتا ہے کہ غصے کی حالت میں ضبط موجب شرف ہے، اور گریہ و بکا، اور خفیف الحرکاتی مردوں کے لئے کسی طرح سزاوار نہیں، لیکن اس درجے تک پہونچنے کے لئے ہم کو لڑکے کے عقلی نشو و نما کا انتظار کرنا چاہئے باایں ہمہ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ لڑکوں کو انفعالی حالت میں اس لئے بالکل بالطبع چھوڑ دینا چاہئے کہ ان جذبات کے ازالہ کا اور کوئی طریقہ ہی نہیں ہے، ڈاکٹروں نے جنون کے علاج کے لئے ایک تفریحی طریقہ ایجاد کیا ہے، جس سے تربیت اطفال میں بھی کام لیا جاسکتا ہے، اور دائیاں نہایت قدیم زمانی سے اس سے واقف ہیں ہر دائی کو معلوم ہے کہ غصے کی حالت میں لڑکے کا دل کیوں کر بہلایا جاسکتا ہے، اور اس طریقہ کو بہت کچھ وسعت بھی دی جاسکتی ہے، مثلاً بہت سے لڑکے بچپن ہی سے موسیقی کا ذوق رکھتے ہیں، بہت سے لڑکوں کو جانوروں کے دیکھنے میں خاص لذت ملتی ہے، اور بہت لڑکے بعض اشخاص کو دیکھکر اس قسم کی لذت محسوس کرتے ہیں، اس لئے بچوں کے اس فطری مذاق کا لحاظ رکھنا چاہئے تاکہ ان کی طبیعت کی تربیت میں اس سے کام لیا جاسکے انسان کا کوئی خلق اگرچہ صرف برائی پر مشتمل نہیں ہے لیکن اس کے بہت سے اخلاق ایسے ضرور ہیں کہ اگر وہ اس پر غالب آجائیں تو نہایت مضر نتائج پیدا کرسکتے ہیں اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا ان کو کلیتاً فنا

کر دینا چاہیئے؟ تو میں اس کا جواب نفی میں دوں گا، کیوں کہ اگر ہم اس میں بالفرض کامیاب بھی ہو جائیں تو ہم کم از کم فطرت کی مخالفت کے گنہگار ضرور ہوں گے، ایسی حالت میں ان بداخلاقیوں کا مقابلہ دوسری خوش اخلاقیوں سے کرنا ہمارے لئے زیادہ موزوں ہوگا میرا خیال تو یہ ہے کہ ہر بگڑی ہوئی طبیعت کے اصلاح کا طریقہ بھی خود اسی کے اندر موجود ہے، اور میں اس کی تائید کے لئے صرف ایک مثال کا پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔

مجھ سے ایک چور نے بیان کیا کہ وہ ایک رات ایک جلسہ رقص وسرود میں صرف اس لئے گیا کہ اگر موقع پائے تو اپنے پاس بیٹھنے والوں کی جیب سے کچھ رقم اوڑا لے، لیکن اس رات کو بدقسمتی سے کسی نے خود اس کی رقم اوڑا لی کیوں کہ وہ موسیقی کا نہایت شیدائی تھا، اس لئے ستار کی پہلی ہی آواز نے اس کو مدہوش کر دیا، اور جب فرانس کے ایک مشہور گوّئیے نے گانا شروع کیا تو وہ ہمہ تن لذّت و سُرور میں ڈوب کر اور بھی از خود رفتہ ہو گیا، دوسری شب کو وہ اس جلسے میں پھر گیا اور یہ نیت کر لی کہ آج اپنے ہوش و حواس کو صحیح رکھے گا، لیکن وہ اس نیت کے کرنے میں اپنے موسیقی کے طبعی ذوق کو بھول گیا تھا، اس لئے آج بھی ناکامیاب واپس آیا اور اس ناکامیابی کی بنا پر یہ قسم کھائی کہ اب دوبارہ گانے کے جلسے میں قدم رکھنا بھی نہ پسند کرے گا۔

انسان کی بری خواہشوں کو اس کا فطری یا کسبی نشوونما ترقی دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کے تمام احساسات اور خیالات پر غالب آجاتی ہیں، یہی خواہشیں ہیں جن کا ابتدائے زمانہ تربیت سے مقابلہ کرنا ہمارا فرض ہے، اور یہ مقابلہ صرف دو طریقوں سے کیا جا سکتا ہے، ایک تو وہی تفریحی طریقہ ہے جو لڑکے کے دل کو ان کی طرف سے پھیر دیتا ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لڑکوں کو مُہیجات خارجیہ کے اثر سے علیحدہ رکھا جائے، کیوں کہ بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے، کہ بعض چیزوں کی اندر شیطان حلول کر جاتا ہے، وہ جو بعض حالات میں آدمی کے دل کو بہکا دیتا ہے، مثلاً ایک نہایت شرمیلی اور باوقار عورت ایک دوکان میں گئی اور بہت سی چیزیں خریدیں، قیمت دینے کا وقت آیا، تو اس نے اپنی جیب سے پانچ انگریزی گنیاں نکال کر دوکان دار کو دیں، لیکن دوکان دار نے

ان کو گنا تو وہ سب کی سب کھوٹی نکلیں، اب اس غریب عورت نے حیرت زدہ ہو کر دوسری گنیاں نکالیں لیکن بد قسمتی سے وہ بھی کھوٹی تھیں، اس حالت کو دیکھ کر دوکان دار کے دل میں شبہ پیدا ہوا اور اس نے اس کو پولیس کے حوالے کر دیا، تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ ایک گھر میں ملازم تھی جس میں اپنی خوش اخلاقی سے نہایت متدین اور باوقار سمجھی جاتی تھی، صاحب خانہ نے اس واقعہ سے چند سال پیشتر ایک شخص سے یہ گنیاں پائی تھیں، جو اس کے کمرے میں رکھی ہوئی ہیں، وہ عادتاً ہر صبح کو فرائض خدمت گذاری کے ادا کرنے کیلئے کمرے میں جاتی تھی تو ان کو دیکھتی تھی، اوّل اول تو اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، لیکن جوں جوں دن پر دن، ہفتے پر ہفتے، مہینے پر مہینے گذرتے جاتے تھے، یہ گنیاں مخفی طور پر اس کو اپنی طرف مائل کرتی جاتی تھیں، ابتدا میں تو اس نے اپنے فطری کیریکٹر کی بنا پر ان کے چرانے کا خیال اپنے دل سے دور رکھا، لیکن ان سے چشم پوشی کرنا اس کے امکان میں نہ تھا، اس لئے بار بار دیکھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے ایک دن ان کو الٹ پلٹ کے دیکھا، اور پھر ان کو اسی جگہ رکھدیا، بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ان کی ترغیبی قوت اس پر غالب آئی اور اس نے اُن کو اڑا لیا۔

خوش قسمتی سے کل لڑکے نہ چور بنتے ہیں نہ ان کی نگاہ سے کھوٹی کھری گنیاں گذرتی ہیں لیکن اور بھی بہت سی بداخلاقیاں ہیں جن کی نسبت مربیوں کو خیال رکھنا چاہیئے کہ اشیاء خارجیہ ان کو ابھار نہ سکیں، کیوں کہ خوش اخلاقی یا بداخلاقی صرف ذہنی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ ان کو خارجی امور سے قوی تعلق ہے، مثلاً حرص کا مادہ کھانے کے دیکھنے اور ان کی خوشبو کے سونگھنے سے حرکت پذیر ہو جاتا ہے اس بنا پر مربی کا پہلا فرض تو یہ ہے کہ وہ لڑکے کی طبیعت کا اندازہ کرے، اس کے بعد ان مادی اثرات کا ازالہ کرے جن کو لڑکے کے حواس اس کی بداخلاقیوں کے ابھارنے کا ذریعہ بنالیتے ہیں

مربی کو اس فطری قانون کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ جس طرح فطری قوتیں مشق و تمرین سے نشو و نما پاتی ہیں، اسی طرح وہ تعطل کی حالت میں معدوم بھی ہو جاتی ہیں، اس طریقہ سے ہم لڑکوں

کی بہت سی فطری خواہشوں کا ازالہ کر سکتے ہیں، اور ان کی ترقی کو روک سکتے ہیں۔

لیکن صرف ان مادّی موثرات سے علیحدگی لڑکے کی تربیت کے لئے کافی نہیں ہے، تربیت کا صرف یہی طریقہ ہے، ہمارا اصلی فرض یہ ہے کہ ہم اس میں مختلف طریقوں سے شریفانہ جذبات کے پیدا کرنے کی کوشش کریں، لیکن ان طریقوں سے پہلے ہم کو تربیت کے ان مختلف طریقوں سے بحث کرنی چاہئے، جو عام طور پر تربیت اطفال میں رائج ہیں، اور وہ یہ ہیں،

(۱) ۔لڑکوں میں فرمانبرداری کا مادّہ پیدا کرنا اور ان کو سزا کی دھمکی دینا،

(۲) ۔بچّوں کے سامنے دوسروں کو بطور نمونہ و مثال کے پیش کرنا،

(۳) ۔بچّوں سے مذہبی و اخلاقی قوانین کی پابندی کرانا،

نواں خط

از ڈاکٹر اراسم بنام ہیلانہ

جبری تربیت

جبری طریقۂ تربیت کی ضرورت ہے، لیکن جہاں تک جلد ممکن ہو اس سے احتراز کرنا چاہئے،

جبری اطاعت کی مضرت بچپن کے زمانے میں بچوں کے مصالح کے لحاظ سے جبری طریقہ تربیت ایک ضروری چیز ہے، بچّوں سے جب کہا جاتا ہے کہ آگے بڑھو تو وہ آگے بڑھتے ہیں، ان سے جب کہا جاتا ہے کہ فلاں کام کرو تو وہ کرتے ہیں، ان کو جب کہیں جانے سے روکا جاتا ہے تو جب تک اس ممانعت کے ساتھ کوئی عملی رکاوٹ نہیں پیدا کی جاتی وہ نہیں رُکتے، اس لئے اگر ماں بچّوں کے متعلق رفق و ملاطفت کے ساتھ اس قسم کے احکام صادر کرتی ہے، تو وہ اس پر معذور رکھی جا سکتی ہے، اگرچہ جہاں تک ممکن ہو جبر و تسلّط سے احتراز کرنا بہتر ہے۔

جبری طریقۂ اطاعت خود لڑکوں کے فطری ذوق عمل کو فنا کر دیتا ہے، کیونکہ جب ایک دوسرا

شخص اس کو خیر و شر، ظلم اور انصاف کا حکم دیتا ہے تو ان کو خود اپنے ضمیر کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس لئے ان کا شخصی ارادہ فنا ہو جاتا ہے۔

ہم کو بچوں پر جو حق ولایت حاصل ہے اس کی حقیقت کو فراموش نہیں کر دینا چاہئے، لڑکا دوسرے کے عمل سے نیک اور شائستہ نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے عمل سے نیک اور شائستہ ہوتا ہے، اس لئے ہم کو صرف اوس کے ضمیر کو سیدھے راستے پر لگانا چاہئے، اور اس کو لغزشوں سے اس طرح بچانا چاہئے کہ خود اختیار کے اندر جو اشیاء موجود ہیں، وہ اس کے لئے دلیل بنجائیں، نہ کہ ہم کو خود اپنی طرف سے طویل کے قائم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

بہت سے لوگ اسی طریقہ استدلال سے کام لیتے ہیں اور بچوں سے کہتے ہیں کہ "میں تمہے جو کچھ کہتا ہوں اس کو صحیح سمجھو، میں جو کچھ کرنے کو کہتا ہوں اس کو کرو، میں بعد کو ثابت کر دوں گا کہ حق و انصاف کا اقتضا یہی تھا" لیکن میں "امیل" کی تشفی خاطر اس طرح کروں گا کہ "میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں وہ فی نفسہ برا، یا بھلا ہے، اس لئے نہیں کہ یہ میرا خیال ہے بلکہ اس لئے کہ وہ تمام لوگوں کے لئے مفید یا مضر ہے"، تمہارے دل میں یہ بات کھٹکتی ہوگی کہ اس کے لئے بچے میں بہت زیادہ عقل کی ضرورت ہے جو لڑکوں میں بہت کم پائی جاتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے صرف ذوق سلیم، اور بھولاپن کافی ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ خوف بذات خود ایک بے اثر چیز ہے، ہر چور، ہر ڈاکو، یا ہر نافرمان لڑکا اپنے جرائم سے بچنے کی تدبیر جانتا ہے اور جب اس کو ایک بار بھی اس میں کامیابی ہو جاتی ہے تو اس کو اپنے مربی کے فریب دینے پر اعتماد کامل حاصل ہو جاتا ہے۔

ماں باپ کے لئے یہ نہایت آسان ہے کہ وہ اپنے بچے کو خود مختار بنا دیں، لیکن یہ نہایت مشکل ہے کہ اس سے اپنا کھویا ہوا اعتماد واپس لے لیں، بچے کو جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پر جبری حکومت کی جاتی ہے تو وہ جب باپ ماں کی جبری اطاعت کرتا ہے، اس وقت اگرچہ اس کے چہرہ سے انقیاد و اطاعت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنے دل میں منافقانہ طور

پرناگواری اور سرکشی کا جذبہ بھی مخفی رکھتا ہے، اور جس وقت وہ کوڑے کے سائے میں ہوتا ہے، اسی وقت مکروفریب کے لئے مناسب اوقات کا انتظار کرتا ہے۔

مکروفریب ضعیف کا ہتیار ہیں، اور چوں کہ بچہ ماں باپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس لئے وہ ان کی نگرانی سے نکلنے کے لئے طرح طرح کی حیلہ جوئی کرتا ہے، اور سات سات آٹھ آٹھ برس کے لڑکے مکروفریب میں بڑے بڑے حیلہ سازوں کا کان کاٹتے ہیں۔

جبر لڑکوں کے عیش ونشاط کو بالکل زائل کر دیتا ہے، اور اس کا اثر اس کی آئندہ زندگی پر بھی پڑتا ہے، میں آدمی کی دیکھنے کے ساتھ ہی یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ بچپن میں کس حال میں تھا، تکلیف میں یا آرام میں۔

دسواں خط

از ڈاکٹر ارا سم بنام ہیلانہ

مذہبی مسائل کی تعلیم

لڑکے کو عذاب الٰہی سے ڈرانے، اور اس کے ساتھ مذہبی مسائل پر بحث کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے، اور ان مسائل کو اس لئے چھوڑ دینا چاہیے کہ بڑے ہو جانے کے بعد وہ ایک غیر متاثر خیال کے ساتھ اس پر غور وفکر کر سکے۔

اگرچہ عام خیال کے مطابق بچوں کی طبیعت اور بچوں کے اخلاق پر مذہبی عقائد وخیالات کا نہایت گہرا اثر پڑتا ہے، لیکن میرے نزدیک اس میں بہت کچھ مبالغہ شامل ہے، یہ اعتقاد کہ انسان کو اس دنیا کے علاوہ ایک دوسرے عالم میں اپنے اعمال کا معاوضہ ملے گا انسان کو ایک ناقابل برداشت ناکامی کی مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے، کیونکہ جب انسان کے دل میں مستقبل کی نسبت شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں تو اس کا وہ عقیدہ بالکل متزلزل ہو جاتا ہے، جو اس کی تمام

فرائض اور واجبات کا سنگ بنیاد تھا، اس لئے چند ہی دنوں میں اس کی ابتدائی تربیت کے تمام ستون متزلزل ہو جاتے ہیں، پھر ایسے زمانے میں شکوک وشبہات کی گرم بازی، اور عقل کی حریت وآزادی کا زمانہ ہے، یہ کیوں کر توقع کی جاسکتی ہے کہ بڑے ہونے کے بعد یہ شبہات بچے کے عقائد کو متاثر نہ کریں گے، جب کہ وہ بچپن ہی سے اس کے دماغ میں ڈھالے جاتے ہیں، اور اس کی روح میں پیوست کئے جاتے ہیں؟

اس بنا پر "امیل" کے متعلق میری خواہش یہ ہے کہ اس کا وجدان اور اس کا احساس قوت ایمان سے الگ ایک مستقل وجود رکھتا ہو، اور جب تک میری یہ خواہش پوری نہ ہوگی میرے قلب کو اطمینان حاصل نہ ہوگا۔

میں نے اکثر عیسائیوں کو سنا ہے کہ جب ان کے بچے ان کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ غصے کی حالت میں نہایت وحشیانہ طور پر دھمکی دیتے ہیں کہ "خدا تم کو عذاب دے گا، اور تمہیں ہلاک کر دیگا" لیکن جب کبھی میں نے یہ فقرہ ان کی زبان سے سنا ہے، غصے سے میری رگوں کا تمام خون سمٹ کر میرے دل میں آگیا ہے، بچوں کے بارے میں ذلیل سزاؤں کے متعلق احکم الحاکمین سے فریاد کرنا، اور ان سے انتقام لینے کے لئے اس ہستی برتر کے سامنے شور مچانا، اور اپنے غصے کی تسکین وتشفی کے لئے خدا سے ایک بڑے کام کی خواہش کرنا، کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا ان ہی باتوں کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ علم الاخلاق کی بنیاد مذہبی عقائد پر رکھی گئی ہے؟

بہرحال میں تربیت اطفال میں خوف الٰہی کی اعانت کو شامل کرنا پسند نہیں کرتا، بلکہ بجائے اس کے کہ خدا کو ایک ڈراونی شکل میں نمایاں کیا جائے، اس سے بہتر تو یہی ہے کہ بچوں کو بھوت پلید، اور کریہ المنظر اشخاص سے ڈرایا جائے، کیوں کہ اس قسم کی دھمکیاں فرضی روایات پر مبنی ہوتی ہیں، اس لئے سن وسال کی ترقی کے ساتھ ان کا وہم زائل ہو جاتا ہے، لیکن خوف الٰہی کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے، اس لئے ممکن ہے کہ زندگی کا ابتدائی نقش ہی اس کے قوت خیالیہ میں ایک بھوت یا شیطان کی صورت میں قائم ہو جائے۔

شاید تم کو یہ خیال ہو کہ میں نے اعتراض کی غرض سے قصداً ایک ایسی مثال پیش کی ہے جو تربیت مذہبی کی بدترین مثال ہے، لیکن تربیت مذہبی پر بہر حالت میں ایک سخت اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بچے کو ایک ایسے نظام اخلاق کا پابند بنانا چاہتی ہے، جس کے علل واسباب کو وہ نہیں جان سکتا مثلاً اگر میں ایک بچے سے کہوں کہ "تم کو باادب اور ہوشیار ہونا چاہئے، تاکہ تم خدا کے نزدیک محبوب ہو جاؤ" میرا یہ قول اس کے لئے ایک معمّا یا ایک چیستاں ہوگا، کیوں کہ وہ نہیں جانتا کہ خدا کیا چیز ہے؟ اور اس کی رضامندی اور ناراضی کی کیا علامت ہے؟ لیکن اگر میں اس سے یہ کہوں کہ "تم کو باادب ہونا چاہئے، تاکہ تمہاری ماں تم سے محبت کرے" تو وہ محبت کی اس علّت کو بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھ سکے گا۔

جو شخص صغیر السن بچے کے ساتھ مذہبی معاملات پر گفتگو کرتا ہے، وہ خود ان مذہبی خیالات کے اصل مفہوم ہی کو بدل دینا چاہتا ہے، مثلاً اگر ماں اپنے بچے کو آسمان کی طرف اشارہ کرکے بتائے کہ خدا کا پایہ تخت یہی ہے، اور دعا کے وقت اسی کی طرف رخ کرنا چاہئے، تو وہ یہ خیال کرے گا کہ خود یہی مادی آسمان اس کا خدا ہے۔

بہت سے ماں باپ اپنے بچوں کو ان مذہبی اعمال کا پابند بنانا چاہتے ہیں، جن کے وہ خود پابند نہیں ہوتے، یا صرف بچوں کے سامنے ان کی پابندی کرتے ہیں، بقیہ اوقات میں ان سے سروکار نہیں رکھتے، گویا ان کے خیال میں لڑکوں کے نزدیک صحت اور غلطی کوئی چیز نہیں، ان کی ابتدائی زندگی کے کارناموں کا دیباچہ صرف یہ ہے کہ وہ مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کرکے صرف عام لوگوں کی تقلید کرتے ہیں، اس قسم کے والدین اپنی خفیف الحرکتی، اپنی بے پروائی، اور اپنی بے اعتنائی سے اپنے بچوں کے احساس اور ان کی قوت فیصلہ کو تباہ کر دیتے ہیں، لیکن میں تو ان مذاہب سے پناہ مانگتا ہوں، جن کے متبعین کی حالت ان لوگوں سے مشابہ ہوتی ہے جو یا تو سرے سے ایمان ہی نہیں لائے ہیں، یا ایمان تو لائے ہیں مگر ان کا ایمان کامل نہیں ہے، میرے نزدیک انسانی شرف کے لئے اس قسم کے مذاہب سخت خطرناک چیز ہیں۔

پس ایبل کی عزت، اور ان چند مسائل کے تصرف کے لحاظ سے جن پر اس کو بڑے ہو جانے کے بعد ایک غیر مقلدانہ خیال کے ساتھ غور کرنا چاہیے، میری یہ خواہش ہو کہ اس کو ابتدائی تربیت میں مذہبی مسائل پر غور و فکر کرنے سے بچایا جائے، کیونکہ ہم اس کی عقل، اور اس کے ضمیر کی آزادی کے امانت دار ہیں، اور ہم سے ان کا مواخذہ کیا جائے گا اس لئے اگر ہم نے اس کو فطری قوت سے محروم کر دیا تو خود اپنی امانت کو ضائع کیا۔

گیارہواں خط

از ڈاکٹر اراسمس بنام ہیلانہ

تربیت میں اصول علم اخلاق غیر مفید چیز ہیں

جن لوگوں نے فن تربیت پر لکھا ہے، انہوں نے علم الاخلاق کے اصول کو مبالغہ آمیز طریقہ پر اہمیت دی ہے، اور مجھ کو بھی اس سے انکار نہیں کہ بعض حالات میں پند و موعظت سے انسان کو نیک کاموں کی ترغیب ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ میرا خیال یہ بھی ہے کہ بچے اپنے اساتذہ سے جن اخلاقی اصول کی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ ان کی طبیعت میں کوئی حقیقی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتے، ہم کو انسانی سوسائٹی میں بہت سے سنگدل لوگ نظر آتے ہیں، جن کے کان رحم و محبت کی اخلاقی نصیحتوں سے نا آشنا نہیں ہیں، ہم میں بہت سے بدکار، بہت سے بدمعاش، اور بہت سے بخیل موجود ہیں، جنھوں نے واعظوں سے اس قسم کی اخلاقی نصیحتیں سُنی ہیں کہ "تم ایک مہذب حلیم بنو، اس طریقہ سے تم ایک قابل رشک معزز آدمی بن جاؤ گے،" "انچہ بر خود نہ پسندی بدیگراں ہم مپسند"، "حطام دنیوی کو دل میں جگہ نہ دو،" لیکن ان پر ان کا کیا اثر ہے؟ انجیل بہترین اخلاقی نصائح کا مجموعہ ہے، لیکن ان پر کون عمل کرتا ہے؟ ہمارے دولت مندوں نے انجیل کا یہ فقرہ

"سوئی کے ناکے میں اونٹ کا داخل ہونا اس سے آسان ہے کہ آسمانی بادشاہت میں متمول داخل ہو،"

بارہا سنا ہے، لیکن کیا اس کے سننے کے بعد اپنی تمام دولت فقرار پر تقسیم کر دی ہے؟ کیا خود پادریوں کی ایک جماعت دینار و درہم کی پرستش پر خدا کی پرستش کو ترجیح دیتی ہے؟ کیا حاکم لوگ آسانی کے ساتھ محکوم بن سکتے ہیں؟ حاشا و کلاّ! خود علمار دین اس بارے میں اپنے نفس کو دہوکا دیتے ہیں، اور کتاب مقدس کی آیتوں کی تاویل کرتے ہیں، تاکہ وہ خود ان کے لئے واجب العمل نہ بن جائیں۔

مسیح علیہ السلام نے اپنے تمام اقوال میں صلح کا پیغام دیا ہے، لیکن کیا تمام ممالک میں جنگ و جدال کا خاتمہ ہوگیا؟ انہوں نے مواخات کی تعلیم دی ہے اور فرمایا ہے ''تم سب کے سب بھائی بھائی ہو''، لیکن کیا اس تعلیم نے غلامی کا سدّباب کر دیا ہے، اور نفوس انسانی سے تسلّط و اقتدار کا اثر زائل ہو گیا؟ جو لوگ ظلماً و عدواناً تلوار کھینچتے ہیں انہوں نے ان کو ہلاکت کی دھمکی دی ہے اور فرمایا ہے ''جس نے ظلم کی تلوار کھینچی وہ اسی سے قتل کر دیا جائے گا''، لیکن کیا اس دھمکی نے طاقتور لوگوں کو بغی و فساد سے روک دیا؟ انہوں نے فرمایا ''جو شخص تمہاری قمیص چھیننا چاہتا ہے، اس کو اپنی چادر بھی دیدو''، لیکن اگر سخت سے سخت مذہبی فریخ بھی اس پر عمل کرے تو اس کو سزائے قید دی جائے گی۔

صرف عیسائیوں کی خصوصیت نہیں، یہودی، چینی، اور پارسی سب کے یہاں اس قسم کے نصائح کا مجموعہ موجود ہے، لیکن ان کی حالت کچھ ہم سے بہتر نہیں ہے، اس بنا پر اگر دنیا کی اخلاقی اصلاح کے لئے اخلاقی کتابیں مفید ہوتیں، تو دنیا اب تک معراج کمال کو پہونچ گئی ہوتی، حالانکہ ہم کو دنیا کے گوشے گوشے سے مصیبت زدہ لوگوں کی دردناک آوازیں سنائی دیتی ہیں،

میرے نزدیک انسان کے مذہب اور اس کے عمل میں باہم کوئی تعلق نہیں ہے، جو لوگ مسیح پر ایمان نہیں لائے ہیں وہ ان کے اصول اخلاق پر ان لوگوں سے زیادہ عمل کرتے ہیں جو ان کو خدا مانتے ہیں، لیکن بااینہمہ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ علم اخلاق بالکل غیر مفید چیز ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس سے کامل ترین اشخاص نہیں پیدا ہو سکتے، اور خود بانیان مذاہب نے

اس نکتہ کو سمجھ لیا ہے، اس لئے انہوں نے اصول اخلاق کی تلقین کے ساتھ ثواب کی بشارت اور عذاب کی دھمکی بھی دی ہے، اس کے علاوہ جب تک بچے میں کافی استعداد اور کافی قابلیت، موجود نہ ہو، وہ ان اصول سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، لیکن اس کے احساسات اور فطری جذبات اس قابلیت کو معدوم کر دیتے ہیں، اس کے سامنے وہ تمام نمونے، اور تمام مثالیں کیوں کر آسکتی ہیں، جو اس کے دل کو برائی سے پھیر کر صرف نیکی کی ترغیب دیتی ہوں ؟ ہاں اس کو جن محاسن اخلاق کی تعلیم دیتی ہے کیا وہ ہر حالت میں خود ان پر عمل کرتی ہو؟ باپ بچے کو فقراء کے ساتھ ہمدردی اور احسان کی تعلیم دیتا ہے لیکن جب وہ کسی محتاج کو چاندی کا ایک درہم دیتا ہے تو وہ اس کو لعنت ملامت کرتا ہے، اس طرح وہ اصول اخلاق کی تعلیم کے ساتھ اس کو نفاق وریا کی بھی تعلیم دیتا ہے۔

بارہواں خط

ازڈاکٹر اراسم بنام ہیلانہ

امثلہ وقصص

نمونہ ومثال کا فائدہ اور اس کی شرط، جانوروں کے قصوں کا اثر تربیت اطفال پر، بچوں کا استقلال طبعی، اور جانوروں کے اخلاق کی بذات خود تعلیم

علمائے اخلاق تربیت اطفال میں اکثر نمونہ ومثال کے اخلاقی اثر پر بہت کچھ اعتماد کرتے ہیں اور میں بھی اس بارے میں ان سے متفق ہوں، لیکن کون باپ دائمی طور پر لڑکی کے لئے اسوہ حسنہ بن سکتا ہے ؟ ہم لوگ بہر حال لڑکوں کو فریب دیتے ہیں، اور ریاکاری سے ان کے سامنے اپنے آپ کو اپنی حقیقی اور واقعی حالت سے بہتر صورت میں پیش کرتے ہیں، اور ہمکو اپنی ذات سے جو حسن ظن ہے اس کی بنا پر ان کو خود اپنے قالب میں

ڈھالنا چاہتے ہیں، اور ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی ان اوصاف کے ساتھ متصف ہو جائیں جن کے ساتھ ہم خود متصف ہیں، لیکن بچّے اس فریب میں نہیں آسکتے، اور جو شخص ان سے اس کی توقع رکھتا ہے، اس نے ان کی سادگی اور بھولے پن کی حقیقت نہیں سمجھی ہے، بچّے اپنے باپ ماں کے مقاصد اور ان کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں، اور جن چیزوں کو وہ ان سے مخفی رکھنا چاہتے ہیں ان کو جان لیتے ہیں، اور باپ ماں کی یہ پردہ داری اگرچہ ایک عمدہ چیز ہے، تاہم اس سے بچّوں کے دل میں ان کا کوئی وقار نہیں قائم ہوتا۔

ایک باپ نے اپنے پنج سالہ بچّے کو جھوٹ بولنے پر سزا دی، وہ ابھی سزا دے ہی رہا تھا کہ اسی حالت میں خادم نے اس سے کہا کہ ایک شخص آپ کی ملاقات کا منتظر ہے، اس باوقار آدمی نے جواب دیا کہ جا کر کہدو کہ "وہ گھر میں نہیں ہیں" تو کیا اسی قسم کے نمونے سے بچہ "صداقت اور راستبازی کی تعلیم حاصل کرسکتا ہے؟

مجھے اگرچہ یقین ہے کہ تم "امیل" کے لئے بہترین مثال ہو، تاہم میں اس کو کسی غیر کے قالب میں ڈھالنا پسند نہیں کرتا اس کی تربیت سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ خود ایک مستقل طبعیت کا آدمی ہو، ایک تازہ واقعہ سے جو مجھ کو ابھی یاد آیا ہی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ میرا یہ مقصد کس قدر صحیح ہے۔

میں نے ایک شش سالہ بچّے کو دیکھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک جنازہ کی مشایعت کرکے روتا ہوا واپس آرہا ہے، میں نے اس سے رُونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ "میں نے اپنی ماں کو رومال سے آنسو پوچھتے ہوئے دیکھا اس لئے رو پڑا"، مجھ کو اس کے اس مقلدانہ اثر پذیری پر ہنسی آگئی، اور میں "امیل" کے اندر اس قسم کی تاثر پیدا کرنا نہیں چاہتا۔

کیا جانوروں کی اخلاقی خصوصیات کو بھی نمونہ و مثال کے ساتھ ملحق کیا جاسکتا ہے؟

تیرہواں خط

ازڈاکٹر اراسمس بنام ہیلانہ

تربیت حواس باطنی کا طریقہ

ابتدا میں بچّہ صرف اپنی ذات سے محبت کرتا ہے، اور چوں کہ لوگوں سے میل جول کی قدرت نہیں رکھتا اس لئے ان سے بیزار اور علیحدہ رہتا ہے، اس حالت میں مربّی کا فرض یہ ہے کہ اس کی بہترین فطری قوتوں سے کام لے کر، اس میں آہستہ آہستہ ایسے جذبات پیدا کرائے جو ذاتی محبت اور لوگوں کی علیحدگی اور بیزاری کے جذبات سے زیادہ بلند ہوں، اس قسم کے جذبات محض خیالی اور ذہنی نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک حقیقی چیز ہیں، جن کے لئے عالم مادیات اور عالم روحانیات دونوں میں اصول و قواعد مقرر ہیں، اس بنا پر تمام روحانی جذبات عالم مادی میں خاص قسم کے سلسلہ واقعات سے ربط و تعلق رکھتے ہیں، مثلاً غیروں کی مصیبت دیکھ کر جذبہ رحم ابھر جاتا ہے بھلائی اور احسان سے شکر گزاری کا مادہ پیدا ہوتا ہے کسی مقام پر مدت تک قیام کرنے سے حب وطن کی تولید ہوتی ہے، اور حسن معاملت و حسن معاشرت سے انسانوں کی باہمی محبت ترقی پاتی ہے۔

بچّوں میں تمام شریفانہ جذبات، اور شریفانہ اخلاق و عادات پائے جاتے ہیں، لیکن جس طرح بیج کے اندر شاخیں اور تنے مخفی ہوتے ہیں، اسی طرح وہ بچّوں کے اندر مخفی ہوتی ہیں، لیکن بسا اوقات بیج کو کافی حرارت، کافی رطوبت، اور عمدہ زمین میسّر نہیں آتی، اس لئے اس میں روئیدگی نہیں ہوتی، بعینہٖ یہی حال انسانی جذبات و احساسات کا ہے، کہ وہ اپنے ظہور میں مناسب حال اور مختلف موثرات خارجیہ کے محتاج ہوتے ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ محرکات نفسیہ سے زیادہ موثرات خارجیہ سے لڑکوں کے طبیعت کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے، کیوں کہ ماں کی تمام افعال و اقوال اس کے دل میں کبھی مسرت اور کبھی رنج پیدا کرتے ہیں، اور یہ اس محبت اور

اور اس توجہ کا نتیجہ ہے جس کا ماں اس کے ساتھ اظہار کرتی ہے، لیکن طبیعت مختلف قوائے متمائزہ سے مرکب ہوتی ہے، یہاں تک کہ انسان کا نفس بہ نسبت اس کے جسم کے زیادہ اجزاء سے مرکب ہوتا ہے، اس لئے ہر قوت اپنے ظہور کے لئے ایک مستقل محرک کی محتاج ہوتی ہے، اثر پذیری کے لحاظ سے حواس باطنی اور حواس ظاہری کا بالکل ایک حال ہے، کیوں کہ جس طرح حواس ظاہری مخصوص خارجی حالات سے متاثر ہوتے ہیں، مثلاً قوت لامسہ کسی جسم سے ملکر، اور قوت ذائقہ کسی غذا کو چکھ کر اثر پذیر ہوتی ہے، اسی طرح حواس باطنی میں بھی خاص خاص اسباب کے کسی اجتماع سے برانگیختگی پیدا ہوتی ہے، مثلاً خطرات کے پیش آجانے سے صرف خوف کا احساس پیدا ہو سکتا ہے، عدل و انصاف کا جذبہ نہیں پیدا ہو سکتا، ماں باپ کے احسانات لڑکے کے دل میں ان کی محبت تو پیدا کر دیتے ہیں، لیکن اس میں وقار اور خاکساری کا مادہ نہیں پیدا کر سکتے، جس طرح آواز کا اثر آنکھ پر اور روشنی کا اثر کان پر نہیں پڑتا، اسی طرح جو حالات بچے کے دل میں مروت اور شجاعت کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں، وہ اس میں لطافت اور رقت نہیں پیدا کر سکتے، بہر حال ہر خانہ باطنی ایک خاص محرک کا محتاج ہوتا ہے، اور لڑکا ستار کی طرح ہمہ تن تاروں کا ایک مجموعہ ہے جن کے چھیڑنے سے ان میں حرکت پیدا ہوتی ہے، لیکن وہ صرف اشیاء خارجی کے چھیڑنے سے حرکت میں آتے ہیں، اور ہر چیز سے یکساں طور پر متاثر نہیں ہوتے، بلکہ ہر اندرونی احساس کے لئے خاص خاص محرکات ہیں جو ان سے مناسبت رکھتے ہیں۔

مثلاً ہم کو ایک لڑکے کے دل میں محتاج اور اپاہج لوگوں کے ساتھ احسان کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ہے، تو اس کو ایک نہایت ہی ذلیل جھونپڑی میں لے جانا چاہئے، جس میں اس کو ایک معمر، ضعیف، اور مریض بڈھا چٹائی پر لیٹا ہوا، اپنے عیادت گزاروں سے ہاتھ پھیلا کر سرد پانی کا ایک پیالہ مانگتا ہوا نظر آئے، اب ہم کو بغور دیکھنا چاہئے کہ اس قابل رحم حالت کا لڑکے پر کیا اثر پڑتا ہے، اگر وہ اس کے پانی پلانے کے لئے آگے نہیں بڑھتا تو ہم کو اس

کے دل میں اس شریفانہ جذبہ کی تولید سے مایوس ہو جانا چاہئے، لیکن اگر وہ اس نیک کام کے لئے مسابقت کرتا ہے تو ہم کو اس قسم کے سوالات نہیں کرنے چاہئیں کہ اس کام سے اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا وہ ثواب اخروی کی توقع رکھتا ہے؟ کیونکہ ان نیک جذبات میں اگر ذرہ برابر بھی ذاتی اغراض کی آمیزش ہو جائے، تو لڑکے پر اس کا مضر اثر پڑے گا۔

اس تقریر سے تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ حواس باطنی کی تربیت میں ہمارا فرض صرف اس قدر ہے کہ ہم محرّکات خارجیہ کے ذریعہ سے بچّے کے شریفانہ جذبات، مثلاً رحم، محبّت، فیاضی، اور عزّت نفس، وغیرہ کو بیدار کرتے رہیں، کیونکہ حواس باطنی کی تربیت کا طریقہ حواس ظاہری کی تربیت سے مختلف نہیں ہے بلکہ دونوں کا ایک اصول، ایک قاعدہ اور ایک قانون ہے، البتہ دونوں میں صرف ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ اشیائے خارجیہ سے حواس باطنی ہمیشہ اور ہر حالت میں متاثر نہیں ہوتے، اور حواس خارجی ان سے لازمی طور پر ہمیشہ متاثر ہوتے ہیں، مثلاً آنکھ پر جن چیزوں کا ہمیشہ اثر پڑتا ہے، نفس پر نہیں پڑ سکتا، اس لئے ماں کا یہ فرض ہے کہ بچّے کے دل میں جس قسم کے جذبات پیدا کرنا چاہتی ہو، اس کی مختلف قسمیں اور مختلف شکلیں قرار دے اور مناسب اوقات میں بچے کے دل میں ان کا احساس پیدا کرائے، کیوں کہ انسانی زندگی مؤثرات کا ایک طویل سلسلہ ہے، اس میں ہر وقت ایسے مصائب پیش آتے رہتے ہیں، جو جذبہ رحم کو ابھارتے رہتے ہیں انسان کو ایسی دشواریوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

جو اس کو بہادر بننے پر مجبور کرتی رہتی ہے، ایسی تکلیفوں سے اس کو دوچار ہونا پڑتا ہے، جو اس کو صبر و ثبات کی تعلیم دیتی رہتی ہیں، غرض مؤثر واقعات کی کمی نہیں ہے، صرف ماں کو ہوشیار اور خوش مذاق ہونا چاہئے کہ وہ ان مواقع سے فائدہ اٹھائے۔

لڑکا چونکہ انہیں چیزوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اس پر اثر ڈالتی ہیں، اس لئے اس کے جذبات کے ابھارنے کے لئے ماں تدبیر و حیل سے بھی کام لے سکتی ہے، لیکن اس کا خاص اہتمام کرنا چاہئے کہ بچّوں کو ان حیلوں کا علم نہ ہو، ورنہ اس کا احساس سخت مضر نتائج پیدا کرے گا،

اعضاء جسمانی کی تقویت کے لئے بہت سی جسمانی ورزشیں ایجاد کی گئی ہیں، لیکن میں تم کو روحانی ورزش کا طریقہ بتاتا ہوں، جس سے اخلاق اور ملکات کو قوت حاصل ہوتی ہے ہمارے تمام عیب و ہنر مشق و تمرین سے ترقی پاتے ہیں، مشہور مثل ہے کہ "لوہا کوٹ کر انسان لوہار بن جاتا ہے"، اسی طرح وہ نیکی کر کے نیک آدمی بھی بن سکتا ہے، میں اس وقت اخلاقی قانون کو نظر انداز کرتا ہوں، اس کی بحث اس کے مناسب مقام پر آئے گی، لیکن اس موقع پر صرف ایک اخلاقی اصول بیان کرنا کافی سمجھتا ہوں جو نہایت مختصر اور سادہ ہے، اور وہ یہ کہ جب تک بچے کے خود غرضانہ جذبات فنا ہو کر ان کی جگہ نفع عام کا احساس نہ پیدا ہو جائے اس کی طبعی اور روحانی اصلاح نہیں ہو سکتی، لیکن بچہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس کو دوسروں کے ساتھ کیا کرنا چاہئے، بالخصوص فرائض کی حقیقت تو اس کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی، اس کو صرف اس قدر سمجھایا جا سکتا ہے کہ فرض وہ ہے کہ جس کے کرنے سے خود اس کو مسرت حاصل ہو، اور دوسرے بھی اس کو پسند کریں، لیکن اگر بچے کو نیک کاموں میں وہی لطف آنے لگے جو بُرے کاموں میں آتا ہے، اور ہم اسباب خارجیہ کے ذریعہ سے اس کی تھوڑی سی اعانت کر دیں، تو وہ نیک کاموں کو بُرے کاموں پر ترجیح دینے لگے گا۔

حواس باطنی کی تربیت میں بچے کی اعانت ہمارا ضروری فرض ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہم کو بچے کے قصد و ارادہ کا بھی احترام کرنا چاہئے، مثلاً اگر مجھ کو "امیل" کی اخلاقی نگرانی کا موقع ملے، اور ان محرکات پر مجھے پوری قدرت حاصل ہو جو اس کے ارد گرد موجود ہیں، اور اس طرح میں اس کی روحانی تربیت کا ایک جدید طریقہ ایجاد کر سکوں، تو با ایں ہمہ میں اس کو پسند نہ کروں گا، کیونکہ میں اس کو ایک نہ ایک دن نیکی کرنے والے آدمی کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں، بھلائی کرنے والے جانور کی صورت میں دیکھنا نہیں چاہتا، میں اس سعادت سے پناہ مانگتا ہوں جو خود اس کی کوشش اور ہمت سے حاصل نہ ہو، اگر انسان نے اپنے ارادہ و اختیار کو بیچ کر یہ سعادت خریدی ہے تو اس کو نہایت گراں قیمت دینی پڑی ہے، ہم

سوسائٹی کے اندر ایک میدان جنگ میں کھڑے ہیں، اس لئے ہم کو لوگوں کی رایوں کا، لوگوں کی تقلیدوں کا، اور زمانے کے تمام فریب دہ موثرات کا بہادرانہ مقابلہ کرنا چاہئے، انسان کی فضیلت صرف یہی کہ وہ صاحب ارادہ اور صاحب اختیار ہے، اس لئے اگر انسان ایک مستقل وجود ایک مستقل ضمیر نہیں رکھتا تو اس کی زندگی کا شرف کیا ہی؟

چودہواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر اراسم

بچوں میں شناخت محبت کا حاسہ

تربیت نفسانی کے اس طریقے سے اتفاق، لڑکوں میں ایک عجیب وغریب حاسہ کا وجود جس سے وہ نقلی اور اصلی محبت میں فرق وامتیاز کر لیتے ہیں

میں نے آپ کی تربیت روحانی کا یہ طریقہ سمجھ لیا، اور اس کی تکمیل میں جو دشواریاں پیش آنی والی ہیں ان کے تصور سے کانپ اٹھتی ہوں، لڑکوں سے ان کاموں کا کرانا جو ان کو کرنا چاہئیں، نہایت آسان ہے، لیکن ان محرکات کی جستجو جو ان میں نیک کاموں کی تحریک پیدا کریں ازبس مشکل ہے، تاہم میں اس طریقے پر عمل کروں گی، کیوں کہ میرا یہ یقین ہی کہ پند ونصائح سے بچوں کی تربیت نہیں ہو سکتی، بلکہ میرے نزدیک پند ونصائح سے لڑکوں کے شرف اور ان کی اصلی قدر وقیمت کو سخت نقصان پہونچتا ہے، اور وہ اس سے زبانی باتوں میں فضیلت کے تلاش کرنے کے خوگر ہو جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ میں ابھی ”امیل“ کے ساتھ اخلاقی گفتگو کر بھی نہیں سکتی، کیونکہ وہ اس کی سمجھنے سے عاجز ہے، البتہ مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اس کمسنی میں بھی وہ ایک مذہب رکھتا ہی، چنانچہ اس کو جو کھلونے دئے جاتے ہیں ان کو وہ اپنا خدا بنا لیتا ہے، اور خاص طور پر ان سے محبت

رکھنا ہے، ایسی حالت میں اگر میں ان میں تغیر پیدا کرنے کی کوشش کروں تو مجھے صرف اس قدر کامیابی ہوگی کہ ایک بت کو دوسرے بُت سے بدل سکوں گی۔

لڑکوں کے احساسات جیسا کہ آپ کا خیال ہے نہایت ناکمل ہوتے ہیں، تاہم لڑکوں میں ایک عجیب و غریب حاسّہ پایا جاتا ہے، جس سے وہ اصلی اور نقلی محبّت میں فرق و امتیاز کر لیتے ہیں، جو لوگ ان سے محبت رکھتے ہیں وہ بھی ان سے محبّت رکھتے ہیں، لیکن مصنوعی لاڈ پیار کے فریب میں نہیں آتے، مجھے لیڈی وارنگٹن کے یہاں اکثر ایک عورت سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے جو ایام شباب ہی میں بیوہ ہوگئی ہے، وہ بچّوں سے عشق رکھتی ہے، اور کہتی ہے کہ کاش خدا نے مجھے ایک ہی بچّہ دیا ہوتا، اس کا بیان ہے کہ جب وہ اس پر غور کرتی ہے تو اس پر غشی طاری ہو جاتی ہے، لیکن با ایں ہمہ اس کے پہلو میں وہ دل نہیں ہے، جو ایک ماں کے پہلو میں ہوتا ہے، اس لئے "امیل" اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

بے شبہ ہم پر موثرات خارجیہ کا اثر پڑتا ہے، ورنہ میں ان راستوں میں کیوں سیر کرتی جس میں مجھ کو تمہارا خط ملتا ہے؟ جب میں غمزدہ ہوتی ہوں تو بہت سے درخت مجھے اپنے سائے کے نیچے بیٹھنے کی دعوت دیتے ہیں، میں چٹانوں کو دیکھ کر اپنے عزم و استقلال میں جو ضعف محسوس کرتی ہوں اس کو بیان نہیں کر سکتی۔

اٹھارہواں خط

از ڈاکٹر ارasم بنام ہیلانہ

بچّوں کو زبانوں کی تعلیم

لڑکوں کی قوت فکریہ، اور زبانوں کی اصل، لڑکوں کو زبان کی تعلیم اور اس کے متعلق مربیوں کا غلط طریقہ۔

مربیوں کی یہ عام غلطی ہے کہ وہ اپنی توجہ تمام تر قوائے دماغیہ اور ملکات عقلیہ کی طرف مبذول کر دیتے ہیں، اور ان کے علاوہ دوسری قوتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، لیکن اس خط میں میں تم کو حاسۂ عقلی کی تربیت کا ایک خاص طریقہ بتانا چاہتا ہوں۔

تم یہ سوال کر سکتی ہو کہ کیا لڑکا غور و فکر کرتا ہے؟ لیکن جب علمی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حیوانات اور نباتات تک میں، احساس بلکہ ادراک و تعقل کا مادّہ پایا جاتا ہے تو کیا لڑکا ان سے بھی کم رتبہ ہے؟ یہ سچ ہے کہ ولادت کے چند ابتدائی ہفتوں میں لڑکے کا دماغ اس تیرۂ تاریک صحرا سے مشابہت رکھتا ہے، جس میں ایک لیٹن شاعر کے تخیل کے بموجب صرف بھوت پلید رہتے ہیں، لیکن وہ آہستہ آہستہ اشیاء میں تمیز کرنے لگتا ہے، ان میں باہم موازنہ کرتا ہے، اور ان سے بعض احکام مستنبط کرتا ہے، چنانچہ پانچویں یا چھٹے مہینہ میں وہ ایک آدمی کو دیکھ کر یہ غور کرنے لگتا ہے کہ اس کی صورت میری جانی پہچانی ہوئی تو نہیں ہے؟

جن اسباب سے لڑکے کی عقلی نشو و نما ہوتی ہے ان میں ایک سبب زبان کی تعلیم بھی ہے، لڑکا ہم سے صرف چند آواز سیکھتا ہے، اس لئے اگر ہم اس سادہ تعلیم کو مفید بنانا چاہتے ہیں، تو ہم کو ان الفاظ کو ان کے مدلولات سے دست و گریباں رکھنا چاہئے۔

تم کو یاد ہوگا کہ میرے پاس ایک لیڈی اپنی لڑکی کو لیکر آئی تھی، جو صرف منہ سے الفاظ ہی الفاظ نکالنے جانتی تھی لیکن ان کا مطلب نہیں سمجھتی تھی، میں اس سے جو سوالات کرتا تھا وہ بعینہ ان کا اعادہ کر دیتی تھی، خود ان کا کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی، میں نے ہر ممکن طریقہ سے اس کا علاج کیا لیکن سودمند نہ ہوا۔

میرے نزدیک غیر مفید گفتگو ایک دماغی مرض ہے، بہت سی عورتیں ہیں جو ان گیتوں کے ذریعہ سے اپنی کوفت کو دور کرتی ہیں جو بالکل بے معنی ہیں، میں ایک قیدی کو جانتا ہوں کہ جب وہ اپنی تاریک کوٹھری میں بند کیا جاتا تھا، تو اس تنہائی و تاریکی کی وحشت کو بے معنی بڑبڑاہٹ سے دور کرتا رہتا تھا۔

قدیم مذہبی خرافات میں جھاڑ پھونک کے بہت سے الفاظ ہیں جو اگرچہ کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے اندر معانی نہیں پائے جاتے، قدیم کیتھولک گرجوں میں بہت سی دعائیں مانگی جاتی تھیں جن کے معنی کو بہت کم لوگ سمجھتے تھے۔

لیکن اگر زبان کی تعلیم کا بھی غلط طریقہ جاری رہا تو عقل کو سخت نقصان پہونچے گا، اور اس قسم کے بے معنی الفاظ ایک عقلی بوجھ بن جائیں گے۔

لڑکا بالکل طوطے کے مشابہ ہوتا ہے، اس لئے اس کی زبان کی گرہ آسانی سے کھل سکتی ہے، لیکن اس کی مقفل عقل کا دروازہ بہ مشکل سے کھولا جا سکتا ہے، کیوں کہ الفاظ کے معنی ہمیشہ سمجھ میں نہیں آسکتے، لڑکوں سے بات چیت کرنا نہایت مفید ہے، اس سے ان کو مسرت حاصل ہوتی ہے، لیکن اس گفتگو کے لئے یہ شرط ہے کہ جو الفاظ بولے جائیں، وہ ان کے ذہن کو اپنے معنی کی طرف منتقل کرنے کا ذریعہ بن جائیں، اس طرح ان کا ذہن تشتت وانتشار سے محفوظ رہے گا۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ بچے جانوروں کی آواز کی جو نقل کرتے ہیں ان سے ان کو کیوں روکا جاتا ہے؟ یہ تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ انسان میں تمام مخلوقات کی سمجھنے کی قابلیت ہو، میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ جو لوگ جانوروں کی آواز کی نقل کرتے ہیں وہ ان کی زبان کا مطلب بھی سمجھتے ہیں، بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اس تقلیدی کوشش سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی میں غور وفکر کا مادہ پیدا ہو گیا ہے مثلاً جو لڑکا کتے یا مرغ کی آواز کی نقل کرتا ہے، اس نے اتنا ضرور سمجھ لیا ہے کہ دنیا میں اور بھی مخلوقات ہیں، جن کے اظہار ما فی الضمیر کا ایک مخصوص طریقہ ہے۔

عقلی تربیت میں اگرچہ زبان کو خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن اگر الفاظ کو معنی سے الگ کر لیا جائے تو اس سے کوئی عقلی فائدہ نہیں پہونچ سکتا، مثلاً اگر بچے کو گھوڑے کے متعلق مختلف زبانوں کے پانچ لفظ معلوم ہو جائیں، لیکن اگر اس نے عمر بھر اس جانور کو نہیں

دیکھا ہی تو یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کو گھوڑے کے متعلق ایک لفظ بھی معلوم نہیں۔

لارڈ ھملٹ لوگوں کے لفظی گرویدگی پر تعجب کرتا تھا اور کہتا تھا " الفاظ، الفاظ، الفاظ، اس نے ایک مدرسے میں تعلیم پائی تھی"، اور اس تعجب انگیز طریقہ سے ہمارے طریقۂ تربیت پر نکتہ چینی کرتا تھا۔

تیئسواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر ارا ہم

بچّوں پر حسن و جمال کا اثر، اور ان کو کثرت تعلیم کی ضرورت

میں نے بغور دیکھا کہ " امیل " جب میرے ساتھ لیڈی وارنگٹن کے یہاں جاتا ہے اور ان کے یہاں شہر کی اور لیڈیوں کو دیکھتا ہے، تو ان میں ان ہی کی طرف مائل ہوتا ہے جو زیادہ حسین ہوتی ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بچّوں پر حسن و جمال کا اثر پڑتا ہے ؎۱

مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ بوڑھوں سے زیادہ محبّت رکھتا ہے، غالباً اس کا سبب یہ ہوگا کہ بچّوں کو تعلیم کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اور بوڑھے لوگ کثرت کلام سے ان کی اس ضرورت کو پورا کرتے رہتے ہیں۔

؎۱ اس سے لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں متعدد مفید کام لئے جا سکتے ہیں، مثلاً اگر اس کا استاد وجیہ ہو، اس کی کتابیں خوبصورت ہوں، اس کا مدرسہ شاندار ہو تو پڑھنے لکھنے میں اس کا جی زیادہ لگے گا۔

پچیسواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر اراسم

بچّوں کو نیک عادتوں کی تعلیم

بچّوں کو راست بازی، احسان، حسن معاملت، اپاہج لوگوں کی عزّت، اور جانوروں پر رحم کرنے کی عملی تعلیم۔

میں نے اب تک امیل کو حسن معاشرت، اور میل جول کی تعلیم نہیں دی، میں اب تک صرف اس کے اخلاقی، اور روحانی حالات کی دیکھ بھال میں مصروف رہی، اور اب تم کو اپنے عملی تجارب سے اطلاع دیتی ہوں، جس سے تم کو ان تجربات کے دوران میں معلوم ہو گا کہ مجھے اس معاملہ میں کسقدر کامیابی حاصل ہوئی۔

مجھے محسوس ہوا کہ اس میں شدّت کے ساتھ حرص وطمع کا مادّہ پایا جاتا ہے، لیکن یہ اسی کی خصوصیت نہیں، بلکہ عام طور پر بچّوں میں یہ بداخلاقی پائی جاتی ہے، البتہ میں یہ دیکھ کر کانپ اٹھی کہ وہ اس سے بھی سخت ترین اخلاقی مرض یعنی جھوٹ میں مبتلا ہے، چنانچہ جارجینی[1] نے ایک دن روٹی پکائی، اور جب وہ پک چکی تو اس کو گرم گرم دسترخوان پر رکھا، اسی حالت میں ہم کو باغ میں جانے کی ضرورت پیش آ گئی، اس لئے ہم نے روٹی کو چھوڑ کر باغ میں جانا چاہا، لیکن میں نے یہ تعجب سے دیکھا کہ امیل ہمارے ساتھ جانے سے انکار کرتا ہے، بہر حال جب ہم واپس آئے تو روٹی کا پتہ نہ تھا، اس لئے مجھے اس کے متعلق سخت شبہ پیدا ہوا، لیکن میں نے اس سے تجاہل عارفانہ کر کے سب سے عام خطاب کے ساتھ پوچھا کہ دسترخوان سے روٹی کون لے گیا؟ کابیڈن[2] اور جارجیہ کو چوں کہ اپنی نسبت کوئی بدگمانی

---

[1] گھر کی خادمہ [2] گھر کا حبشی غلام

نہ تھی، اس لئے وہ خاموش رہے، البتہ امیل کی حالت ان سے مختلف تھی اس لئے وہ شرمندہ ہوکر پکار اوٹھا کہ روٹی کو دبہ نے لیا ہی۔

آپ کو معلوم ہے کہ دبہ گھر کی پالو کتیا ہے، اور اس میں اور امیل میں باہم نہایت انس ہی اس بنا پر میں نے امیل کے دل میں جذبہ عدل و انصاف کے پیدا کرنے کا یہ بہترین موقع پایا، اور میں نے کہا کہ اگر دبہ نے یہ جرم کیا ہے تو اس پر کوڑے پڑنے چاہئیں، اور یہ کہکر میں نے کابیڈن کی طرف اشارہ کیا کہ وہ اس حکم کا نفاذ کرے۔

اس حالت میں میں امیل کے چہرے کو بغور دیکھتی جاتی تھی اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرا دل اوڑا جاتا ہے، بہرحال کابیڈن مظلوم کتیا کی طرف جلادانہ شان سے بڑھا، کتیا کو گویا یہ کل حال معلوم تھا اور وہ امیل کی طرف امید کی آنکھوں سے دیکھ کر زبان حال سے کہہ رہی تھی، کیا تم مجھے یہ ظالمانہ سزا دلوانا پسند کروگے؟ امیل کو اس کی نگاہ نے بیقرار کردیا اور وہ روتا ہوا میرے سامنے زمین پر لیٹ گیا کہنے لگا، دبہ نے روٹی ہرگز نہیں لی بلکہ میں نے لی ہے، اب میری پریشانی دور ہوگئی، لیکن باایں ہمہ میں نے اس کے ساتھ اظہار محبت کرنے میں عجلت پسندی کو مناسب نہیں سمجھا، اور اس سے ڈانٹ کر کہا، "چونکہ تم نے دبہ پر الزام لگایا ہے اس لئے تم کو اسی سے معافی مانگنی چاہئے" وہ سمجھ گیا کہ درحقیقت اس نے اس پر قابل معافی ظلم کیا ہے، اس لئے اپنی واسکوٹ کی جیب سے آدھی روٹی جس کو وہ کھا نہ سکا تھا نکال کر کتیا کو دی، اور وہ اس کو کھاگئی، اور ہم سب نے اس منظر کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

میں اگرچہ بچوں کے لئے والدین کی اطاعت کو اس سے زیادہ ضروری نہیں سمجھتی جتنا آپ سمجھتے ہیں، تاہم بعض اوقات مجھ کو مجبوراً امیل کی مضر خواہشوں کا قلع قمع کرنا پڑتا ہے، اور اس بارے میں، میں لڑکوں کی فطری استعداد سے کام لیتی ہوں، عالم خارجی کے حوادث امیل کے دماغ میں نہایت مبہم صورت میں آتے ہیں، اس لئے دنیا کی جو

چیزیں اس کی اطاعت نہیں کرتیں وہ ان کو اپنا سرکش دشمن سمجھنے لگتا ہے، مثلاً جب وہ باغ کی زمین کھودتا ہے، تو مجھے یہ دیکھ کر ہنسی آجاتی ہے کہ جب زمین کے اندر سے کوئی کنکر نکلتا ہے تو وہ فاتحانہ مسرت کے ساتھ اس کو اپنے دونوں نازک پاؤں سے روندنے لگتا ہے، گویا اس نے اپنے دشمن کو زیر فرمان کر لیا ہے،

اشیائے عالم کی یہی سرکشی امیل کو بڑے لوگوں کی اطاعت پر مائل کرتی ہے، کیونکہ وہ لوگ اس سے زیادہ قوانین طبعی سے واقف ہیں، اور ان ہی قوانین کی فرمانبرداری نے دنیا کو تجربات کی محافظت پر مجبور کر دیا ہے اور آثار سلف کی پیروی کو انسان کے لئے ضروری قرار دیا ہے، اس لئے جب امیل میری نافرمانی کرتا ہے تو میں بذات خود اس کو سزا نہیں دیتی بلکہ اس کو آس پاس کے جمادات کے حوالے کر دیتی ہوں، اور اس طرح اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ سرکشی اور نافرمانی میں کیا برائی ہے، اور اطاعت سے وہ اپنے طبعی ضعف کو کیونکر دور کر سکتا ہے،

میں نے اسی طریقہ سے اس کے دوسرے خصائل کی اصلاح میں بھی کام لیا ہے، مثلاً وہ گھر سے تنہا باہر نکل جانے کا نہایت خوگر تھا، میں اگرچہ اس کے مضرات سے اس کو ڈرایا کرتی تھی، لیکن وہ باز نہیں آتا تھا، اس لئے میں نے کا بیڈن سے کہا کہ وہ گاؤں کے بعض لڑکوں کو اس کے خلاف ٹھہر کا دے، چنانچہ جب وہ اس کو گھر سے باہر دیکھتے تھے تو یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ اس کو ایک کھویا ہوا بچہ سمجھتے ہیں، اس لئے وہ اس کو جبراً پکڑ کر میرے پاس پہونچا جاتے تھے، اس طریقہ سے اس نے یہ سمجھ لیا کہ اطاعت جبر و اقتدار سے بہتر ہے۔

مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ فطرتاً ہمیشہ نہ تنہا رہ سکتا، اور نہ ہمیشہ بڑوں کی صحبت میں اپنے دن گذار سکتا ہے، اس لئے میں نے اس کی رفاقت کے لئے گاؤں کے چند بہترین لڑکے انتخاب کئے اور اس طرح ہمارا گھر بچوں کا ایک مرکز بن گیا امیل کے ان

رفقاء میں ایک کا نام ولیم ہے جو اس کا ہم سن یعنی پنج سالہ یا شش سالہ لڑکا ہے، اور دوسرے کا نام "ازابلا" ہے جو ایک ہفت سالہ حسین لڑکی ہے، اور لوگوں نے اس کے نام کو بگاڑ کر "بلا" کر دیا ہے۔

میں نے اس بات کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا ہے کہ ان تینوں بچوں میں بہترین معاشرتی تعلقات پیدا کراؤں اس لئے جب میں ان کو سیر و تفریح کے لئے باہر جانے کا حکم دیتی ہوں، تو ان پر تین قسم کے کھانے تقسیم کر دیتی ہوں، ایک کے حصے میں صرف روٹی آتی ہے، دوسرا گوشت کا مالک ہو جاتا ہے، اور میوہ تیسرے کے ہاتھ میں آتا ہے، اس طرح اثنائے سیر میں جب کھانے کا وقت آتا ہے، تو پہلا اپنی روٹی دوسروں کو اس شرط پر دیتا ہے کہ وہ بھی اس کو گوشت اور سیب میں شریک کریں گے، اور یہ دعوت نہایت مسرت کے ساتھ قبول کر لی جاتی ہے، کیوں کہ اس میں سب کا فائدہ ہے، اور اس طرح وہ فطرتاً مساوات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

"امیل" کے جن اخلاقی برائیوں کا میں قلع قمع کرنا چاہتی ہوں، ان میں خود غرضی نہایت اہم ہے، لڑکوں میں فطرتاً یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتے ہیں، اور یہ بد اخلاقی ایک دوسری فطری کمزوری یعنی حرص و طمع سے پیدا ہوتی ہے، اور اس کی اصلاح صرف عملی طریقے سے ہو سکتی ہے، اس بارے میں میں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ میں نے اپنے باغ کے پھلدار درختوں میں سے تین درخت چن لئے ہیں، اور سال بھر کے لئے ان میں سے ایک ایک درخت ہر لڑکے کو دے دیا ہے، ان درختوں کی خصوصیت یہ ہے کہ تینوں سال کی تین مختلف فصلوں میں پھلتے ہیں، اس لئے امیل کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے حصے کے درخت کا کل پھل کھا جائے اور اپنے دونوں رفیقوں کو نہ پوچھے، کیونکہ جب اخروٹ اور امرود کے پکنے کا زمانہ آئے گا، اور ولیم اور بلا امیل کی طرز عمل کو یاد کریں گے تو اس کو اپنے فعل کا بدلہ مل جائے گا، اور اس طرح ان میں خود غرضی

کے بجائے مساوات و اشتراک کی روح پیدا ہو جائے گی۔

اس خود غرضی کی بنا پر لڑکوں کو یہ نہایت آسانی کے ساتھ سمجھایا جا سکتا ہے کہ فلاں چیز ان کی مملوکہ اور مقبوضہ ہے لیکن ان کو بہ مشکل سمجھایا جا سکتا ہے کہ ان کو غیروں کی ملکیت کا بھی احترام کرنا چاہیئے، مثلاً انگلستان میں ایک ترکاری ہوتی ہے جو یہاں اس قدر پسند کی جاتی ہے کہ دیہاتی بچے اس کے پکانے اور بھوننے کا بھی انتظار نہیں کرتے بلکہ کچی ہی کھا جاتے ہیں، چنانچہ میرے یہ تینوں شاگرد ایک دن گھومتے پھرتے اس ترکاری کے کھیت میں نکل گئے اور اس کو کھانا شروع کر دیا، کھانے کے بعد ان کے ضمیر نے ملامت کی اور امیل نے کہا کہ کیا ہم نے یہ اچھا کام کیا ہے؟ اس کے دونوں رفقاء نے اعتراف کیا کہ انہوں نے غلطی کی ہے، اس کے بعد ان میں پھر گفتگو ہوئی اور ولیم نے قدریہ کے اصول کے مطابق کہا کہ "جو کچھ ہونا تھا ہو گیا اب ہم اس کی اصلاح نہیں کر سکتے، بلبلا نے کہا " ہاں لیکن ہم قیمت ادا کر کے اس غلطی کی تلافی کر سکتے ہیں"۔ یہ سنکر ان دونوں رفقاء کے چہرے مسرت سے چمک اٹھے۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ولیم اور بلبلا کو معلوم ہوا کہ ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے، البتہ امیل کے پاس ایک پینی تھی، اور اس نے نہایت آسانی ساتھ اس کو جیب سے نکال دیا، لیکن چونکہ کھیت کا مالک نہ تھا، اس لئے وہ فطری سادگی سے اس قیمت کو ترکاری کے ایک پتے پر رکھکر چلے آئے، چونکہ میں ان کو سزا نہیں دیتی، اس لئے وہ مجھ سے اپنے جرائم کا اعتراف کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے مجھ سے اس جرم کا اعتراف کیا تو میں نے اس قیمت کو ناکافی سمجھ کر کھیت والے کو کچھ اور دیا اور اس طرح یہ معاملہ ختم ہو گیا، اور ان بچوں کے دل میں عدل و انصاف کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا اس کے معاوضہ میں میں اپنا سب کچھ صرف کر سکتی تھی، اگر امیل کے دل میں قیمت ادا کرنے کا خیال پیدا ہوا ہوتا تو میں اور بھی خوش ہوتی تاہم اس نے جو قیمت اپنی جیب سے ادا کی اس سے اس کی اخلاقی فضیلت ثابت

ہوتی ہے، میں امیل کے دل میں اندھوں، لولوں اور لنگڑوں کی عزّت کرنے کا جذبہ خاص طور پر پیدا کرنا چاہتی ہوں، بہت سے ماں باپ غلطی سے اپنے بچّوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ اس قسم کے امراض عذاب خداوندی کا نتیجہ ہوتے ہیں، ایک لڑکی نے جو میرے ہوٹل میں رہتی ہے ان ہی خیالات میں پرورش پائی ہے، چنانچہ وہ ایک کوزہ پشت بوڑھیا کی نسبت جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے، یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ اس کے کوبڑ میں شیطان رہتا ہے، لیکن ان اوہام کے برعکس میں امیل کے دل میں ان کی محبّت کا جذبہ اسطرح پیدا کرتی ہوں کہ خدا نے جن لوگوں کے جسمانی محاسن سلب کر لئے ہیں ان کے عوض ان کو دوسری قوتیں عطا فرمائی ہیں جن سے اور لوگ محروم ہیں، چنانچہ مجھے جب معلوم ہوا کہ قریب کے ایک گاؤں میں ایک مادرزاد اندھا لڑکا رہتا ہے، تو میں نے اس خیال کو عملی تجربہ کی صورت میں لانا چاہا اور اپنے تینوں شاگردوں سے کہا کہ وہ اس کو اپنا رفیق بنالیں، وہ راضی ہوگئے، کیونکہ لڑکے صرف تفریح چاہتے ہیں، اس لئے اشخاص کی کثرت تعداد سے نہیں گھبراتے، ان کی رضامندی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انسان اپنے سے کم درجہ اشخاص کی رفاقت کو ناپسند نہیں کرتا، اور اس کو اپنے اظہار ترفع کا ذریعہ سمجھتا ہے، لڑکے بھی نامعلوم طریقے سے اس معاملے ہمارے مقلد ہیں۔

یہاں کے لڑکے فصل ربیع میں اکثر ایک قسم کے کوّے کا شکار کرتے ہیں، جو اپنا گھونسلا پہاڑ کی نامعلوم چٹانوں میں بناتا ہے، میں اگرچہ اس جانور کا شکار مختلف وجوہ سے پسند نہیں کرتی، تاہم میں نے ان بچوّں کو اس سے روکنا مناسب نہیں سمجھا، اور وہ ایک دن اس اندھے لڑکے کے ساتھ اس غرض سے گئے، کابیڈن بھی ان کے پیچھے پیچھے مخفی طور پر لگادیا گیا تھا کہ مبادا ان کو کوئی خطرہ پیش آجائے، ولیم اور بلبلا باری باری سے اندھے لڑکے کو ہاتھ پکڑ کر ساتھ لے چلتے ہیں، اور جوں جوں وہ پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھتے تھے، ان کو نظر آتا تھا کہ ان کو اندھے لڑکے پر تفوق حاصل ہے،

اس سیر و تفریح میں آفتاب ڈوب گیا، اور جس راستے سے وہ پہاڑ پر چڑھتے تھے، اس کی تمیز ان کے لئے دشوار ہو گئی، کابیڈن نے ان کو اس تحیر و ضلالت میں دیکھا تو ان کی مدد کرنا چاہا، لیکن میری ہدایت کے بموجب اس نے اس لئے توقف کیا کہ وہ خود اپنا کیا راستہ نکالتے ہیں۔

لیکن رات کے آنے کے ساتھ ہی اندھے بچے کی آنکھیں کھل گئیں، اور اس نے اپنی قوت حافظہ (جو اندھوں کی مخصوص قوت ہے) کی مدد سے اس راستے کو پہچان لیا جس سے وہ صبح کو گزرے تھے، اور اب وہ مقلد ہونے کے بجائے ان کا رہنما بن گیا، اب ان بچوں کو اس حالت میں خود اس اندھے بچے کا تفوق نظر آنے لگا، کیونکہ وحشی آدمیوں کی طرح بچوں کے خیالات میں بھی بہت آسانی کے ساتھ تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے، اور بعض قدیم قومیں اپاہج اور مفلوج وغیرہ اشخاص کی جو پرستش کرتی تھیں اس کا یہی سبب تھا۔

اندھے کے ان معجزانہ اعمال نے امیل اور اس کے رفقاء کے دل میں اطلاع عام کے حاصل کرنے کا شوق بھی پیدا کیا ہے، اور اب وہ اکثر ایسے کھیل کھیلتے ہیں جن کی طرف آنکھ بند کر کے متوجہ ہونا پڑتا ہے، اگرچہ آنکھ سے دیکھنا عام طور پر افضل خیال کیا جاتا ہے، لیکن اس اندھے بچے کی تقلید نے ان بچوں کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھنا زیادہ وقت نظر کا کام ہے، اگرچہ اس کسی طریقہ سے وہ عمر بھر اندھے بچے کی فطری نگاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے، تاہم ان کھیلوں میں ان کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ حواس میں باہم کیا تعلق ہے، اور ایک حاسہ کیوں کر دوسرے حاسہ کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔

اس اخلاقی فائدے کے ساتھ اس شکار کا مادی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کوئے کے دو بچے ہاتھ آئے، اور لڑکے ان کو دیکھ کر نہایت مسرور ہوئے، لیکن مجھے چونکہ معلوم تھا کہ بچوں کے ہاتھ میں جب چڑیاں پڑ جاتی ہیں تو وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے اس لئے میں ان کے ساتھ اس مسرت میں شریک نہیں ہوئی، لیکن آخر میں کیا کرتی؟ اگر میں ان سے

کہتی کہ ان کو چھوڑ دو تو وہ بے شبہ چھوڑ دیتے، لیکن یہ امر ان کو ناگوار گذرتا، اس لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان بچّوں کو گھر کے نیچے کے کمرے میں بند کر دیا، اور امیل سے کہا کہ وہ خود ان کو چارہ کھلائے، اس طرح اس کو اس چڑیا خانے میں آ کر رہنا پڑا، اور اس کو محسوس ہوا کہ وہ خود اپنے قیدی کا گرفتار ہو گیا ہے، اور اس طریقہ سے سب سے بڑی بصیرت جو اس نے حاصل کی وہ یہ تھی کہ انسان جب تک اپنی آزادی کا ایک حصہ ضائع نہیں کر لیتا دوسر کی آزادی کو سلب نہیں کر سکتا، ان پابندیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے چند ہی دنوں میں ان بچّوں کے چھوڑنے کی خود درخواست کی اور وہ چھوڑ دیے گئے۔

چونکہ اندھے کے معاملے میں مجھ کو کامیابی حاصل ہو چکی تھی، اس لئے میں نے اپنے اس تجربہ کو جاری رکھنا چاہا، چنانچہ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہمارے گاؤں کے پاس ایک چرواہا رہتا ہے جو حماقت میں مشہور ہے، اور تمام لڑکے اس کی ہنسی اڑاتے ہیں، تو میرے دل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں امیل بھی اس معاملے میں ان کا مقلد نہ بنجائے، اس لئے میں نے ایک دن کھیتوں میں اس سے ملاقات کی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنی کل بکریوں کو پہچانتا ہے، لیکن خود ہمارا اور امیل کا یہ حال تھا کہ اس کی بکریوں کا گلّہ ایک ہی قسم کی بکریوں کا مجموعہ معلوم ہوتا تھا، اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کو ہم پر اس حیثیت سے ایک فضیلت حاصل ہے، اور اس سے ہم امیل کی تربیت میں کام لے سکتے ہیں، دوسرے دن میں امیل کو ساتھ لے کر اس چرواہے کے پاس گئی تو اس نے اس کے دیکھتے ہی کے ساتھ کہا کہ "او یہ تو مجنون ہے"، میں نے اس کے فقرے سے قصداً اغماض کیا، اور ان گڈمڈ بکریوں کی شناخت کا جو مادّہ اس میں موجود تھا اس کی طرف اس کو توجہ دلائی تو وہ متحیّر ہو کر رہ گیا، ہم نے اس سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ اس کو بکریوں کے دانتوں تک کا حال معلوم ہے، وہ ان کی طبیعت، بلکہ ان کے جسم کے ایک ایک داغ سے واقف ہے، اس سے امیل کو محسوس ہوا کہ بعض باتوں میں وہ ہم سے زیادہ مہارت رکھتا ہے،

اور امیل کے اس احساس کو دیکھ کر میں نے اس چرواہے سے خواہش کی کہ وہ اپنے مدرسہ میں رکھکر چند روز ہمارے بچے کو اپنے علوم کی تعلیم دے جس کو اس نے بخوشی منظور کیا، اور عمر بھر میں یہ پہلا اعزاز تھا جو اس کو حاصل ہوا۔

لیکن امیل اپنے فخر و غرور کی بنا پر اس سے خوش نہ تھا، اور ایک احمق شخص کی شاگردی کو اپنی توہین سمجھتا تھا، لیکن اس کے سوا میرے حصول مقصد کا کوئی ذریعہ نہ تھا، بہر حال اس تعلیم سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ ایک قبیلے کے مختلف افراد میں جو دقیق فرق و امتیاز پایا جاتا ہے، اس کی تمیز صرف بکریوں تک محدود نہیں رکھنی چاہیئے، بلکہ اگر یہ ملکہ حاصل ہو جائے تو تاریخ طبعی میں جن چیزوں سے بحث کی جاتی ہے، ان کے متعلق بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔

دوسرا فائدہ جو پہلے سے بھی زیادہ قیمتی ہے یہ ہے کہ ہم کو ہمیشہ تعلیم کی ضرورت ہے یہاں تک کہ اس معاملے میں ہم ان لوگوں کے بھی محتاج ہیں جو ہم سے زیادہ ضعیف العقل ہیں امیل کا خیال ہے کہ جب تک وہ سپاہیوں کی طرح کھیل کود میں مشغول نہ رہے گا، کامل مرد نہیں ہو سکتا، اس لئے میں نے اس کو کھیل کود کی اجازت بھی دی تھی، لیکن چند ہفتوں سے میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئی کہ گاؤں کے لڑکوں کی "دو جنگ جو پارٹیاں" بن گئی ہیں، اور وہ ان کے درمیان علم بردار بنا ہوا ہے۔

اگرچہ وہ لکڑی کی تلوار سے لڑ رہے تھے، لیکن اگر وہ لوہے کی ہوتیں، اور ان ننھے ننھے ہاتھوں میں طاقت ہوتی تو میرے سامنے قتل و خون کا وہ بدترین منظر آجاتا جس کا نام لڑائی ہے، بہر حال ہم اور بلبلا ان کے درمیان میں کھڑے ہو گئے اور ان کو روک دیا، اس حالت میں امیل کو میری ناراضی محسوس ہوئی اور اس نے مجھ سے عاجزانہ طور پر معافی مانگ لی۔

اگرچہ مجھ کو یہ یقین ہے کہ ملک کی مدافعت، انسان کے بہترین فضائل میں سے ہے،

اور ایک نہ ایک دن ایک ایسی جنگ کا آغاز ہوگا جو تمام تر حق و انصاف پر مبنی ہوگی، تاہم وہ اس سن و سال میں ان نکتوں کو نہیں سمجھ سکتا، وہ عام طور پر جنگ کی وہی حقیقت سمجھ سکتا ہے، جو عام لوگ سمجھتے ہیں، اور لڑکے پتے یا چیتھڑے جس چیز کا جھنڈا بھی بنائیں، لیکن فوج کی طرح ان میں ایک ہی احساس پایا جاتا ہے، اس لئے وحشیانہ فطرت ان کو صرف قتل اور خونریزی پر آمادہ کر سکتی ہے۔

اس جنگ کا خاتمہ ہو چکا تو میں نے امیل کا ہاتھ پکڑ کر واپس آنے لگی، اسی حالت میں میں نے دیکھا کہ راستے میں دو کتے ایک ہڈی پر لڑ رہے ہیں، میں نے اس سے کہا کہ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ میدان جنگ کی بھی یہی صورت ہے، اگرچہ مجھے یہ یقین نہیں کہ اس نے میرے کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ لیا، تاہم اس کو معلوم ہو گیا کہ میری ناراضی کی کیا وجہ تھی۔

اگرچہ ان بیہودہ خیالات کی برائی کے بیان اور ان کی تشہیر میں امیل کا فائدہ ہی، تاہم میں اس کو بزدل نہیں بنانا چاہتی، اکثر ماں باپ بچوں کی تربیت میں ان کے جذبہ خوف سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ہر ڈراؤنی چیز سے ان کے ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں ان کو آسمان سے یہ کہکر ڈراتے ہیں کہ "اس کے بادلوں میں بجلیاں چھپی ہوئی ہیں" زمین سے یہ کہکر ڈراتے ہیں کہ "آدم کے گناہ کے سبب خدا نے اس پر لعنت کی ہے" زندگی سے یہ کہکر ڈراتے ہیں کہ "اس کے تمام کام ایک حاکم کے سامنے پیش ہوں گے جو ان کا حساب لے گا" اور موت سے یہ کہکر ڈراتے ہیں کہ "وہ ہزاروں خطرات سے گھری ہوئی ہے جن کی کوئی انتہا نہیں" لیکن اس قسم کی تربیت غلاموں کے لئے موزوں ہے، اس سے آزاد آدمی نہیں پیدا ہو سکتے، اگر امیل کے لئے ڈرنا ہے تو اس کو اپنے ضمیر اور فطرت سے ڈرنا چاہئے، لیکن میں ان مربیوں کے خلاف ان چیزوں سے

ڈرانے کے بجائے اس کو اطمینان دلاتی ہوں، اور میری یہ خواہش ہے کہ وہ تمام چیزوں کے سامنے دلیرانہ شان کے ساتھ نمایاں ہو، لیکن آدمیوں کے سامنے آئے تو جھک کر آئے، شجاعت کو حقیقی قالب میں نمایاں کرنا چاہئے نہ کہ جھوٹے بہروپ میں۔

امیل بھی اپنے اور ہمسن بچّوں کی طرح رات کی تاریکی، اور ہر اجنبی چیز سے ڈرتا ہے، چنانچہ باغ کے انتہائی کنارے پر ایک متوسط درجے کا درخت ہے جس کے پاس وہ آفتاب ڈوبنے کے بعد نہیں جاتا، لیکن یہ خوف اس دور وحشت کی یادگار ہے، جب انسان بھوت پلید سے گھرا ہوا رہتا تھا، بہر حال جب مجھے معلوم ہوا کہ بچّوں پر یہ جذبہ بہت غالب ہے، اور جس قدر اس کی مدافعت کی جاتی ہے، اسی قدر وہ بڑھتا جاتا ہے تو میں نے یہ مناسب سمجھا کہ باغ میں جاتے وقت اس کے ساتھ دیہ (کتیا)، کو کر دیا جائے جو کسی چیز سے نہیں ڈرتی، چنانچہ جب اس نے ایک نڈر رفیق کا ساتھ پایا تو اس کو تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ خوف کا سبب صرف اس مقام کی وحشت اور تنہائی تھی، اور مجھ کو بھی یہ بصیرت حاصل ہو گئی کہ زمانہ قدیم میں انسان کو پالو جانوروں سے جو انس تھا اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ان سے اس کے دل میں قوت اور جرأت پیدا ہوتی تھی۔

میں نے آپ کی خواہش کے بموجب آج تک امیل سے مذہبی مسائل کی متعلق کوئی بحث نہیں کی، لیکن گزشتہ ہفتے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کا بیان کرنا ضروری سمجھتی ہوں، ہم نے اس ہفتے میں ایک دن شام کو بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیکھا جس نے بڑھتے بڑھتے گھنگھور گھٹا کی شکل اختیار کر لی، اور برس کر جل تھل کر دیا، اس کے بعد ہوا رک گئی اور سطح دریا کو بالکل سکون ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر آندھی چلی، اور اس زور سے بجلی کا کڑاکا ہوا کہ تمام گھر دہل گیا اب امیل کانپ اٹھا

اور خوف کے مارے میرے سینہ سے چمٹ کر مجھ سے پوچھنے لگا: "ہمارے اوپر کونسی چیز اس قدر غضبناک ہوگئی ہے؟" میں سخت متحیّر تھی کہ اس سوال کا کیا جواب دوں؟ اگر میں یہ کہتی ہوں کہ یہ خدا ہے، تو اس ذات متجمع الصفات کا بدتر تصوّر اس کے ذہن میں پیدا کراتی ہوں، اس لئے میں نے آسان الفاظ میں اس کا سبب بیان کر دیا، لیکن اس نے ان حوادث جویہ سے متاثر ہو کر یہ محسوس کر لیا کہ یہ خدائی غصّہ تھا، بلکہ اس نے صاف معلوم کر لیا کہ ان چیزوں کے پردے میں ایک دوسری ذات مخفی ہے جس کا نام خدا ہے، جو اگرچہ عام طور پر نظر نہیں آتی، لیکن انسان کا ضمیر اس کو محسوس کرتا ہے، چنانچہ اسی وقت ہم اور امیل اٹھے اور اس خدائے برتر کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔

چھبیسواں خط

از ڈاکٹر اراسم بنام ہیلانہ

مربّیوں کے لئے مناسب طریقِ عمل

مربّی اگر کسی چیز سے ناواقف ہے تو اس کو لڑکے کے سامنے اس کا اعتراف کر لینا چاہئے، جو مربّی ہر چیز سے واقفیت کا دعوےٰ کیا کرتے ہیں ان پر نکتہ چینی، مذہبی اور سیاسی تعلیم پر نکتہ چینی، تربیت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ مربّی جو کچھ جانتا ہے اس کو بھول جائے اور نئے سرے سے لڑکے کے ساتھ اس کی جاننے کی عادت ڈالے۔

تم کہتی ہو کہ امیل میں اطلاع عام کے حاصل کرنے کا ذوق پایا جاتا ہے، اور وہ تم سے بہت سے سوالات کیا کرتا ہے، میرے نزدیک یہ اس کی نجابت کی عمدہ علامات

ہیں، لیکن میں تم کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اگر وہ تم سے کوئی ایسا سوال کرے جس کا جواب تم کو نہ معلوم ہو تو نہایت صداقت و خلوص کے ساتھ اپنی ناواقفیت کا اعتراف کر لیا کرو، عام طور پر اگرچہ والدین اور معلمین اس روش کے مخالف ہیں، لیکن تم کو اس طریقہ کے پیروی کی ضرورت نہیں ہے، یہ ایک خطرناک کام ہے، کیوں کہ جب لڑکے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر چیز کے ایک معنی ہیں جس کو دوسرے سے نہایت آسانی کے ساتھ معلوم کیا جا سکتا ہے، تو اس کی قوت ذہنیہ بجھ جاتی ہے، اور اس میں بلادت پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ جب اس کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانی علم تمام شکوک و اعتراضات کا ازالہ کر سکتا ہے، تو وہ خود بحث و نظر کی تکلیف گوارا کرنا نہیں چاہتا، لیکن اگر تم نے یہ اعتراف کر لیا کہ اس سوال پر تم نے کافی غور و فکر نہیں کیا ہے، تو گویا تم نے ایمیل کو یہ تعلیم دی کہ صحیح بات بغیر جد و جہد اور بحث و تحقیق کے نہیں معلوم ہو سکتی، اور کوئی جواب اس نصیحت آمیز تعلیم کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

والدین اور معلمین کو مدعیانہ طور پر اپنی معصومیت کے اظہار سے بھی سخت احتراز کرنا چاہیئے، کیونکہ جب مستقبل میں دفعتاً ان کی غلطیاں ظاہر ہوتی ہیں تو دفعتاً ان کے متعلق لڑکے کا اعتقاد بھی زائل ہو جاتا ہے، اور اس کے دل سے ان کا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

بلکہ اعتقاد جو ہمارے طریقہ تعلیم کا ایک جزو ہے، اس کو ہماری سوسائٹی نے پیدا کیا ہے، کیونکہ جب یہ عقیدہ قائم کر لیا جاتا ہے، کہ مذہبی اور سیاسی لیڈروں نے قوم کے مصالح پر کافی غور و فکر کر لیا ہے، تو اس کے ساتھ یہ تسلیم کر لینا بھی ضروری ہو جاتا ہے، کہ ان کے تمام نظریات بچوں کو بغیر بحث و مباحثہ کے مان لینے چاہیئیں مذہبی تعلیم میں بہت سے اسرار ایسے ہیں کہ عقل انسانی ان کی حقیقت کو نہیں جان سکتی، بہت سے اعمال ایسے ہیں جن میں کوئی تغیر نہیں کیا جا سکتا، بہت سے احکام ایسے ہیں

جن پر نقد و بحث نہیں کی جاسکتی سیاسی تعلیم کی حالت بھی اس سے بہتر نہیں ہے، کیونکہ پروفیسر سلطنت کے تنخواہ دار ملازم ہوتے ہیں، اس لئے وہ سلطنت کے احکام کو دوہراتے رہتے ہیں، اگر اس تعلیم کا نقصان صرف یہ ہوتا کہ وہ انسان کو غلام بنا دیتی ہے تو میں اس پر نکتہ چینی نہ کرتا، لیکن قابل اعتراض بات یہ ہے کہ وہ انسان کو اس لئے غلام بناتی ہے کہ اس کے عزم و ارادہ کو مُردہ کردیتی ہے، اور اس کے نزدیک تعلیم کا فائدہ صرف قوّت حافظہ کی مشق و تمرین میں محدود ہو جاتا ہے۔

اگرچہ اس جابرانہ تعلیم میں کافی کامیابی حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ کبھی کبھی اس سرکاری تعلیم کا نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے، لیکن بایں ہمہ مجھ کو یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس شکنجے سے بہت کم لوگ نکلتے ہیں، بہرحال یہ تعلیم ایک دودھاری تلوار ہے، جس سے انسان کی عقل کو غلام بھی بنایا جاسکتا ہے، اور اس کو آزاد بھی کیا جاسکتا ہے لیکن یہ آزادی تمام تر بخت و اتفاق پر موقوف ہے، اور میں امیل کے مستقبل کو ان مشتبہ مواقع کے سپرد کرنا نہیں چاہتا، جہاں حق و باطل، اور غلامی اور آزادی دونوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔

میں آثار سلف کے فوائد کا انکار نہیں کرتا، لیکن ان آثار کے حدود اس قدر مشتبہ ہیں کہ ان میں بہ مشکل تمیز کی جاسکتی ہے، اگر ایک بچہ اپنی سوسائٹی سے کچھ نہیں سیکھتا تو اس کو صرف وحشی یا احمق کہہ سکتے ہیں، لیکن اگر ایک شخص سوسائٹی کی ہر چیز کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیتا ہے، ان پر غور و فکر نہیں کرتا، اور یہ گھگران ذمہ داریوں سے الگ ہو جاتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے جو ہم سے زیادہ صحیح النظر تھے ہم کو ان سے بے نیاز کر دیا ہے۔ تو اس کو ضعیف العقل تسلیم کرنا پڑے گا۔

مختصر یہ کہ تربیت کا جو طریقہ تم نے اختیار کیا ہے وہ مجھے نہایت پسند ہے، تربیت کا تمام تر دارومدار ایثار اور محبت پر ہے، مجھے بہت سے اکابر قوم کا حال معلوم ہے جو

اپنے مخصوص دوستوں کے میل جول سے بھی نفرت رکھتے ہیں، اسلئے یہ لوگ بچوں کی تربیت کے موزوں نہیں ہوتے، مرّبی کو ایسی کشادہ روئی کا اظہار کرنا چاہئے جو طلبار کو اپنا گرویدہ بنالے، ان شرائط کے لحاظ سے بچّے کی اصلی مرّبی صرف اس کی ماں ہے، لیکن اس کے ساتھ تم کو یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ تربیت کی پہلی شرط یہ نہیں ہے کہ مربی عالم ہو، بلکہ یہ ہے کہ وہ سب کچھ بھول کر نئے سرے سے طلبار کے ساتھ ان کو سیکھے۔

ستائیسواں خط

از ڈاکٹر ارا سم بنام ہیلانہ

لڑکوں کیلئے علوم کی تعلیم میں تدریجی ترقی ضروری ہی درسی کتابوں پر

نکتہ چینی

مجھے یاد ہے کہ میرے ایک دوست کے دل میں تربیت کا شوق پیدا ہوا اور وہ اس میں مشغول ہو گیا، اس کے بعد ایک مدرسے کے اہتمام وادارت کی خدمت اس سے متعلق کی گئی جس کا نظام تربیت اصول تشدّد پر قایم کیا گیا تھا، اور وہ بالکل قدیم اصول کے مطابق چلایا جاتا تھا، اس لئے اس میں ہر قسم کی بیرحمانہ سزائیں جاری تھیں۔ لڑکوں کو ان تعطیلوں میں دن بھر صحن مدرسہ میں کھڑا رکھا جاتا تھا، ان کو باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی، اور ان سے تمام لڑکوں سے دوگنا کام لیا جاتا تھا، لیکن میری اس دوست نے چند ہی روز میں اس ظالمانہ نظام کو توڑ کر طلبار سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

میں تم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب اگر تم نے غلطی کی تو تم کو کون سزا دے گا؟ اب تم کو خود تمہارا ضمیر سزا دے گا، آدمی ڈنڈے کی زد سے تو بچ سکتا ہے، لیکن ضمیر کے کوڑے سے نہیں بچ سکتا۔

اس سے پہلے طلباء مدرسے کے صحن مدرسہ کے برآمدے اور مدرسہ کے ہال میں چلتے تھے تو اس کا یہ طریقہ تھا کہ دو دو لڑکوں کی صفیں قایم کی جاتی تھیں، اور ان کے ساتھ ایک نگراں ہوتا تھا جس کو وہ دل سے مبغوض رکھتے تھے، لیکن ہمارے دوست نے ان کو جمع کر کے یہ مژدہ سنایا کہ

"کل سے تم بالکل آزاد ہو، اب کوئی شخص تمہارے اخلاق کا نگراں نہ ہوگا بجز اس فرض کے جس کو تم محسوس کرتے ہو، اس کے بعد مجھے کچھ نہیں سننے کی ضرورت نہ ہوگی کیوں کہ ہر شخص نے اس نظام کی اطاعت کو ضروری قرار دے لیا ہے،،

وہ ایک دن مدرسہ کے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ اس نے ایک طالب العلم کو دیکھا کہ وہ باغ میں انگور توڑ توڑ کر کھا رہا ہے، اس نے اس کے فعل سے اغماض کیا اور اس سے کہا کہ امین مدرسہ کو بلا لاؤ، وہ آیا اور یہ حریص لڑکا مجرمانہ احساس کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ تھا، اب اس نے امین سے کہا کہ اس لڑکے کو مدرسے سے کافی کھانا کیوں نہیں ملتا؟ وہ آج ڈائیننگ ہال سے نکل کر انگور کھا رہا تھا، اس کو لیجا کر کافی کھانا کھلاؤ،

بچوں کو سب سے پہلے صحیفہ کائنات کی تعلیم دینی چاہئے، اور ہمارے مدارس ان سے خالی ہیں، تم کسی مدرسے کے کمرے میں جاؤ تو تم کو روشنائی سے لپے ہوئے ڈیسک، ٹوٹی ہوئی بنچیں، بے نقش و نگار دیواریں اور موٹی موٹی لکڑیوں سے ڈھکی ہوئی چھتیں، ملیں گی، لیکن اگر تم ان کمروں کے جھروکوں سے جھانک کر دیکھو گے تو تم کو نظر آئے گا کہ چڑیاں آزادانہ طور پر اڑ رہی ہیں، اور فضا میں نغمہ سنجی کر کے گویا طلبہ کو

چڑھا رہی ہیں عالم خارجی مجسم آواز، مجسم روشنی، مجسم شکل اور مجسم رنگ ہی، جو طلباء کو بذریعہ احساس کے تعلیم دیتا ہی لیکن ان کمروں میں کوئی چیز جاذب نظر نہیں ہوتی، چند پرانے نقشے البتہ ہوتے ہیں جن پر کسی قسم کا آب ورنگ نہیں ہوتا، اس لئے میں مربیوں کو قسم دلاتا ہوں کہ بچوں کے لئے انہوں نے جو مقبرہ تیار کیا ہے اس میں عالم خارجی کی خوشبو اور زندگی کی شعاعوں کو بھی آنے کی اجازت دیں۔

کسی قوم کا مدرسہ میکروسکوپ، تلسکوپ، کرۂ عالم، بوٹینکل گارڈن، جانور خانہ وغیرہ سے خالی نہ ہونا چاہیے، تاکہ مادی عالم کی حقیقت بچوں کی سمجھ میں آسکے، لفظ اور خط تحصیل علوم کے نہایت ناقص ذرائع ہیں، اس لیئے طلباء سے اشیائے خارجیہ کا معائنہ کروانا چاہیے۔

موجودہ مربیوں کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ وہ علوم کی تربیت بالکل بدل دیتے ہیں، بعض علوم جو بعد کو پڑھانے کے قابل ہیں ان کی تعلیم پہلے دیتے ہیں، اور بعض علوم جن کو سردست پڑھانا چاہیئے، وہ بعد کو پڑھاتے ہیں علوم کی تربیت کا بہترین طریقہ یہ ہو کہ جن فطری قوانین کے مطابق انسان کو جسمانی، روحانی اور عقلی نشوونما حاصل ہوتی ہی، ان ہی کے مطابق علوم کی مدارج مقرر کئے جائیں، مثلاً جو لڑکا صرف اشیاء کی ضخامت اور ان کی ظاہری خصوصیات کو جان سکتا ہے، وہ ان کے باہمی تعلقات کو نہیں سمجھ سکتا، اور ان کے طبعی قوانین اس کے دماغ میں نہیں آسکتے، وہ ان اسباب کو بھی نہیں جان سکتا جن سے ان اشیاء کی تولید ہوتی ہے، یا مثلاً جو نوجوان شعروشاعری سے ذوق رکھتے ہیں، وہ منطق اور فلسفہ کے اصول کی طرف مائل نہیں ہوسکتے، کیوں کہ اب تک ان علوم کی استعداد ان میں پیدا نہیں ہوئی ہے۔

ادراک ایک عام لفظ ہے جس کے تحت میں بہت سی قوتیں داخل ہیں جو تدریجاً ترقی کرتی ہیں، ان میں ہر ایک کے مخفی رہنے کا ایک زمانہ ہوتا ہی، اس کے بعد اشخاص

اور اشخاص کے ماحول کے تغیرات کے ساتھ ان میں بھی تغیرات ہوتے ہیں اور اسی سلسلہ میں ان کا ظہور ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہ سب زمانے کے ساتھ وابستہ ہیں، اس لئے ہماری طرح ہمارے خیالات اور احساسات کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔

انسان ایک ہی چیز کو مختلف طریقوں سے متعدد بار سیکھ سکتا ہے، مثلاً ابتدا میں ایک بچّہ گلاب کو صرف اسقدر جانتا ہے کہ وہ گلاب ہے، اس کے بعد جب اس کی قوّت عقلیہ کو ترقی ہوتی ہے، تو وہ گلاب کی شکل، رنگ اور بُو سے ایک عالم عقلی مثال منتزع کر لیتا ہے، اور اس کے بعد جب گلاب کو دیکھتا ہے تو اس مثال عقلی کے ذریعہ سے اس کو پہچان لیتا ہے، لیکن علم النباتات کے علماء نے اس کی تربیت اور ترکیب وغیرہ کے متعلق جو اصول مقرر کئے ہیں وہ اس حالت میں ان سے بے خبر رہتا ہے، اس بنا پر اگر مربّی بچّے کی عقل کو گمراہ نہیں کرنا چاہتا، تو ان خیالات کی نہایت ہوشیاری کے ساتھ حفاظت کرنی چاہئے ہیں اگر امیل کو علم طبقات الارض کی تعلیم دوں گا، تو پہلے اس کو پتھروں بلکہ راستوں کی ان کنکریوں کی طرف متوجہ کروں گا جن میں مخلوقات عضویہ کی شکلیں پائی جاتی ہیں، اس طرح واقفیت عامہ کے شوق کی بنا پر اس کو ان علامات کا کافی علم ہو جائے گا جو زمین کے اندر ان مخلوقات میں موجود ہیں، اور یہی طریقہ اس کے سن و سال کے مناسب بھی ہے، اس کے چند سال کے بعد اس کو اس طرف مائل کروں گا کہ جو نمونے اس نے جمع کئے ہیں ان میں باہم موازنہ ومقابلہ کر کے ہم رنگ نمونوں میں ان کی ہم رنگی کے مطابق تربیت و نظام پیدا کرے، اسی سلسلے میں میں ان کنکروں اور پتھروں کے ذریعہ سے اس کو زمین کے تاریخی انقلابات کی طرف بھی متوجہ کروں گا، اسکے بعد جب وہ اٹھارہ سال کا ہو جائے گا، اور اس میں میری ہر بات کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے گی تو میں علم طبقات الارض کے ذریعہ سے اس کو فلسفہ تاریخ کی

تعلیم دوں گا۔

میرے ان خیالات سے تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ امیل کی تعلیم میں ہم کو موجودہ درسی کتابوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہئیے، جن کا راستہ ہمارے مقصد سے بالکل الگ ہے، ان کے مرتب کرنے والے خیال کرتے ہیں کہ عبارت کی آسانی نے ان کو طلبا کے لئے نہایت موزون بنا دیا ہے، اور مجھ کو بھی ان کی ترتیب و تالیف میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی، جو کچھ برائی ہے وہ ان کتابوں کی اصل وضع میں ہے، موجودات عالم میں سب سے پہلے بچے کو ان چیزوں کا علم ہونا چاہئیے جن کو انسان علوم و فنون کی ترتیب و تدوین سے پہلے جانتا تھا، ہمارے مدرسین کو اتنا تو معلوم ہے، کہ علوم و فنون کی ترتیب و تدوین بہت سے تجربوں کے بعد ہوئی ہے، لیکن انہوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ بچوں کو موجودہ قالب میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں، وہ اس شکل میں پیدا نہیں ہوئے تھے، سب سے پہلے جزئیات و حوادثات کے باہمی تعلقات نے انسان کے ذہن کو علوم و فنون کی ایجاد کی طرف منتقل کیا، اس کے بعد ان کے قواعد و ضوابط بنائے گئے، اور ان کی مختلف شاخیں پیدا ہو گئیں یہاں تک کہ ہر شاخ دوسری شاخ سے ممتاز ہو گئی، اس بنا پر اس طریقہ کے خلاف بچوں کو تعلیم دینا عقل انسانی کے نظام کو الٹ دینا ہے، ابھی تک بچے علوم و فنون کے مبادی و مقدمات کی تمیز بھی نہیں کر سکتے کہ اساتذہ ان کے نتائج اور ماحصل کی تعلیم دینے لگے ہیں، اس لئے گذشتہ نسلوں کی کوشش سے علوم و فنون جس معراج کمال کو پہونچ گئے ہیں، اس سے اتر کر قعر ضلالت و جہالت میں گر پڑتے ہیں۔

لیکن میں امیل کی تعلیم میں یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہتا، میں تاریخ طبعی سے پہلے اس کو خود موجودات عالم کی حقیقت بتانا چاہتا ہوں، علم طبعی سے پہلے اس کو حرارت، روشنی، اور برقی قوت کے کرشمے دکھانا چاہتا ہوں، اور علم ہئیت سے پہلے اس کو اجرام

سماویہ کی تشکل اوران کی ترتیب سے واقف کرانا چاہتا ہوں، بلکہ میرا ارادہ تو یہ ہو کہ قانون فطرت کی جو تعلیم میں نے اس کو دی ہے، آیندہ زمانے میں اس کی تشریح سے زیادہ اس میں نظرو فکر کا مادّہ پیدا کروں کیونکہ بچّے کی تعلیم خود کوئی قابل لحاظ چیز نہیں، اصلی چیز یہ ہے کہ ذرائع تعلیم خود اس کے سامنے آئیں اوراس کو اپنی طرف متوجہ کریں۔

اس تفصیل کے بعد تمہارا فرض یہ ہے کہ تم خود امیل کی کتاب بنجاؤ، اور چھوٹی چھوٹی درسی کتابوں سے مدد نہ لو اس کے لئے سادہ سادہ مفہوم جو اس کی عقل کے مناسب ہوں تلاش کرو، اور جس قدر اس کو تدریجی ترقی حاصل ہوتی جائے تم بھی ترقی کرتی جاؤ۔

ہمارے اخلاقی مصنّف جانوروں کے ان خصوصیات سے اپنی کتابوں، کو دلچسپ بناتے ہیں، اور بچّوں سے ان جانوروں کے قصّے یاد کرائے جاتے ہیں، اور مجھ کو بھی اس سے انکار نہیں کہ جانوروں کی زندگی عبرت و بصیرت سے لبریز ہے، لیکن کیا اس بچّے کے لئے جو ان جانوروں کے اخلاقی خصوصیات کو ازبر کرتا ہے یہ مناسب نہ ہوگا کہ خود ان جانوروں کو دیکھ کر ان کے متعلق حقیقی معلومات حاصل کرے؟ ہم نے بہت سے لڑکے دیکھے ہیں جنھوں نے شہروں میں پرورش پائی ہے، اور ان جانوروں کے قصے یاد کئے ہیں، لیکن انہوں نے عمر بھر ان جانوروں کو نہیں دیکھا ہے، اس لئے وہ ان کے اخلاق وعادات سے بالکل ناواقف ہیں۔ میرے نزدیک دور جدید کے موجدین، اصول تعلیم و تربیت سے سلیمان علیہ السّلام زیادہ عقلمند تھے، جب انہوں نے ایک کاہل آدمی سے کہا کہ "تمکو چیونٹیوں کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنی چاہئیے"، کیونکہ اس سے انہوں نے اس کو علم الاخلاق کے سرچشمے کی طرف ہدایت کی،

اٹھائیسواں خط

از ڈاکٹر ار اسمس بنام ہیلانہ

تصویر اور نمائش گاہ کی فوائد

ابتدائی سن میں خصوصیت کے ساتھ بچوں کے دل و دماغ پر جو تربیت گاہوں کا جو اثر پڑتا ہے، اس سے مربیان اطفال ہمیشہ بے پرواہی، لیکن اگر مجھے خود کسی مدرسہ کے قائم کرنے کا اتفاق ہوتا تو میں اس کے در و دیوار میں علمی روح پھونکدیتا۔

ہمارے قدماء نے تعلیم بالمشاہدہ کے راز کو معلوم کرکے بالکل قوانین فطرت انسانی کی پیروی کی تھی، دور قدیم اور دور جدید میں پادریوں اور رہبانوں نے جو عبادت گاہیں، جو گرجے اور جو مجسمے وغیرہ قایم کئے تھے وہ ان کے عقائد و مذاہب کی ایک کتاب تھے جو تمام دنیا کی سامنے کھولی گئی تھی۔

آج تک جو اعمال و عبادات قائم ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جن تصویروں میں خوش اعتقادی کا رنگ بھر دیا جاتا ہے، عوام کے دل و دماغ پر ان کا اثر کس قدر کالنقش فی الحجر ہو جاتا ہے، خیالات و اعتقادات فنا ہو جاتے ہیں، لیکن جن شاندار تصویروں نے ان کو نمایاں کیا ہے وہ عام طور پر باقی رہجاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج تک بُت پرستی کے مظاہر قایم ہیں۔

بہر کیف جب ہم نے معبودان باطل کے لئے عظیم الشان ہیاکل قایم کئے ہیں، تو علم کے لئے ایک ہیکل کیوں نہ قایم کریں؟ اس کے لئے سونے، سنگ مرمر، اور عمدہ لکڑیوں کی ضرورت نہیں، جن کی قیمت کا بار ہمارا قومی خزانہ نہیں اٹھا سکتا، ہیکل سلیمان کو جن قیمتی دہاتوں نے شاندار بنایا ہے ہم اس سے بالکل بے نیاز ہیں بلکہ اگر ہم کو ہوشیار

کاریگر ہاتھ آجائیں تو چونا اور پتھر اس ضرورت کو کامیابی کے ساتھ پورا کر سکتے ہیں، آج ہزاروں مصنوعی اور اصلی تصویریں بہت کم دام پر میسّر آسکتی ہیں، ہمارے تھیٹروں اور بائیسکوپوں میں جو تصویریں نمایاں کی جاتی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے مصوّروں نے یہ قدرت حاصل کرلی ہے کہ وہ اپنے قلم کی گردش سے ہم کو نہایت آسانی کے ساتھ روما اور ایتھنز میں پہونچا سکتے ہیں، اگر عمدہ آب و رنگ کے ساتھ کسی چیز کی تصویر کھینچ دی جائے تو وہ وہی اثر پیدا کرسکتی ہے، جو خود اصل شے کے مشاہدے سے پیدا ہوسکتا تھا۔

تمام مذاہب نے تخلیق دنیا اور نظام عالم کے متعلق جو رائیں قایم کی ہیں، ان کا سمجھنا نہایت مشکل ہے، اس بنا پر اگر ان نقش و نگار نے ان کو مجسم کرکے نہ دکھایا ہوتا تو عام لوگوں کے لئے ان کا سمجھنا ازبس مشکل ہوتا، لیکن میں جو علمی ہیکل قایم کرنا چاہتا ہوں وہ بچوّں کے لئے حوادثات عالم کی ایک نمایش گاہ، بلکہ اس دنیا کی زندہ تاریخ ہوگا جس میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں، ہمارے عجائب خانوں، اور ہمارے کتب خانوں میں پراگندہ طور پر اس ہیکل کے تمام مادّی اجزار موجود ہیں، لیکن بچوّں کو ان مقامات میں انکی جستجو کی تکلیف دینا مناسب نہیں، کیوں کہ ان مقامات میں جو ڈھانچے، جو جانور، اور جو ٹوٹے پھوٹے مجسّمے موجود ہیں ان سے صرف علمار فائدہ اٹھا سکتے ہیں، بچوّں کے لئے ایک ایسی نمایش گاہ قایم کرنے کی ضرورت ہے، جس میں انسان اور دوسری مخلوقات کے عظیم الشان اور زندہ مجسّمے دل کش انداز میں نمایاں کئے جائیں۔

پیرس اور لندن میں جو نمایش گاہیں قایم کی جاتی ہیں، ان سے عام لوگوں نے صنعت و حرفت، وغیرہ کے اصول اُس سے زیادہ سیکھے ہیں، جتنا وہ سیاسی اور جغرافیانہ کتابوں سے سیکھ سکتے تھے، اس لئے اگر خاص طرز تعلیم کے ساتھ ان اشیار کو نمایاں کیا جائے تو اس سے بہت زیادہ فائدہ حاصل ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ ہر سال ان

نمایش گاہوں کا قیام ناممکن ہی، اور ان میں صرف خاص خاص چیزیں نمایاں کی جا سکتی ہیں۔

میں نے چوں کہ ان علمی نمایش گاہوں کی اہمیت کا خاص طور پر اظہار کیا ہی، اس لئے ان کے فوائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں، مثلاً علم کرۂ ارضی کی تعلیم کیلئے جو نقشے تیار کئے گئے ہیں، اور اس کے متعلق جو کتابیں مرتب کی گئی ہیں، انھوں نے اس فن کو طلباء کے لئے نہایت غیر دل چسپ بنا دیا ہی، لیکن ان کے بجائے اگر ایک پردے پر زمین اور زمین کی رہنی والی چیزوں کی شکلیں اس طرح بنائی جائیں کہ جب اس کے کناروں پر روشنی پڑے، تو لڑکے کی آنکھیں دہوکا کھا جائیں، اور اس کو محسوس ہو کہ وہ محیط کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہوا ہی، تو حالت بالکل بدل جائے گی،

امریکہ کے ایک بہادر آدمی کے دل میں نہر مسیسپی کے نقشہ کھینچے کا خیال پیدا ہوا اور وہ اس غرض سے نہایت بیباکانہ طور پر ایک کھلی ہوئی کشتی میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا، اور مشکلات سفر کی کچھ پروانہ کی کشتی چلاتے چلاتے اس کے ہاتھ خشک ہو گئے، دھوپ سے اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا، اور مہینوں انسان کی صورت نہیں دیکھی، شام کو کشتی سے نکل کر باہر آتا تھا، اور اپنے شکار کئے ہوئے جانوروں کو بھون کر کھا لیتا تھا، اس کے بعد اپنی چادر اوڑھ کر سو رہتا تھا، اور اوپر سے کشتی کو ڈال لیتا تھا تاکہ درندوں کے حملے، اور شبنم سے محفوظ رہے، آفتاب نکلنے کے بعد دن بھر نہر میں گھوم گھوم کر نئے نئے مناظر کی جستجو کرتا تھا، اس لئے اس کو کہیں ایک گہری خلیج ملتی تھی، کہیں چڑیوں کے جھنڈ نظر آتے تھے، اور کہیں چھوٹا سا سرسبز جزیرہ مل جاتا تھا، اور وہ ان سب کا نقشہ کھینچ لیتا تھا، ان تمام مراحل سے فارغ ہو کر اس نے لکڑی کا ایک گھر بنایا، اور اس میں ایک طویل کپڑے پر یہ تمام تصویریں نمایاں کیں۔

آج اگر ہم میں بھی اس قسم کے، بہادر، اور مخلص مصور پیدا ہو جائیں تو کرۂ ارض کی

متعلق ہماری معلومات میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے۔

اُنتیسواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر اراسم

میجک لینٹرن، تھیٹر، اور نمائشگاہوں کی ذریعہ سے تربیت و تعلیم

آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ جس قسم کا علمی ہیکل آپ قایم کرنا چاہتے ہیں، وہ موجود نہیں ہی، سڈنہم میں جو لندن سے نہایت قریب ہی، اس قسم کا ایک ہیکل موجود ہی، جس کا نام قصر بلوری ہی، امیل میں اس کے مواد تعلیمی کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جائے گی تو میں بشرط فرصت خود اس کا معائنہ کروں گی، یہ سچ ہے کہ اس کی تعمیر بالکل آپ کے اصول کے مطابق نہیں ہوئی ہے تاہم اس کی تعمیر کا مقصد آپ کے مقصد سے بالکل متحد ہی، لیکن آپ اس کو حیرت کے ساتھ سنیں گے کہ اس قصر کی تعمیر میں گورنمنٹ کی کوئی اعانت شامل نہیں ہی، اس کے تمام وسیع باغات، بلوری عمارت، آثار قدیمہ، تصویریں مجسمے، اور تمام مفید چیزیں سب کے سب ایک کمپنی کی ملکیت ہیں۔

مشہور عالموں، مشہور کاریگروں، اور علم الآثار کے مشہور فاضلوں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا ہی، تمام چیزوں کو خود ڈھالا ہے، اور اشیاء کی تصویریں خود حاصل کی ہیں، انگریزی قوم کا ایک عام خاصہ یہ ہی کہ جب وہ پبلک فائدی کے لئے کوئی عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہی تو اپنی آزادی، قوت عمل، عزم، اور شجاعت کی بنا پر حکومت سے کسی قسم کی مدد نہیں لیتی، بلکہ خود اس کام کو انجام دے لیتی ہی۔

آپ کو شکایت ہی کہ ہمارے یہاں پیرس میں بچوں کے لئے کوئی مخصوص تھیٹر نہیں ہی، لیکن انگلستان میں ایک تھیٹر صرف بچوں کے لئے مخصوص ہی، یعنی عید میلاد کی صبح

کو اکثر تھیٹروں میں بڑے لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی، بڑے لوگوں میں صرف وہی لوگ ان میں جا سکتے ہیں جو خرافات قدیمہ کے سننے کے شائق ہوتے ہیں، ورنہ عام طور پر یہ تھیٹر بچوں کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں، مجھ سے بعض لوگوں نے وثوق کے ساتھ بیان کیا کہ ان تھیٹروں میں، دن میں دو بار تماشا کیا جاتا ہی، جو لڑکے زیادہ جاگ نہیں سکتے، اون کے لئے بعد ظہر تماشا ہوتا ہے، باقی ماں، باپ، بوڑھوں، اور کسی قدر بڑے بچوں کے تماشے کے لئے شام کا وقت مخصوص ہے، اس تماشے کا لطف یا تو بچے اٹھا سکتے ہیں، یا وہ لوگ جو بہ تصنع بچے بنگئے ہیں، کیوں کہ اس کے بغیر جناتوں کے قصوں اور دوسری مضحکہ انگیز چیزوں میں لطف نہیں آسکتا۔

البتہ یہ افسوسناک بات ہی کہ ان تھیٹروں میں جو ایکٹ کئے جاتے ہیں ان کی موضوع نہایت مبتذل ہوتے ہیں، اور ان سے صرف تعجب اور حیرت کے احساس کو برانگیختہ کیا جا سکتا ہی، تاہم لڑکے اپنی فطری سادگی کی بنا پر ان سے نہایت مسرور ہوتے ہیں اپنی انتہائی شوق کا اظہار کرتے ہیں، اور شدت فریفتگی سے ان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں، لیکن باوجود اس ابتذال کے، ان میں لڑکوں کو جو طلسمی محل نظر آتے ہیں، آگ اور سونے کی جو بارش ہوتی ہے، قطب کی مختلف الالوان صبح کا جو منظر دکھایا جاتا ہی، بادلوں، درختوں اور پھولوں میں رہنے والی جو عورتیں نمایاں کی جاتی ہیں، ان کے فوائد کو چشم حقارت سے نہیں دیکھا جا سکتا، یہ عامیانہ اور خیالی چیزیں جو تمسخر انگیز طریقے پر دکھائی جاتی ہیں، ہم کو تھوڑی دیر تک رسم ورواج کی پابندیوں سے آزاد کر دیتی ہیں، اور بچوں اور عام آدمیوں کو ہمیشہ سے ان کے ساتھ دلچسپی اور فریفتگی ہی۔

تیسواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر اراسم

سیر و سیاحت کی عملی تعلیم، بچّوں کو کھلونوں کے ذریعہ سے صنّاعی کی تعلیم

امیل میں سیر و سیاحت کا فطری مادّہ پایا جاتا ہے، اور یہ ملکہ اس میں اس قدر راسخ ہو گیا ہے کہ وہ اب کھویا نہیں جا سکتا، گم گشتگی کی حالت میں وہ خود اپنا راستہ ڈھونڈھ لیتا ہے، اور مصنوعی علامتوں کا محتاج نہیں ہوتا، وہ جس طرف جانا چاہتا ہے، اس کا پتہ ہوا کے رخ، اور بادل کی حرکت سے لگا لیتا ہے، اور میرے خیال میں اوس نے کا بیڈن کی رفاقت میں عملی طور پر یہ استعداد حاصل کی ہے۔

اس قسم کی باتیں بدیہات میں داخل ہیں، اس لئے بچّوں کے لئے ان کا سیکھنا نہایت ضروری ہے، میں نے خود ایک ایسے مدرسے میں تربیت پائی ہے، جس میں تمام لڑکیاں مدرسہ کی چار دیواری کے باہر کے حالات سے بالکل غافل و بے پروا تھیں، اس لئے مدرسہ سے نکلنے کے بعد بھی جب میں کھیتوں اور باغوں میں نکلتی تھی، تو مجھ کو اتر، دکھن، اور پورب اور پچھم کی تمیز نہیں ہوتی تھی، اور اپنی جہالت کے اظہار کے خوف سے مجھے تم سے پوچھنے میں نہایت شرم معلوم ہوتی تھی، اگر یہ جہالت مجھی تک محدود ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن بہت سے علماء بھی ان کے متعلق مجھ سے زیادہ علم نہیں رکھتے میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ امیل ایک بڑا سیاح ہو گا، تاہم میرے نزدیک انسان کو اپنی تمام ادوار زندگی میں زمین کی اطراف و جوانب، اور اس کے جہات و مقامات کے جاننے کی ضرورت ہے، اور اس ضرورت کے مدارج مختلف ہیں۔

امیل انگریزوں کی طرح کھانے کا عادی ہو گیا ہے، یعنی داہنے ہاتھ میں چھری اور

بائیں ہاتھ میں کانٹا لیکر کھاتا ہے، پہلے پہل تو مجھے اس کی یہ عادت ناگوار معلوم ہوئی، لیکن اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ کھانے کے اس طریقہ میں آسانیاں ہیں۔

میں نہیں جانتی کہ ہم نے اپنے بعض اعضاء کی عملی مشق کو کیوں ترک کر دیا ہی؟ کیا زمین کی آبادی، اور مادی مشکلات کے مقابلے کے لئے ہم کو جن اعضاء کی ضرورت ہی، ہمارے پاس کچھ اعضا اس ضرورت سے فاضل ہیں؟

میں نے انگلستان کے مشہور مہندس جیمس واٹ کی سوانح زندگی میں پڑھا ہی کہ وہ اپنے بچپن میں اپنے لیئے جو کھلونے بناتا تھا، ان میں اپنے باپ کے (جو بڑھئی تھا) اوزاروں سے کام لیتا تھا، رفتہ رفتہ اسی مشق نے اس کے ہاتھوں کو صناعی کے قابل بنادیا، اور اس میں آلات کے اختراع وایجاد کی جو قابلیت موجود تھی، اوس کو اس قدر ترقی دیدی کہ وہ ایک ملکہ راسخہ بنگئی، اگرچہ میری یہ خواہش نہیں ہی کہ امیل بھی آلات جدیدہ کے مخترعین میں داخل ہو، تاہم میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ اس کو اپنی انگلیوں کے حرکت دینے کا سلیقہ آجائے، یہی وجہ ہی کہ جب وہ اپنے کھلونے کو توڑ کر اس کے اندر کی چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہے تو میں اس کو منع نہیں کرتی۔

میں چونکہ امیل کو لیکر قصر بلوری یا کسی تھیٹر میں نہیں جاسکتی تھی، اس لیئے میں نے میجک لینٹرن سے فائدہ اٹھانا شروع کیا آپ کو اس پر ہنسی تو ضرور آئے گی، لیکن اگر لطف و مسرت کے ساتھ اس کو تعلیم کا ذریعہ بھی بنایا جائے تو کیا خرابی ہی؟ میجک لینٹرن میں صرف یہ عیب ہی کہ اس میں مضحکہ انگیز تصویریں نمایاں کی جاتی ہیں، اس لئے جب تک حقیقی تصویریں نہ دکھائی جائیں وہ مفید نہیں ہوسکتی، لیکن اگر علمائے فن مصوروں کی رہنمائی کریں، اور ان کو شیشے پر تصویر اتارنے کا طریقہ بتائیں، تو دونوں کے اتحاد عمل سے طلباء کو حقیقی فوائد پہونچنے لگیں۔ میں نے سنا ہی کہ انگلستان کے مربیان اطفال نے علم ہیئت، جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم کے لئے بعض مدارس میں اسی طریقہ سے کام لیا ہی،

آپ کو معلوم ہی کہ علمائے ہئیت نے آسمانوں کی عظیم الشان تصویریں کھینچی ہیں، اور دُمدار ستاروں، شہاب ثاقب اور گہن وغیرہ کے نقشے لیکر فوٹو گراف کے ذریعہ سے ان کی تصویریں لی ہیں، اسی طرح اگر ہم میجک لینٹرن کو جو اس وقت خرافات و توہمات کا مظہر ہے، حقائق کا مظہر بنانا چاہیں تو اس کے شیشے پر آسمان کی فطری تصویر نہایت وقت نظری کے ساتھ کھینچ سکتے ہیں۔

لیکن اگر ہم زمین کا نقشہ دکھانا چاہیں تو میرے خیال میں تمام پہاڑوں، تمام نہروں تمام بیابانوں، اور تمام ساحلوں کی تصویریں اس کے ذریعہ سے نمایاں نہیں کی جا سکتیں، اس لئے جن تصویروں کا کھینچنا ممکن ہو ان ہی پر قناعت کرنی چاہئے، لیکن لڑکوں کو اجمالی چیزوں سے زیادہ تفصیلی چیزوں کے دیکھنے میں لطف آتا ہی، اس لئے جب وہ ملکوں کی تصویریں اور ان کے نقشے دیکھے گا تو وہ قدرتی طور پر حیرت انگیز چیزوں، مثلاً عجیب و غریب چٹانوں، عجیب و غریب پودوں، عجیب و غریب جانوروں، اور ہم سے مختلف رنگ روپ کے انسانوں کے دیکھنے کا خواستگار ہوگا، البتہ میجک لینٹرن میں فن تاریخ کی تعلیم کی کافی صلاحیت موجود ہی، اور اس کی سطح پر گذشتہ بہادروں کی اصلی شکل کے ساتھ خرافات قدیمہ مثلاً ابوالہول، پردار بیل، اور پریوں وغیرہ کی تصویریں بھی کھینچی جا سکتی ہیں۔

بد قسمتی سے میں نہ عالمہ ہوں، نہ مصوّرہ، البتہ اپنی حالت کے مناسب تصویر کھینچ سکتی ہوں، اور آپ نے کبھی کبھی میری مختلف الالوان تصویروں کو پسند بھی کیا ہی، تاہم میں شیشے پر تصویر نہیں لے سکتی، یہ ایک مستقل فن ہی جو تعلیم و تعلم کا محتاج ہی، لیکن مجھے فخر ہوگا اگر امیل کو اس فن کے سیکھنے میں مجھ پر تفوق حاصل ہو جائے میری لئے سب سے زیادہ مشکل یہ ہی کہ عمدہ تصویریں نہیں ملتیں، اور میں اپنے بچے کی سامنے اصلی صورتوں میں تمام چیزوں کو نمایاں کرنا چاہتی ہوں۔ ڈاکٹر وارنگٹن نے جو اکثر

خیالات میں مجھ سے متفق ہیں، مجھ سے وعدہ کیا ہی کہ وہ میرے لئے لندن سے عکسی تصویروں کا انتخاب کردیں گے، اور علمائے طبعیین ، علمائے آثار قدیمہ، اور سیاحوں سے جو تصویریں حاصل کی گئی ہیں وہ بھی عنایت کریں گے اور میں ان کی اعانت سے اپنے بچے کی تعلیم کے لئے چھوٹا سا دارالتربیت قایم کرسکوں گی۔

مجھ کو لڑکوں کے کھیلوں کی طبعی خصوصیات نمایاں نظر آئیں، جن میں ان کی نشو و نما میں ان ملکوں کی ہوتی ہی، مثلاً ساحلی مقامات کے کرتے وہی کھیل کھیلتے ہیں، جن کا شوق فن ملاحی سے پیدا ہوتا ہے، امیل اور اس کے دونوں رفقاء کے دل میں بھی یہی شوق پیدا ہوا، اس لئے کابیڈن نے ان کے لئے ایک بادبانی جہاز بنادیا، جس کو انہوں نے ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ سمندر میں اتارا، اس کے بعد انہوں نے ایک بیڑا تیار کیا جو متعدد کشتیوں سے مرکب تھا، اور کشتیوں میں بعض لکڑی کی توپوں سے مسلح تھیں، اور گویا یہ بچے زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ "ہم تیار ہیں، لڑنے والے سامنے آئیں"، لڑکے تاجروں سے جو کشتیاں خریدتے ہیں وہ اگرچہ عمدہ بنی ہوئی ہوتی ہیں، لیکن میں ان کشتیوں کو ان پر ترجیح دیتی ہوں۔

امیل کام کرنا چاہتا ہی، اور عام بچوں کی طرح قصوں اور کہانیوں کے سننے کا نہایت شائق رہتا ہی، اگرچہ مجھے آپ کی اس رائے سے اتفاق ہی کہ لڑکوں سے بہت بات چیت نہیں کرنی چاہئے، بالخصوص جو باتیں ان کی سمجھ سے بالاتر ہیں، ان کا ذکر بھی ان کے سامنے نہ ہونا چاہئے، تاہم اگر دایئں اس قسم کی باتوں سے احتراز کریں تو لڑکے ان کی زبانی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

مجھ کو اس نظریہ کی طرف اس بنا پر توجہ ہوئی کہ طریقہ تحریر و کتابت، اور تصنیف و تالیف کی ایجاد سے پہلے تمام قوموں کو اپنی قوت حافظہ پر کامل اعتماد تھا، میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہی کہ جب قدموس نے مصری حروف کو یونان میں منتقل کرنا چاہا، تو بعض

یونانیوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر تاریخی واقعات لکھے جائیں گے تو رفتہ رفتہ قوت حافظہ ضعیف ہو جائے گی، اور ان کی یہ مخالفت بعض حیثیتوں سے بجا بھی تھی، لڑکے لکھنے پڑھنے سے پہلے مختلف قسم کے افکار و خیالات رکھتے ہیں، اس لئے مربی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ ان کے لئے بہترین علوم و معارف کا انتخاب کرے، اس کے بعد بہترین طریقے سے ان کو ان کے سادہ دماغ میں پہونچائے، اسی بنا پر مجھ کو امیل کی تعلیم میں اپنی زبان کے اسلوب اور اس کی اصول و قواعد کو چھوڑنا پڑا، لیکن مجھے اس سے نہایت خوشی ہوئی کہ جب میں اس کی زبان میں گفتگو کرتی ہوں تو اس کے کان میری طرف لگ جاتے ہیں، آدمی اگر اپنی ذات کو بالکل بھلا دے، اور اپنے اندر مخلصانہ جذبات پیدا کرے تو اس معاملے میں کامیابی ہو سکتی ہے، لیکن یہ دونوں باتوں صرف مشق و ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ شعر کی ایک خاص قسم ہے جو لڑکوں کے مذاق کے مطابق ہے، اور مائیں اس کو اچھی طرح جانتی ہیں، لیکن ہم ان کو اپنے مذاق کے شعر سناتی ہیں، پھر وہ کیوں کر اس کو یاد رکھ سکتے ہیں؟

دنیا ان کہانیوں سے بھری ہوئی ہے جو خاص طور پر لڑکوں کے لئے بنائی گئی ہیں، اور ان میں بہترین کہانی بر ولٹ کی ہے، لیکن اسمیں جو صناعی اور ذہانت صرف کیگئی ہے، اس نے اس کو ادھیڑوں اور بوڑھوں کے مناسب حال بنا دیا ہے، امیل ان کہانیوں کی طرف نہیں مائل ہو سکتا جن کا تصور بالغ آدمیوں کے ذہن میں آتا ہے، اس سن میں صرف وہی خرافات قدیمہ موثر ہو سکتے ہیں، جن کی فطری شاعرانہ آب و رنگ کو درہمی تکلفات نے ضائع نہیں کیا ہے۔

ہمارے شہر میں جو کہانیاں عام طور پر مشہور ہیں، وہ، وہ ہیں جن میں بھوت پریت چڑیل، شیطان اور اژدہوں کا ذکر ہے، اور وہ اس قدر دلچسپ ہیں کہ ان کو سنکر جاڑوں کی

راتوں میں بچوں کی نیند اوڑ جاتی ہے، میرا خیال ہے کہ یہ کہانیاں ان قدیم اشعار اور قصائد سے ماخوذ ہیں جن کو مقبل روایات نے ہم تک کسی قدر مسخ شدہ صورتوں میں پہونچایا ہے، ڈاکٹر وارنگٹن کے مکان پر مجھ سے کبھی کبھی ایک عالم سے ملاقات ہو جاتی ہے، جو بعض ذرائع سے ان مزخرف کہانیوں کی اصل دریافت کرنے کے مدعی ہیں، جہاں تک میں اس ذریعہ کو سمجھ سکی ہوں وہ یہ ہے، کہ وہ ان کہانیوں کے لب ولہجہ اور ان کے معانی ومطالب کو ہماری ایجاد کردہ کہانیوں سے ملا کر دیکھتے ہیں کہ ان میں تشابہ پایا جاتا ہے یا نہیں؛ اس طرح یہ کہانیاں جس قدر ہمارے خیالات واختراعات سے بے میل نظر آتی ہیں اسی قدر ان کی قدامت ثابت ہوتی ہے، مثلاً جب ہم ان کہانیوں میں چڑیلوں کی نسبت گفتگو کرتے ہیں تو ہم کو نظر آتا ہے کہ وہ زمانہ قدیم میں انسانوں سے الگ تھلگ رہتی تھیں، سخت بدخو اور نافرمان تھیں، ایک طبعی قوت تھیں جن کو خدائی اقتدار حاصل ہو گیا تھا اور وہ مذہبی لباس میں نمودار ہوئی تھیں، اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ انسانوں سے قریب تر ہوتی گئیں، یہاں تک کہ خود ان کی شکل میں تبدیلیاں ہونی لگیں، اور یہ میل جول اس قدر بڑھا کہ مردوں سے ان کی شادیاں ہونے لگیں، بعینہ اسی طرح زمانہ قدیم میں شیطان بھی، ایک وحشی، کریہ المنظر، اور خطرناک مخلوق خیال کئے جاتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ انسانوں سے ان کے معاشرتی تعلقات پیدا ہو گئے، اور اب ان کا اقتدار، ان کا خیالی اثر، اور ان کا رعب وداب ایک تمسخر انگیز حقیر خیال کیا جانے لگا، اور اس طرح خرافات قدیمہ کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

آپ کو یعقوب کا قصہ معلوم ہو گا جس نے خرافات قدیمہ کی روایات کے بموجب ایک بھوت کو قتل کر دیا تھا جو انسانوں اور جانوروں کو اچک لیجاتا تھا، اس لئے اہل اس بہادر نوجوان کے جنگی تذکروں کو نہایت پسند کرتا ہے۔

قدیم دور وحشت میں حامیان حق وصداقت کی سب سے بڑی خدمت یہ خیال

کی جاتی تھی کہ وہ راہزنوں اور موذی جانوروں کو قتل کر کے دنیا کو ان ظالموں کے شکنجے سے رہا کردیتے تھے یہی وجہ ہے کہ یونانیوں نے ہرقل[1] اور تیزیہ[2] کی جو عظمت تسلیم کی ہے اس میں وہ حق بجانب ہیں یعقوب نے بھی بھوت کے ساتھ اسی قسم کا مردانہ کام کیا تھا اس لئے وہ بجا طور پر قدیم بہادروں کا جانشین ہو سکتا تھا۔

ان خرافات میں بعض خوبیاں ایسی ہیں کہ اگر ان کو زبانی تعلیم کے نصاب سے الگ کر دیا گیا تو اس پر مجھ کو نہایت افسوس ہوگا، کیوں کہ اس سراپا حقیقت دور میں بچّے کے سامنے ایک ایسا طویل زمانہ جس میں وہ ہماری نہایت ذلیل عادتوں کو نہایت آسانی کے ساتھ سیکھ سکتا ہے، اس لئے اس کی زندگی کے ان مختصر لمحات کو غنیمت سمجھنا چاہئے، جن میں وہ ان مزخرف باتوں سے خوش، اور ان سے اثر پذیر ہوتا ہے، تاکہ ہم اس میں مختلف قسم کے جذبات عالیہ پیدا کر سکیں، اور اس کو بڑے بڑے کاموں کا حوصلہ دلا سکیں، کیونکہ لڑکا صرف ان ہی چیزوں کے قالب میں ڈھل سکتا ہے، جس کو وہ موقر اور معزز سمجھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اصل شیطانوں کا قائل نہیں ہو سکتا، آج خود شیطانوں کا وجود کہاں ہے؟ تاہم کم از کم ان قصوں کا اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ بہادروں کے جنگی کارناموں سے اس کے نفس میں ایک حرکت اور اس کے دل میں ایک بہادرانہ نشاط پیدا ہوگا۔

ہم ایک ایسی زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں ہمارے مطلوبہ کمالات ہم کو حاصل ہوں اس لئے ہم کو ان بہادروں کی فرضی شجاعت سے بھی فریفتگی کا اظہار کرنا چاہئے تاکہ ہم بزدلی کے انتہائی درجے تک نہ پہونچ جائیں، اگرچہ یہ تمام بھوت پریت ایک خیالی چیز ہیں، تاہم میرے نزدیک بچّوں کے دل سے ان خیالات کا محو کر دینا بھی مفید

---

[1] یونان کا ایک بہادر جو اژدہوں اور موذی جانوروں کو مار ڈالتا تھا۔ [2] یونان کا ایک مشہور بہادر جو آدھا آدمی اور آدھا بیل تھا۔

نہیں ہی، اس قسم کے عجیب وغریب قصّے جو لڑکوں کو فریفتہ کر لیتے تھے، اب فراموش کر دئے گئے ہیں اور اب وہی قصّے تصنیف کئے جاتے ہیں، جن کی نظیر انسان کے واقعات زندگی میں مل سکتی ہی، اور چونکہ ہم حقیقی واقعات پر اعتماد کرتے ہیں، اور ان متمدن شہروں میں رہتے ہیں جہاں وہم وخیال کا گذر بھی نہیں ہو سکتا، اس لئے ہم بچّوں کے دل میں بھی اسی قسم کا ذوق اور اسی قسم کی خواہشیں پیدا کراتے ہیں۔

یہ سچ ہی کہ ان خرافات میں جس محاسن اخلاق کا تذکرہ ہوتا ہے دنیا میں ان کا نام ولنشان نہیں مل سکتا، لیکن اس کی وجہ یہ ہی کہ جو ہستیاں ان اوصاف کے ساتھ متصف ہوتی ہیں، ہم بچّوں کی طرح ان کو عالم خیال میں نہیں لا سکتے، اس لئے میں مربیان اطفال کو قسم دلاتی ہوں کہ وہ ان خیالی ہستیوں کو اپنے گھروں میں یہ دعا دیں

اے چڑیلوں، اور بھوتوں کے عالم خیال! اے وہ کہ جس نے بچپن میں ہمارے دلوں میں اہتزاز پیدا کیا، اور چہرۂ کمال کی نقاب کو اُلٹ کر، اور مظہر جمال و جلال کو بے پردہ کر کے، ہمارے دلوں میں روحانی فضائل کی تحریک پیدا کی، تو ہمیشہ باقی رہ، اور اس نافرجام زمانے کی فضا سے جو طرح طرح کے رنج وغم کے بوجھ سے گرانبار ہو رہا ہی جس میں تمام لوگ مادّی اغراض اور جسمانی فوائد میں مشغول ہیں غائب نہ ہو، کیوں کہ اگر ہم نے اپنے بچّوں کے دل سے تیری خیالی عظمت کے اعتقاد کو مٹا دیا تو ہم ذلیل ہو جائیں گے، اسی خیالی عظمت نے ہم کو ذاتی حسن اور حقیقی عظمت کا سبق پڑھایا ہی۔

اگرچہ ان خرافات کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہی، تاہم وہ زندگی کے ایک مخصوص دور میں ایک مستحسن چیز ہیں مثلاً ایک چیز جو ہم کو غیر حقیقی معلوم ہوتی ہی وہی لڑکوں کے سامنے حقیقی شکل میں نمایاں ہوتی ہے، میں نے خود امیل کے طبعی میلان سے اس کا اندازہ کیا ہی، مثلاً اس نے اب تک اگرچہ کوئی مذہبی بات نہیں سنی ہی، تاہم وہ ایک خاص حیثیت سے مذہب

کا پابند ہی، اور ایسی ایسی خیالی صورتیں پیدا کرتا ہی، جو بچپن ہی کے زمانہ کے ساتھ مخصوص ہیں اور وہ زندگی کے اور تمام دوروں میں آہستہ آہستہ فنا ہوتی جاتی ہیں، اس کو بارش، ہوا اور غروب آفتاب غرض تمام حوادثات عالم کے اندر ایک زندہ قوّت بلکہ ایک مجسّم ہستی نظر آتی ہی اور وہ اس سے مرعوب ہوجاتا ہی، چنانچہ اس نے باغ میں ایک دن بادل کا ایک ٹکڑا جو عجیب و غریب شکل میں نمایاں ہوا تھا دیکھا تو گھبراہٹ کے ساتھ بھاگتا ہوا میری پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس نے اس میں ایک بڈھے کا سر دیکھا ہے جس کی داڑھی سفید تھی، کیا اس قسم کے پر عظمت اور پر جلال خوف کا یہ احسان نہیں ہی کہ اس نے اول اول انسان کے دل میں خدا کا تصوّر پیدا کیا۔

اکتیسواں خط

از ہیلا بنام ڈاکٹر اراسم

پڑھنے، لکھنے، اور تصویر کشی کی تعلیم

پڑھنا تو ایک طرف، امیل حرف آشنا بھی نہیں ہوا، اور اس میں سراپا میرا ہی قصور ہی، چونکہ میں ابتدائی جبریہ تعلیم سے جس میں لڑکوں کی آزادی چھین کر ان کو بالکل مسلوب الاختیار کر دیا جاتا ہی، سخت نفرت کرتی تھی اس لئے میں نے خود امیل کو تعلیم کے لئے بہت کم آمادہ کیا۔

اگر میں امیل کو یہ کہکر آمادہ تعلیم کروں کہ دوسرے بچّے تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو یہ اس پر سخت ظلم ہوگا کیوں کہ اس استدلال کا نتیجہ یہ ہے کہ بچّے کے تمام اخلاق و عادات کو لوگوں کی اندھا دھند تقلید کے قالب میں ڈھال دیا جائے، اور عیب و ہنر میں کوئی تفریق نہ کی جائے، لیکن اس دشوار گذار راستے کے اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہی؟ ہم اس کو خود مطالعہ کی لذت سے تعلیم کا شوق دلا سکتے ہیں۔

میں اس ذریعہ کی تلاش میں سرگرم ہوں جس سے امیل کے دل میں چھپے ہوئے حروف کے جاننے کا شوق پیدا ہو۔ میرے خیال میں اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ عجیب وغریب کہانیاں جن سے وہ دلچسپی حاصل کرتا ہے، سب کی سب کتابوں سے ماخوذ ہیں، تو ان کہانیوں کے اصلی ماخذ کا شوق اس کے دل میں خود بخود پیدا ہو جائگا اور اس شوق کے بعد وہ خود ان ذرائع کو تلاش کرلے گا جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے، میں اس بہترین ذوق کے پیدا ہونے کا انتظار کر رہی ہوں، لیکن اس میں بڑی دیر ہو رہی ہے۔

پڑھنے کا ملکہ اگرچہ ہم لوگوں میں اس قدر راسخ ہو گیا ہے کہ وہ ایک چھوٹا حاسہ بنگیا ہے، لیکن با ایں ہمہ وہ دشواریاں جو لڑکوں کو حروف ہجائیہ کے پہچاننے میں پیش آتی ہیں، اب تک نامعلوم ولاینحل ہیں، میرے خیال میں پڑھنے اور لکھنے کے سوا اور تمام علوم ایک دوسرے کے مساعد ومددگار ہوتے ہیں، یعنی چونکہ ان میں باہم تعلقات ہوتے ہیں، اس لئے طالب العلم جب ایک فن کو حاصل کرلیتا ہے تو اس میں دوسرے علم کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن فن قرأت اور فن کتابت کی حالت ان تمام علوم سے مختلف ہے، کیونکہ حروف کی شکلیں جن چیزوں پر دلالت کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں ان میں باہم کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے طالب العلم جب ایک شخص کا نام سنتا ہے، اور پھر اس کو کتاب میں لکھا ہوا دیکھتا ہے، تو اس کو حیرت انگیز طریقہ پر دفعتاً معلوم ہو جاتا ہے کہ اسم ومسمیٰ میں باہم کوئی ربط نہیں ہے، مثلاً امیل جن لوگوں کو دیکھ چکا ہے، ان کی تصویروں کے ذریعہ سے ان میں باہم نہایت آسانی سے امتیاز کرلیتا ہے، کیونکہ تصویر اور مصور قریب قریب ایک ہی ہوتے ہیں، لیکن مسمیٰ اور اس کے لکھے ہوئے نام میں کسی قسم کا اتحاد نہیں ہوتا، تو کیا تصویر کشی اور تحریر کتابت میں باہم کوئی تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے؟ میں آپ سے اس کا جواب چاہتی ہوں۔

امیل اگرچہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتا، لیکن نقاشی اور تصویر کشی سے بہر حال واقف ہی، تو کیا وہ فطرتاً مصور پیدا ہوا ہی؟ اس کی آڑی ترچھی کھنچی ہوئی لکیروں سے اگرچہ یہ اعتقاد ضعیف ہو جاتا ہے، لیکن وہ بہر حال آدمیوں، جانوروں اور مکانوں کی تصویر کھینچتا ہے، اور نہ صرف تصویر کھینچتا ہی، بلکہ ان تصویروں کے ذریعہ سے وہ اپنے جذبات وخیالات کو بھی صفحہ کاغذ پر نمایاں کرنا چاہتا ہی، وہ آپ کے پاس جو تصویر بھیج رہا ہے، اس کا سمجھنا آپ کے لئے مشکل ہو گا، اس لئے میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اس تصویر کے ذریعہ سے اس آندھی کا منظر دکھایا گیا ہی جو اپریل میں متصل تین رات تک یہاں چلتی رہی

بتیسواں خط

از ڈاکٹر اراسمس بنام ہیلانہ

تصویر کشی، کتابت، اور قرأت کی فطری ترتیب

امیل نے جو تصویر بھیجی اس کو پاکر میں نہایت خوش ہوا، بچوں کی صناعیاں ہم کو ہمیشہ صناعیوں کے عہد طفولیت کی یاد دلاتی ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہی کہ تصویر کشی نوع انسان کا ایک فطری بلکہ اور انسانوں اور جانوروں کے درمیان ایک ما بہ الامتیاز چیز ہی، وحشی انسانوں کی زبان اور ان کی تاریخ اگرچہ ہم کو معلوم نہیں ہی، تاہم اس قدر معلوم ہے کہ وہ کسی زمانے میں پتھر یا بارہ سنگھے کے سینگ پر نوک دار پتھروں کے ذریعہ سے متعدد وحشی اور قدیم جانوروں کی بدنما تصویریں کھینچا کرتے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لڑکوں کی تعلیم کی ابتدا پہلے پہل تصویر کشی سے ہونی چاہئے، اور اس کے بعد اس کو تحریر وکتابت کا طریقہ سکھانا چاہئے، تمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ لکھنے کے حروف اور ان کے مدلولات میں کسی قسم کا ربط و علاقہ نہیں ہے، بلکہ وہ صرف ایک وضعی اور اصطلاحی چیز ہیں، کیوں کہ بچوں نے دنیا میں کوئی چیز ایسی

نہیں دیکھی جس کو (ا) یا (ب) کہا جاتا ہو لیکن بایں ہمہ حروف کی ایجاد انسانی عقل کی بہترین یادگار ہے، گذشتہ قوموں نے ایک مدّت کی مزاولت کے بعد اس طریقہ کو ایجاد کیا یعنی پہلے انہوں نے ایک زمانے تک تصویریں کھینچیں، اس کے بعد حروف کو ایجاد کیا، لیکن اس زمانے میں تصویر اور خط کا یہ تعلق بالکل زائل ہو گیا ہے، اس لئے لڑکا جب اس خط کو پڑھتا ہے، تو اس کی سمجھ میں ایک ایسے معنی آتے ہیں، جس کو اس خط سے کسی قسم کا تناسب اور کسی قسم کا ربط نہیں ہوتا، اب بچّے کے ناگوار تشکلات کو دیکھ کر اُستاد گھبرا اٹھتا ہے، لیکن اس خلاف عقل طریقے کی مخالفت میں صرف بچّہ ہی حق بجانب نہیں ہے، بلکہ ہر صاحب ذوق اس کو حق بجانب قرار دیتا ہے۔

خط کے متعلق جس قدر مباحث موجود ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حروف ہجائیہ اول اول بعض چیزوں کی تصویر تھے، اور خط کی ابتدا انہی تصاویر کے اختصار سے ہوئی، چنانچہ حروف ہجائیہ میں اب تک ان تصویروں کے مخفی خال و خط موجود ہیں، اور میں ایک دانشمند آدمی کو جانتا ہوں جو حروف ہجائیہ کو بعض مادّی صورتوں میں منتقل کر دیتا تھا، اگرچہ بعض اوقات اس کی بنیاد تکلّف پر مبنی ہوتی تھی، تاہم حروف اور ان کے معانی میں تطابق اور توافق پیدا کرنے کے لئے میں اس طریقے کو نہایت پسند کرتا ہوں، مثلاً اگر تم آفتاب کا دائرہ بناؤ تو اس کے نیچے فرانسیسی زبان میں آفتاب کا نام یعنی Soleil لکھ دو، اور (او) کو ذرا ابھرا اور نمایاں کر دو، اسی طرح اگر سانپ (serpent) یا پیچدار راستے zigzag یا آنکھ oeil کی تصویر کھینچو تو ان کے پہلے کے حروف یعنی ایس، زیڈ، اور او کو بڑا اور نمایاں کر کے لکھو تو تم کو ان الفاظ کے پہلے حروف اور ان کے معانی میں صاف مشابہت و مماثلت نظر آئے گی یعنی سرپنٹ میں ایس کی شکل، زگزیگ میں زیڈ کی شکل وائل میں او کی شکل علی الترتیب سانپ، پیچدار راستہ اور آنکھ سے مشابہ معلوم ہوگی اور اس طریقے سے امیل یہ سمجھ سکے گا کہ خط بھی تصویر ہی کی ایک شکل ہے، جس کے

ذریعہ سے انسان اپنے مطالب کو نہایت مختصر زمانے میں نہایت وضاحت کیساتھ ظاہر کر سکتا ہے۔

میرے خیال میں تصویر کھینچنا، لکھنا، اور پڑھنا تینوں تین قسم کی مشق ہیں جن میں باہم ایک ایسا ربط و علاقہ پایا جاتا ہے کہ ابتدائی تربیت میں ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا با ایں ہمہ بعض ایسے وجوہ ترجیح موجود ہیں جن کی بنا پر تصویر کشی کو مقدم رکھا جا سکتا ہے، اولاً تو ابتدائی درس و تدریس میں بچّوں کو جو کوفت محسوس ہوتی ہے، تصویر کشی اس کو زائل کر دیتی ہے، کیوں کہ اکثر لڑکے کتابوں کو مبغوض اور تصویروں کو محبوب رکھتے ہیں، بلکہ وہ فطری طور پر جس چیز کو دیکھتے ہیں اس کی تصویر کھینچنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اس لحاظ سے اگر وہ فطرتاً اس کی مزاولت کریں، تو وہ ان کے لئے ایک دل چسپ کھیل بن سکتی ہے۔

مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ انسان فطرتاً مصوّر پیدا کیا گیا ہے، تاہم تاریخ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ تحریر و کتابت اور علوم و فنون کی اشاعت سے پہلے تمام قوموں میں تصویر کشی کا فن موجود تھا، اور تاریخ ہمارے سامنے لڑکوں کے قالب میں روز اپنا اعادہ کرتی رہتی ہے، تصویر کشی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ لڑکے کے قوّت ممیزہ کو ترقی دیتی ہے، تصویر کے ذریعہ سے تمام چیزوں کے اشکال اور ان کے حدود نمایاں کئے جاتے ہیں، اس لئے مصوّر کا یہ فرض ہے کہ وہ جس چیز کی تصویر کھینچتا ہے، اس کی مابہ الامتیاز خصوصیات، اور علامات سے واقف ہو، اس لئے جب لڑکا جمادات، حیوانات اور نباتات کی تصویر کھینچتا ہے، تو اسکو لازمی طور پر ہمیشہ ان چیزوں کے مخصوص اوصاف پر نظر رکھنی پڑتی ہے، اور اس طرح اس کی قوّت ممیزہ کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے، لیکن لکھے ہوئے الفاظ میں اس قسم کے غور و فکر کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی، کیوں کہ طریقہ ترکیب حروف کے معلوم ہو جانے کے بعد لڑکا ہزاروں ذی روح اور غیر ذی رُوح چیزوں کے نام لکھ سکتا ہے، اور اس کو

ان کا مطلق علم نہیں ہوتا۔
جب تک دو چیزوں میں کسی قسم کی مشابہت نہ پائی جائے ان کے متعلق غور وفکر نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اگر لڑکا ابتدا ہی سے غور وفکر کا عادی نہ بنایا جائے گا، تو وہ جو کچھ پڑھے گا اس کے سمجھنے کی بہت کم پروا کرے گا۔
تصویر کشی کی آخری فضیلت یہ ہے کہ وہ بچے میں لکھنے کی ابتدائی استعداد پیدا کرتی ہے، کیونکہ جب وہ تصویر کھینچنے کے لئے ٹیڑھی سیدھی لکیریں بناتا ہے، تو اس سے اس کی انگلیوں میں حرکت، تیزی اور باریکی پیدا ہوتی ہے، اور اس طرح ان خطوط کے کھینچنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے جن سے حروف ہجائیہ بنتے ہیں، لیکن اصلی مقصد یہ ہے کہ ذہن میں مادی تصویر سے معنوی تصویر یعنی خط کی طرف منتقل ہونے کی استعداد پیدا کی جائے، اس لئے اگر ہم تمام محسوسات اور مادیات کی تصویروں کو ان معنوی علامات سے ربط دے سکتے جو ان تصویروں کے قائم مقام ہیں تو ہم کو بڑی کامیابی ہوتی، لیکن یہ نہایت مشکل کام ہے، تاہم علمی حیثیت سے نہایت آسانی کیساتھ تصویر کو ایک حقیر چیز قرار دیا جاسکتا ہے، اس لئے اگر امیل ایک درخت، ایک پھل، یا ایک جانور کی تصویر بنائے تو میں اس سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم نے نامعلوم طور پر بہت سے حروف لکھ لئے، لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل اور حروف موجود ہیں، جن کو صرف اساتذہ لکھ پڑھ سکتے ہیں، اس طرح جب اس کے دل میں حروف کا شوق پیدا ہو جائےگا تو اس نے جس چیز کی تصویر بنائی ہے، میں اس کے سامنے اس کا نام لکھ دونگا، اور جب اس سے اس کو اس کی نقل اوتارنے کی ترغیب دوں گا اس طرح بار بار کی نقل و اعادہ سے اس کو لکھنے کی مشق ہو جائے گی، اور اس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ لوگوں نے تصویر کو کیونکر اصطلاحی حرفوں میں بدل دیا، جو ایک طرف تو تصویر پر دلالت کرتے ہیں، دوسری طرف ان کو تصویر پر یہ فضیلت حاصل ہے، کہ ان کی ضخامت بہت چھوٹی ہے، اور نہایت

مختصر وقت میں لکھے جا سکتے ہیں، لیکن بعض مصورین کے نزدیک زندگی کے ابتدائی دور میں تقلید و محاکات کا بالکل چھوڑ دینا مناسب نہیں ہی، ان کا خیال ہے کہ لڑکا فطرتاً تصویر کشی کی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ اس کو ہوا و ہوس اس طرف مائل کرتی ہیں، اس لئے اگر اس سے یہ کام نہ لیا جائے تو چند روز میں اس کا یہ مذاق خراب ہو جائے گا، لیکن اگر یہ خیال صحیح ہی تو ہم کو فنون لطیفہ کی تعلیم میں بھی تادیب و ولایت کا حق حاصل ہونا چاہیئے، لیکن یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہی، بہر حال مجھے اس کی چنداں پروا نہیں، میرے نزدیک اصل تصویر سازی پر کوئی تمغہ یا انعام حاصل کرنا نہیں چاہتا، اس لئے اگر زمانہ مابعد میں وہ مصور نہ ہو تو اس کی کیا پروا ہی؟ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایک آدمی بن جائے، اور اس میں شبہ نہیں کہ مخلوقات دنیوی کا احساس عقل اور طبیعت کی نشو و نما میں مدد دیتا ہے، اس کی بنائی ہوئی تصویریں کتنی ہی بری ہوں، لیکن ان سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہی کہ وہ اپنے ماحول کی چیزوں پر توجہ رکھتا ہی اور میں سر دست اسی قدر چاہتا ہوں، اگر اس میں فنون لطیفہ کا حقیقی ملکہ ہو گا تو ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو گا، اس چرواہے کی نظیر سامنے ہی، جو بکریوں کے چرانے کی حالت میں خود تصویر بنانا سیکھتا تھا، لیکن جب مدرسہ کی تعلیم نے اس کے اس ملکہ کو مکمل کر دیا تو وہی پروفیسر رفائیل ہو گیا۔

میرے نزدیک پڑھانے سے پہلے لکھنے کی تعلیم ضروری ہی، یا یہ کہ کم از کم ان دونوں کی تعلیم ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے، ایک عالم انڈرویل نامی چند سال سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم کا بہترین طریقہ تلاش کرتا تھا، اتفاق سے اس نے ہندوستان کے ایک مدرسے کے سامنے چند ہندو طلبا، کو دیکھا کہ وہ ریگ کے اوپر اپنی انگلیوں سے کچھ لکھ رہے ہیں، اس نے ان کو غور سے دیکھا اور جب اس کو ان کا طریقہ معلوم ہو گیا تو یہ کہکر اپنا سر پیٹ لیا کہ "میں نے اپنا مقصد پا لیا"، وہ طریقہ کیا تھا؟ وہ ایک نہایت سادہ طریقہ تھا یعنی یہ کہ یہ لڑکے پہلے الفاظ کو لکھتے تھے، پھر ان کی ہجے

کرتے تھے، اس کے بعد ان کو پڑھتے تھے۔

اس طریقہ میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ ہاتھ اور دماغ دونوں کو ایک ساتھ مشغول رکھتا ہے، لڑکا کتاب کے سامنے اس لئے تنگ کر بیٹھ جاتا ہے کہ اس کو بلا سوچے سمجھے اس طرف توجہ کرنا پڑتی ہے، لیکن انسان جب خود بحث و نظر کے بعد معلوم سے مجہول تک پہونچتا ہے، تو اس کو اس قسم کی تکان نہیں محسوس ہوتی،

میں جدید طریقہ تعلیم کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتا، یہ اگرچہ متعدد اور مختلف ہیں، لیکن سب کے سب خیالی ہیں، جو موجودات خارجی پر بالکل منطبق نہیں ہوتے، مجھے یاد آتا ہے کہ ایک شخص نے جوتوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا، جن میں جوتوں کے ہر قسم، ہر ملک، اور ہر زمانے کے نہایت مفید نمونے موجود تھے، اس میں چینیوں کی سلیپریں اور ان کے جوتوں سے لیکر امریکہ شمالی کے وحشیوں کے جوتے اور ترکوں کی سلیپریں تک موجود تھیں، لیکن یہ سب کچھ تو تھا مگر انسان کے پاؤں کا نقشہ اس ذخیرے میں موجود نہ تھا، یہی اعتراض طریقہ تعلیم کے موجدین پر بھی ہو سکتا ہے، وہ سب کچھ سمجھتو ہیں، اور سب کچھ ایجاد کرتے ہیں، لیکن ان میں ایک چیز کی کمی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ کہ زندگی کے مختلف دوروں میں عقل کی جو شکلیں اولتی بدلتی رہتی ہیں ان کو یہ لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

صرف استاد کی صحیح المذاقی ایک ایسا طریقہ تعلیم ہے جو طلبا کے مناسب حال ہو سکتا ہے، میرا یہ مقصد نہیں کہ اس کے سوا اور کوئی دوسرا مفید طریقہ سرے سے موجود ہی نہیں بلکہ میرا اعتقاد تو یہ ہے کہ بہت سے علمی طریقے جن کو غیر متمدن قوموں نے استعمال کیا اور اب استعمال کر رہی ہیں، تعلیم اطفال میں نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں، مثلاً آلۂ حساب صناعی جو بعض مدارس میں حساب کی مشق کے لئے استعمال کیا گیا، اگرچہ میں اچھی طرح اس کے محاسن سے واقف نہیں ہوں تاہم مجھ کو یقین ہے کہ وہ چینیوں سے

ماخوذ ہے، بہرحال میں اس قسم کی نکتہ چینی نہیں کرسکتا، بلکہ غیر متمدن قوموں نے تعلیم کی آسانی کے لئے جو طریقے وضع کئے ہیں، ان کی طرف سے بے اعتنائی کرنے پر بھی متاسف ہوں یہ غیر متمدن قومیں تاریخ کی صغیر السن اولاد ہیں، اور دنیا کے مختلف اطراف میں زبان، کتابت و تحریر، علوم و فنون، صنائع و مذاہب کے جو قوانین موجود تھے، ان سے ہم کو واقفیت حاصل ہو چکی ہے، ہم کو صرف علوم کے ماخذ ہی نہیں معلوم ہوئی ہیں، بلکہ تمدن کے مختلف دور میں الفاظ، اور حروف وغیرہ کے متعلق ہم نے جو بحثیں کی ہیں ان سے ہم کو انسانی استعداد اور تحصیل علوم کے وہ طریقے بھی معلوم ہو گئے ہیں، جو بتدریج پیدا ہوتے گئے ہیں، اب میں غلطی پر ہوں، یا ترقی کی یہ طبعی ترتیب بچوں کی تربیت میں قابل تقلید و اتباع ہے؟

غیر ترقی یافتہ قوموں کے تعلیمی طریقے ہمیشہ جامد، غیر متحرک، اور مستمر ہوتے ہیں، اس لئے وہ متمدن قوموں کے یہاں بچوں کے لئے صرف ایک وقتی ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں، کیوں کہ متمدن قومیں بھی اگرچہ ان قوموں کی طرح جاہل ہوتی ہیں تاہم ان میں اور وحشی قوموں میں یہ فرق ہے کہ ان میں ہمیشہ ایک دائمی تغیر ہوتا رہتا ہے، اس لئے وہ اس بلندی تک نہایت سرعت کے ساتھ پہونچ جاتی ہیں جہاں تک پہونچتے ہوئے غیر قوموں کے پر جلتے ہیں، وہ اس ترقی کے زمانے میں صرف اسی حد تک پہونچکر دم لیتی ہیں، جس کو ان کی استعداد، ہمسایہ قوموں، اور زمانے کے اثر نے ان کے لئے معین کر دیا ہے، اس لحاظ سے تربیت کے ساتھ طریق تعلیم کو وہی نسبت ہے جو قانون کو سوسائٹی کے ساتھ ہے، اس لئے وہ عقلی ضروریات میں صرف وقتی ضرورتوں کو پورا کرسکتے ہیں، اس بنا پر ان سب کو وقتی خیال کرنا چاہئے ایسی حالت میں اگر طالب العلم کو بعض مخصوص تعلیمی طریقوں کا پابند کر دیا جائے، تو یہ ایسا ہی ظلم ہوگا جیسا کہ چھٹی صدی میں قوموں کو قرون وسطیٰ کے قوانین کا پابند

کر کے کیا جاتا تھا۔

تینتیسواں خط

از ڈاکٹر اراسمس بنام ہیلانہ

تربیت خیال

تمہارے بیان کے مطابق میرے خیال میں امیل کو عجیب وغریب خیالی باتوں سے نہایت دلچسپی ہے، اور اس کی یہ دلچسپی جس قدر زیادہ ہوتی جائے گی، اسی قدر میں خوش ہوں گا، میں متشکک، اور متذبذب بچوں کو پسند نہیں کرتا کیوں کہ تشکیک وارتیاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی قوت خیالیہ خشک اور بانجھ ہو گئی ہے، انسان کو اس عالم مادی کے علاوہ اگر کسی دوسری دنیا کی سیر کا شوق ہے، تو مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ اس کے لئے عیب ہے یا ہنر؟ اگر یہ شوق اس کو اس پست دنیا سے اٹھا کر ز روہ کمال تک پہونچا دیتا ہے، اور عالم خیال میں کمالات روحانی کے جو جلوے نمایاں ہوتے ہیں وہ اس کو نظر آنے لگتے ہیں، تو اس عیب یا ہنر کی پروا نہیں کرنی چاہئے، لڑکے قوت خیال ہی کے ذریعہ سے عالم غیب کے میدان طے کرتے ہیں، اس بنا پر مربیان اطفال جس بیدردی کے ساتھ اس قوت کو ضائع کرتے ہیں مجھے بھی تمہاری طرح اس پر رونا آتا ہے۔

خدا کے سخت سے سخت خطرناک عطیے بھی حکمت وبصیرت سے خالی نہیں ہوتے، اس لئے اس نے ہم کو جو خیالی قوت عطا فرمائی ہے، وہ کوئی بے کار چیز نہیں ہے، اس بنا پر ہم کو کسی قوت کو یہ کہکر مردہ نہ کر دینا چاہئے کہ "یہ وہمی چیز ہے" اور اس میں کوئی فائدہ نہیں،، بلکہ ان قوتوں کے ذریعہ سے جو اس کی مخالف ہیں، ان میں توازن

پیدا کرنا چاہیئے، مثلاً ایک زمانہ آئے گا جس میں قوت خیالیہ کا مقابلہ قوت نظریہ، بلکہ تعقل، اور قوت استدلال سے کیا جا سکے گا، اس بنا پر میں مربیان اطفال کو زندگی کی قدر و قیمت کی قسم دلاتا ہوں کہ وہ بچوں کی کسی قوت کو بجبر نہ دبائیں، کیوں کہ انسان کی کوئی قوت اس کی ضروریات سے زائد نہیں ہے۔

ہم کو دنیا کی ہر چیز میں ایک حرکت، ایک بے چینی، ایک کشمکش، اور ایک ترقی و اضافہ نظر آتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ قوائے متضادہ کی ترکیب و امتزاج سے ایک نظام قایم ہوتا ہے، اور موثرات متخالفہ بلکہ باہم متفق و متحد ہو جاتے ہیں، تو اگر ہم اسی اصول مطابق بچوں کی تربیت کریں تو ہمارا کیا حرج ہے؟

پینتیسواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر ارسم

سیر و سیاحت کا اثر قوت حافظہ اور قوت خیال پر

میں بیمار ہو گئی تھی، اس لئے ڈاکٹروں کے مشورے کے بموجب تبدیل آب و ہوا کی ضرورت پیش آئی، لیکن اس کا مقصد صرف اعادہ صحت نہ تھا، بلکہ میں نے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا تھا، کہ مناظر طبعی کے مشاہدہ سے امیل کے صفحۂ دل پر زندہ آثار کے نقش و نگار قایم کروں، مشہور ہے کہ لارڈ بائرن کے دل میں ان ہی مناظر نے شاعرانہ جذبات اور خیالات پیدا کئے تھے، میرے خیال میں اگرچہ امیل لارڈ بائرن نہیں ہو سکتا، تاہم صفحہ کائنات پر جو نادر اشعار لکھے ہوئے ہیں اگر وہ بحیثیت انسان کے ان سے متاثر نہ ہو تو یہ میرے نزدیک ایک افسوس ناک بات ہو گی۔

میں نے اگرچہ امیل کی قوت حاسہ کی بیداری کے متعلق اس سفر میں بہت سی

امیدیں قایم کی تھیں، لیکن میں نہایت ذلّت کے ساتھ اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے نہایت عاجلانہ طور پر ان امیدوں کو قایم کیا تھا، وہ صرف جزئیات کا مطالعہ کرتا تھا، اور کمسنی کی وجہ سے اشیاء کی مجموعی کیفیت کا سمجھنا اس کے لئے نہایت دشوار تھا۔

بچوّں میں قوت فطری کے پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ان سے نظروفکر کی خواہش نہ کی جائے، میں نے امیل کی تربیت میں یہی طریقہ اختیار کیا تھا، صرف ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے اس طریقہ کی مخالفت کی، یعنی میں نے ایک بار ایک ساحل کی جو عجائبات عالم کا مجموعہ تھا، سیر کی، اور ایک موقع پر جہاں سے سمندر اپنی بہترین شکل میں نظر آتا تھا کھڑے ہو کر امیل سے کہا "اس منظر کو بغور دیکھ لو، اور اس کی تمام چیزوں کو یاد کر لو، پھر دوبارہ یہ منظر نہ دیکھو گے"

کیا قوت حافظہ ہمارے احکام کی اطاعت کر سکتی ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے، میرا خود ذاتی تجربہ ہے کہ جب میں امیل کی ہم سن تھی، تو میرے والدین نے ایک سفر کیا اور مجھے بھی ساتھ لیتے گئے، اثناء سیروسیاحت میں ایک دن ہم سب ایک پہاڑ پر چڑھ گئے اور اس وقت میرے باپ نے مجھ سے باآواز بلند کہا کہ اس وقت جو کچھ تم دیکھ رہی ہو تمام عمر نہ بھولنے پائے" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے سامنے، جتنے پہاڑ، جتنے ٹیلے، اور جتنے مرغزار آئے، عمر بھر میرے حافظہ میں محفوظ رہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے امیل کے ساتھ یہی طریقہ اختیار کیا، لیکن اس کے بعد میرے باپ نے ایک اور منظر کے یاد رکھنے کا حکم دیا، لیکن وہ مجھے بالکل یاد نہیں رہا، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ بعض اوقات مربی کو بچے کی قوت حافظہ پر تسلط و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اس اقتدار کو مبالغہ آمیز طریقے پر استعمال نہیں کرنا چاہیے،

امیل جب کسی منظر کو دیکھتا ہے تو خوش ہونے سے زیادہ متحیر ہو جاتا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ایسی صورت میں مناظر عالم کا مشاہدہ کیا جائے تو بعض خیالی مناظر بھی

نمایاں ہو جاتے ہیں، مثلاً بچے کو سمندر کا ایک نہایت چھوٹا سا حصہ نظر آتا ہے، اور بقیہ حصہ اس کی نگاہ سے اوجھل رہتا ہے، لیکن اگر ایک شاعر اس منظر کو دیکھ کر بے خود ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی عقلی قوت سے اس بقیہ حصے کو بھی دیکھ لیتا ہے، کیونکہ جہاں اس کے حواس ظاہری عاجز ہو جاتے ہیں وہاں اس کے عالم خیال میں اس عالم مادی کے حدود وسیع تر ہو جاتے ہیں اس لئے وہ سمندر کے اس چھوٹے سے حصے کے ساتھ ایک عظیم الشان اور غیر محدود چیز کا بھی اضافہ کر لیتا ہے، اور یہ دونوں چیزیں عقلی ہیں، حسی نہیں ہیں، بہر حال وہ سمندر کی عظمت و جلالت کو اپنے ذہنی عالم میں دیکھتا ہے خود اس کی مادی صورت میں نہیں دیکھتا۔

لیکن چونکہ ابھی امیل میں ملکہ تعقل نہیں پیدا ہوا، اس لئے وہ میرے خیال میں مناظر عالم سے بے اعتنائی ظاہر کرتا ہے، امیل میں فطرتاً تقلید اور محاکات کا جو مادہ پایا جاتا ہے، اس کی وجہ سے وہ بعض جزئیات کے ساتھ جن کا مجھے خیال بھی نہیں ہوتا سخت شیفتگی کا اظہار کرتا ہے، مثلاً ہماری سیر گاہ میں ہر چٹان کا ایک مخصوص نام ہے، جو انسان کے خیال کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے، مثلاً رہنما بتاتا ہے کہ یہ ایک ستون کی شکل ہے، یہ شیر کے رہنے کی جگہ ہے، یہ باورچی خانہ ہے، یہ گھوڑے کی تصویر ہے، یہ ڈاکٹر جانسن کا سر ہے، یہ ڈاکٹر سنٹاکس کا چہرہ ہے، یہ چیزیں اگرچہ کم و بیش خرافات قدیمہ کی حیثیت رکھتی ہیں، تاہم ان میں اور ان چٹانوں میں جو ان ناموں کے ساتھ موسوم کی گئی ہیں بعض کھلی ہوئی مشابہتیں موجود ہیں، میرے خیال میں قدرت کے یہی تماشے، یہی اتفاقی تصویریں اور انسانوں کی شکل کے یہی پتھر ہیں، جنھوں نے قدماء کے دل میں تصویر کشی کا میلان پیدا کیا ہے، بہر حال ان عجیب و غریب غیر معمولی چیزوں نے امیل کے دل میں ذوق علم پیدا کیا اور اس نے ان چٹانوں کے ٹکڑوں، اور دوسری چیزوں میں جو اس کو معلوم ہوتیں وجہ شبہ پیدا کرنی چاہی۔

اس اطراف میں چند عمودی پتھر پائے جاتے ہیں جن کی ترتیب و تنظیم سے بہت سی متناسبت الاجزا دائرے بن گئے ہیں، لیکن امیل ان آثار قدیمہ کی طرف جو ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا ہیں کیوں کر متوجہ ہو سکتا ہے؟ اور کیونکر ان کو اہم چیز سمجھ سکتا ہے؟ بایں ہمہ اس کا دل ان کے دیکھنے سے متاثر ہوا اور یہ اثر ایک خاص صورت میں ظاہر ہوا۔

گیارہ جولائی کو اس کی سالگرہ کا دن تھا، اس لئے اس نے اس شہر کے دستور کے مطابق ایک چھوٹی سی دعوت کا سامان کیا اور نہ صرف دعوت کا سامان کیا بلکہ اس میں ایک جدید چیز کا اضافہ کیا، جو مجھے حیرت انگیز طریقے پر اس طرح نظر آئی کہ اس نے میرا دامن پکڑا اور مجھے باغ میں لے گیا، میں باغ میں گئی تو مجھے متوسط ضخامت کے پتھروں کا ایک ڈھیر نظر آیا، جو نہایت ہوشیاری کے ساتھ باہم چنے گئے تھے، میں نے ان کو دیکھکر یہ خیال کیا کہ اس نے یہ ہنر آثار قدیمہ کے مدرسہ میں سیکھا ہے کیوں کہ جو آثار ہم نے ساحل پر دیکھے تھے، ان کو دیکھکر امیل نے یہ رائے قایم کی کہ یہ کسی واقعہ کی یادگار میں قایم کئے گئے ہیں، اور اس طرح اس نے اس خیال کو خود اپنے اوپر منطبق کیا۔

لیکن میں پوچھتی ہوں کہ امیل کے سن کو کیوں سن تمیز کہا جاتا ہے؟ ایک بچہ سات برس کی عمر میں کس چیز کا تعقل کر سکتا ہے؟ میرے خیال میں وہ جزئیات کا تصور نہیں کر سکتا، کیونکہ اس نے اتنا زمانہ نہیں پایا جو اس کے لئے کافی ہوتا، وہ کلیات کو بھی نہیں جان سکتا، کیوں کہ اس کے لئے پختگیٔ عقل کی ضرورت ہے، میرا اصلی تجربہ تو یہ ہے کہ امیل کسی چیز پر کوئی حکم لگانے سے اس کے جاننے کا زیادہ شوق رکھتا ہے، اور موجودات خارجیہ کی ظاہری کیفیات کو زیادہ اہم سمجھتا ہے، اور میں آیندہ خط میں ایک مثال کی صورت میں اپنے مطلب کی تشریح کردوں گی۔

چھتیسواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر اڈاہم

میجک لینٹرن کے ذریعہ سے تاریخ طبعی کی تعلیم

میں نے ایک چھوٹا سا تھیٹر قایم کرلیا ہے، اور میں بطور واقعہ کے یہ کہتی ہوں کہ اس سے اصل مقصد نہایت کامیابی کے ساتھ حاصل ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر وارنگٹن میرے لئے لندن سے ایک میجک لینٹرن لائے، جو اس لئے بنائی گئی ہے کہ اس میں رنگ وروشنی کے ذریعہ سے مناظر مختلفہ نمایاں کئے جائیں، جو چیزیں اس کے ذریعہ سے نمایاں کی جاتی ہیں، ان کو وہ نہایت مناسب طور پر بڑا کرکے دکھاتی ہے، اور اس کے پردے پر تصویریں اس وضاحت کے ساتھ نظر آتی ہیں کہ دوسرے طریقہ سے ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ میں نے اکثر چیزوں کی تصویروں کو اس کے شیشے پر نمایاں کیا، تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ ان کے دیکھنے میں نفس پر وہم کا کیا اثر پڑتا ہے، مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس میں جو مناظر نظر آتے ہیں، اگر ان میں ترتیب ونظام پیدا کیا جائے تو ایک دل کش نظر فریب تھیٹر قایم ہوسکتا ہے، میں جب ان تمام باتوں سے فارغ ہوچکی تو اس تھیٹر میں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو بلایا، کونٹس ڈیکارنانیاس، جب اپنے گھر میں واقعیہ قصوں کا ایکٹ کرتی تھی تو کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، لیکن میں نے اس کے خلاف یہ اجتماع اس لئے کیا کہ جب تک بہت سے لوگ موجود نہ ہوں انسان اس قسم کے تفریحی شغلوں سے لطف نہیں اٹھا سکتا، بالخصوص جب بچے تماشائی ہوں تو اور بھی زیادہ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

میں نے ابتداءً نہایت سادہ سادہ چیزوں، مثلاً کھیت کا اندرونی حصہ، پن چکی،

کشتی کی زندگی، کو نمایاں کیا، اس کے بعد دوسرے دن اس کشتی کو اس صورت میں دکھلایا کہ وہ ہم کو ایک دور دراز ملک میں لے جارہی ہے، جہاں کے اخلاق و عادات ہم سے بالکل مختلف ہیں، اس نے چھوٹے چھوٹے بچّوں کے دل میں نہایت تعجب اور شوق پیدا کیا وہ ان مکانات کو نہایت دلچسپی سے دیکھتے تھے، جو ہمارے طریقہ تعمیر سے بالکل مختلف طرز پر بنائے گئے تھے، اور ان کو وہ سڑکیں، اور وہ فضائیں نہایت عجیب معلوم ہوتی تھیں جن میں مرد اور عورت عجیب و غریب لباسوں میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے، میں نے بڑے بڑے وحشی جانوروں، مثلاً، ہاتھی، دریائی گھوڑے، گینڈے، شیر اور چیتے وغیرہ کے شکار کے منظر کو نمایاں کیا تھا، لیکن ان بچّوں نے نہایت دلیرانہ محویت کے ساتھ اس کو دیکھا، پھر اس کے بعد میں نے ایک قافلہ کو دکھایا جو صحرا میں جارہا تھا، لیکن یہ منظر ان پر نہایت گراں گذرا، ان تجربات سے مجھے معلوم ہوا کہ میجک لینٹرن میں الف لیلہ کے اس ساحرانہ فقرے کا اثر ہے کہ "اے سمسم کھل جا" اس لئے اگر میں اس کے ذریعہ سے اپنے صغیر السن دوستوں کے سامنے نامعلوم چیزوں کا دروازہ نہ کھولدوں، تو یہ میری قابل ملامت غلطی ہوگی لڑکوں کو یہ معلوم کرنے کا نہایت شوق ہوتا ہے کہ حیوانات اور نباتات کیونکر پیدا ہوئے اور تمام چیزیں کیونکر نشو و نما حاصل کرتی ہیں اس لئے تماشائیوں نے نہایت بلند آواز کے ساتھ اعلان کیا کہ ہمیشہ ایسے دلچسپ اور پر عظمت قصوں کا تماشا دکھایا جائے، جو تاریخ ارض کی متعدد فصول سے مرکب ہوں"

میں نے اس تماشے میں میجک لینٹرن کی پوری قوت سے کام لیا، اور وہ تصویریں دکھائیں، جو علمائے طبقات الارض کی رائے کے مطابق تھیں، اثناء تماشے میں میری رائے یہ قرار پائی کہ موثرات عالم اور قوائے طبیعہ کو تماشے میں زبان سے بھی کام لینا چاہیئے، لیکن اس سے شعر خوانی مقصود نہ تھی، بلکہ مقصد یہ تھا کہ پردے کے

اوپر جو باتیں روشنی اور رنگ کے ذریعہ سے وضاحت کے ساتھ نظر نہیں آتیں، ان کو آسان الفاظ میں واضح کیا جائے، مثلاً میں نے تماشائیوں ان الفاظ میں خطاب کیا "کیا تم کو معلوم ہے کہ جب سمندر نے سطح عالم کا احاطہ کرلیا اور اس کے پانی ذی اس کی رُوح نکال لی تو سمندر نے کیا کہا؟ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی اس کا علم نہیں، لیکن خیال کرتی ہوں کہ وہ پیمبروں کی طرح زندگی کی دعا کرتا تھا، اور خدا سے اپنی اندھیری گہرائی، اور بے پناہ طغیانی کی وحشت کے دور کرنے کا خواستگار تھا اس تشریح کی ضرورت کوئی قابل تعجب چیز نہیں ہی، اس ساحرانہ روشنی میں نہایت قدیم جانوروں یعنی اوواہیا، ہنجولا، اور توسیرانیت، اور تریبولیت[۱] وغیرہ کو دکھایا گیا تھا جن کے اب آثار ہی آثار باقی رہ گئے ہیں اس کے بعد پانی خشک ہوا تو زمین کے پہلے طبقے کا ظہور ہوا جس میں بہت سے جزیرے ایسے تھے کہ جن میں فریب نظر کی بنا پر بچوں کو بہت سی قدیم گھاسیں مثلاً ہیجیلاریا، اور استیجماریا[۲] وغیرہ اُگتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں یہ تمام مناظر اگرچہ نہایت مسخر انگیز اور گویا بچوں کا کھیل معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ تماشا صرف لڑکوں کے لئے کیا جاتا ہے، اور اس کا مقصد ان کو تعلیم دینا ہی، اس لئے اگر اس مقصد اعلیٰ کے لئے مبتذل قسم کے وسائل اختیار کئے جائیں تو ان سے چشم پوشی کرنا چاہیئے۔

قصہ کی دوسری فصل میں مختلف مناظر کا ایک سلسلہ قایم ہوا جس نے سطح ارض پر بڑے بڑے حوادث کے پیدا ہونے کی اطلاع دی، مثلاً بہت سے جزیرے نمایاں ہوکر باہم مل گئے، اور اس طرح برّاعظموں کے پیدایش کی ابتدا ہوئی، بہت سی جدید نباتات وحیوانات پیدا ہوئے جن کا اب تک وجود نہ تھا، لیکن اس سلسلہ میں

---

[۱] نہایت ابتدائی زمانے کے جانور جواب معدوم ہیں [۲] نہایت قدیم گھاس جو اب معدوم ہی

تماشائیوں کو سب سے زیادہ حیرت زمین پر جانوروں کی پیدائش سے ہوئی، چنانچہ لڑکوں نے اس عالم حیوانی کو دیکھ کر جس مسرت و ابتہاج کا اظہار کیا اس سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دنیا کے بچپن اور خیال کے عہد طفولیت میں خاص قسم کی مناسبت پائی جاتی ہے، کیونکہ جب میں نے ان کو ایک مینڈک دکھایا جو بیل سے بھی بڑا تھا، ایک گوئے دکھائی جس کی آنکھیں نہایت مہیب تھیں، ایک اور گوئے کو نمایاں کیا جس کی گردن سانپ کی سی تھی، اور مختلف قسم کے اڑنے والے سانپ دکھائے، تو لڑکے ان کی ضخامت و جسامت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

قصے کی تیسری فصل میں وہ مناظر نمایاں کئے گئے، جن کے ذریعہ سے میں نے اس دور کے بعض آثار دکھائے، جن کو علمائے طبقات الارض زمین کی زندگی کی صبح سے تعبیر کرتے ہیں۔

زمین پر چلنے والے جانوروں کے بعد دودھ دینے والے جانور پیدا ہوئے جن کو میجک لینٹرن نے تھوڑی دیر تک لڑکوں کے سامنے نمایاں کیا۔

لیکن نباتات و حیوانات میں جو استحالات و انقلابات رونما ہوتے رہے ان سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ زمین چند دنوں میں اپنی موجودہ شکل اختیار کرنے والی ہے۔

اس سے لڑکوں کو یہ احساس ہوتا تھا کہ موجودہ اور گزشتہ زمین میں زمین اور آسمان کا جو فرق ہے، وہ اس سے واقف ہیں، ان کو نظر آتا تھا کہ ان کے سامنے وہ جھاڑیاں ہیں جن کے درخت ہمارے زمانے کی جھاڑیوں سے مشابہ ہیں، اور جن میں بڑے بڑے بارہ سنگھے دوڑتے ہیں، جن کے پیچھے پیچھے درندہ جانور لگے ہوئے ہیں۔

اب تک ان مناظر کے رگ و پے میں آفتاب کی روشنی اپنی حرارت کے ساتھ مل کر دوڑ رہی تھی اور سردی نے ان کی لطافت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا، لیکن دوسرے دن شام کو برف باری کے آثار نمودار ہوئے، اس لئے میں نے ان کو دکھانے میں

لینٹرن کی پوری طاقت سے کام لیا جس سے بچوں نے یہ سمجھ لیا کہ عہد قدیم کی جانوروں کو اسی قسم کی مہلک چیزوں نے بالکل فنا کر دیا، اور وہ زیادہ گرم ملکوں میں پناہ گزین ہوئے۔

ان کے سامنے ایک چٹان پر ایک قدرتی غار نمودار ہوا جس میں وحشی جانور مثلاً ریچھ وغیرہ رہتے تھے، اس کے بعد ایک عجیب و غریب مخلوق نمودار ہوئی جس کو انسان کہتے ہیں، وہ زمین کے ایک کونے میں اپنے گھر میں آگ سے تاپ رہا تھا آخر یہ کون سی مخلوق ہے؟ اور کہاں سے آئی ہے؟ یہ دو سوال ہیں، جن کے جواب سے انسان عاجز ہے، اور لڑکے اس بحث کو نہیں سمجھ سکتے، اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ لینٹرن کو بجھا دوں اور اس بحث میں نہ پڑوں۔

تماشائیوں کی خواہش کے بموجب ہمارے تھیٹر نے بہت سے دوسرے مناظر کے دکھانے کا بھی وعدہ کیا، جو قصوں کے ضمن میں دکھائے جائیں گے۔

میں نے تھیٹر کے اس درس کو قایم رکھنے کا عزم کر لیا ہے، اور اس طرح اپنے کم سن دوستوں کو میجک لینٹرن کے ذریعہ سے انسانی تاریخ، موثرات عالم پر اس کے تسلط، اس کے شکار کے آلات، اور دستکاری کے نمونے دکھا سکوں گی، اس کے بعد اسی طریقے سے قومی سوسائٹیوں، قدیم عادتوں، اور قدیم صناعیوں کو بھی نمایاں کروں گی، لیکن بایں ہمہ میرا یہ دعوے نہیں ہے کہ اگر میں نے زمانہ قدیم کے انسانوں کی چند صورتیں امیں کو دکھا دیں تو میں نے اس کو علم طبقات الارض یا علم تاریخ کی تعلیم دے دی، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح میجک لینٹرن کی پردے سے یہ صورتیں محو ہو جاتی ہیں، اسی طرح لڑکوں کے ذہن سے بھی ان کا نقش مٹ جاتا ہے، تاہم، اگر اُن کے ذہن میں دو ایک چیزوں کے نقش بھی مرتکز ہو جائیں، تو مجھے مستقبل کی نسبت یہ امید ہو جائے گی، کہ وہ مدرسہ

موجودات، یا مدرسہ کتاب میں خود بخود تحصیل علم کے لئے کوشش کریں گے بہر حال بچپن میں ان کی تعلیم کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ علم سیکھیں، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ ان میں علم کا شوق اور میلان پیدا ہو۔

اڑتیسواں خط

ازہیلانہ بنام ڈاکٹر اراسم

تیراکی کی تعلیم، اور تربیت عضلات

اگرچہ میں امیل کی عقلی تربیت میں مصروف ہوں، تاہم میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس سن میں اس کو ایسے مشغل میں مصروف رکھنا چاہئے، جو اس کے اعضاء کو صحیح اور قوی بنا سکیں، یہی وجہ ہے کہ میں اس کو ورزش جسمانی پر آمادہ کرتی رہتی ہوں، اگرچہ اس کو پہلوان بنانا نہیں چاہتی، تاہم میرے نزدیک انسان کا ہر عقلی یا جسمانی ضعف اس کی غلامی کا ایک سبب ہے۔

چونکہ امیل تیرنا نہیں جانتا اس لئے چند روز سے کابیڈن ملول خاطر رہتا ہے، اور اس پر اظہار افسوس کرتا ہے، لیکن میں یہ کہتی ہوں کہ اس کم سنی میں وہ پانی کے اوپر ٹھہر نہیں سکتا، لیکن میرا یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، انسان کو کسی نامعلوم مقام میں جب خوف لاحق ہو جاتا ہے، تو وہ اس جگہ بالکل آپاہج اور بے دست و پا بن جاتا ہے، اس لئے جوں جوں اس کا سن ترقی کرے گا یہ خوف بڑھتا جائے گا، کابیڈن کی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی تیرنے لگا تھا، جس طرح اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس نے کب زمین پر چلنا سیکھا اسی طرح اس کو یہ بھی یاد نہیں کہ کب اس نے تیرنا شروع کیا، اس کے نزدیک تو یہ دونوں چیزیں فطری ہیں، بہر حال اس

نے میرے تمام شکوک اور خطرات کو دور کر دیا اور مجھے نظر آیا کہ تیراکی کی تعلیم عضلات کو نشوونما اور ان کو قوت دیتی ہے، اور انسان کے آزادانہ حرکت و نشاط کا میدان وسیع کرتی ہے، اس کے ساتھ وہ بعض اوقات انسان کو خطرات سے بھی نجات دلاتی ہے، اس لئے میں نے اس کی تعلیم کو فرض قرار دیا ہمارے قریب ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس میں کابیڈن نے امیل کو تیرنے کی تعلیم دینا شروع کی، اور اس میں کسی مصنوعی آلے سے جو بچوں کے تیرنے میں استعمال کرائے جاتے ہیں کام نہیں لیا، اور میری نزدیک تعلیم کا یہ طریقہ نہایت آسان اور پسندیدہ ہے، اور اس سے طالب العلم میں اعتماد علی النفس کی رُوح پیدا ہوتی ہے، جن لوگوں نے کابیڈن کو تعلیم دیتے وقت دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ پانی کے اوپر چت لیٹ جاتا ہے، اس کی آنکھیں آسمان سے لگی ہوتی ہیں، منہ کو بند کر لیتا ہے، صرف ناک سے سانس لیتا ہے، اور اس کے بدن کا بہت کم حصہ پانی سے باہر نظر آتا ہے، اور اس سے اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے شاگرد کے لئے ایک عمدہ عملی مثال بن جائے۔

کابیڈن اپنے شاگرد کی ترقی پر بہت فخر کرتا تھا، اور اس کو اور بھی آگے بڑھانا چاہتا تھا، وہ طنزاً کہتا تھا کہ تالاب میں تیرنے سے بہتر غسل خانہ میں تیرنا ہے، اس لئے وہ سمندر کا رُخ کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس کو روکتی تھی اور امیل کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دیتی تھی، میرے اس مبالغہ آمیز خوف میں امیل بھی شریک تھا، اور ایک مدت تک سمندر کے نام سے کانپتا رہتا تھا، لیکن بعض اسباب ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے اس کے دل سے اس خوف کو بالکل دور کر دیا، اس کو نہایت ابہام اور اجمال کے ساتھ آپ کی اسیری کی حقیقت معلوم ہے، اور بعض وجوہ کی بنا پر میں نے خود اس دردانگیز داستان کی حقیقت کو اس کی سامنے زیادہ واضح کرنا مناسب نہیں سمجھا، اولاً تو وہ میرا مطلب نہیں سمجھ سکتا، اگر میں اس

سے کہوں کہ تمہارا باپ ایک سیاسی جرم میں قید ہوا ہے تو وہ اس کو کیا سمجھ سکے گا، دوسرے اگر اس نے ان واقعات کو برے طور پر سمجھا تو اس کے دل میں فرانس کی عداوت پیدا ہو جائیگی، یہی وجہ ہے کہ اس نے ایک فرضی قصہ بنا لیا ہے اور اس سے اپنا دل بہلاتا ہے، اس کا خیال ہے کہ تم کو کسی چڑیل، یا شیطان یا اژدھے نے گرفتار کر لیا ہے، اور تم ایک ایسے قلعہ میں مقید ہو جو سمندر سے گھرا ہوا ہے، یہ خیال اس کے دل میں اس طرح پیدا ہوا کہ وہ ایک دن ایک چٹان پر کھڑا ہوا تھا کہ دفعتاً جوار بھاٹا آیا سمندر کی موجوں نے اس کو گھیر لیا، اس خیال کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس نے یہ عزم کر لیا کہ وہ آپ کی رہائی کے لئے ایک دلیرانہ حملہ کر کے ان بھوتوں کو مغلوب کر لے گا، کابیڈن نے بھی اس کے خیال کی تائید کی اس لئے یہ وہم اور بھی راسخ ہو گیا، چنانچہ دونوں کے دونوں میرے پاس آئے، لیکن دونوں کی حالت مختلف تھی، کابیڈن کا چہرہ خوف اور رنگ سے سیاہ تھا، لیکن امیل کے چہرے پر فاتحانہ خوشی کی جھلک نظر آتی تھی، میں اس مقصد کو سمجھ گئی اور غصے کے مارے میرا چہرہ آگ کے شعلے کی طرح سرخ ہو گیا، اور میں نے دونوں کو سرزنش کی، لیکن امیل کے دل میں اس غیظ و غضب سے مطلق جنبش نہیں پیدا ہوئی، اور اس نے بہادرانہ انداز سے غیر معمولی ضد و اصرار کے لہجہ میں کہا، "میں تیراکی سیکھنا چاہتا ہوں، تاکہ اپنے باپ کو چھڑا کر تمہارے پاس لاؤں"، میں نے اس کی حریت ضمیر، خلوص نیت، اور اعتماد علی النفس کو دیکھا تو میرا غصہ فرو ہو گیا اور میں نے مسکرا کر اس کو چھاتی سے لگا لیا، اس کی پیشانی چوم لی۔

اُنتالیسواں خط

از ہیلانہ بنام ڈاکٹر ارسم

معافی

انگریزی اخباروں میں جو خبر شائع ہوئی ہے، اگر وہ صحیح ہے تو نہ ہمیں کو اس دلیرانہ حملے کی ضرورت ہوگی، نہ اژدھے کی قید سے آپ کے چھڑانے کے لئے سمندروں کو طے کرنا ہوگا، یہاں لوگ بیان کرتے ہیں کہ آپ کو پولٹیکل معافی دی گئی ہے، میری خواہش تو یہ ہے کہ اس معافی کے علاوہ حکومت کو آپ کے نقصانات کی تلافی بھی کرنی چاہئے، بایں ہمہ میں یہ کچھ نہیں چاہتی، میرا دل صرف آپ کے شوق ملاقات سے وجد کرتا ہے۔

چالیسواں خط

از ڈاکٹر وارنگٹن بنام ہیلانہ

میڈم، میں نے رات لندن میں ایک خبر سُنی ہے، جس کو تمہارے پاس پہونچانا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ آپ کے شوہر آزاد کر دئے گئے ہیں[1]۔

[1] اب رہائی کے بعد ارسم اور ہیلانہ کی خط وکتابت کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، اور ڈاکٹر ارسم نے جو مختلف نوٹ یعنی شذرات لکھی ہیں، ان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

تیسری کتاب

قریب البلوغ لڑکے کے متعلق

شذرات

ماخوذ از یادداشت ڈاکٹر اراسم

شذرۂ دوم

اسما سے پہلے مسمیات کی تعلیم

اگرچہ ہیلانہ نے جس طریقے پر امیل کی تربیت کی ہے، اُس نے میری کسی اُمید کو ناکامیاب نہیں کیا، اس لئے اس کو بدستور اُس کی تہذیب و اصلاح میں مشغول رہنا چاہیئے تاہم بہتر یہ ہے کہ ہم باہم اپنے اپنے کام تقسیم کرلیں، کیونکہ اکثر تعلیم باپ کے فرائض میں داخل ہے، اور تربیت کا ماں کے ساتھ تعلق ہے۔

اب میں ان اعمال کے انجام دینے کا طریقہ بتاتا ہوں۔

امیل نے اب تک باضابطہ طور پر کوئی سبق نہیں پڑھا، اُس نے سمندر کے کنارے جو گھونگھے اور سیپ وغیرہ دیکھے ہیں اُن سے اتفاقی طور پر تاریخ طبعی کے متفرق سبق حاصل کئے ہیں، میں کبھی کبھی اُسے میکرسکوپ کے ذریعہ سے بعض نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دکھاؤں گا جو اُس کو بڑی نظر آئیں گی، میں تلسکوپ کے ذریعہ سے بھی اُس کو نہایت عظیم الشان

ہستیوں کا مشاہدہ کراؤں گا، ہم نے شیشے کے ایک برتن میں آبِ شور بھر دیا اور اُس میں بہت سے حیواناتِ ہلامیہ، حیواناتِ قشریہ، اور مچھلیاں چھوڑ دیں، اور ہر آٹھویں دن اُس کا پانی بدلتے رہے، اس سے امیل کو دریائی جانوروں کی زندگی کا طریقہ معلوم ہو گیا، کبھی کبھی میں اُس کو علم کیمیا اور علم طبعی کے بعض آسان تجربے بھی دکھاتا ہوں، اور وہ اگرچہ ان دونوں علوم کے نام سے ناواقف ہے، تاہم ایک جسم کا دوسرے جسم پر جو فطری اثر پڑتا ہے اُس کو کم و بیش محسوس کر لیتا ہے۔

بہرحال یہ تمام چیزیں اب تک ہماری درسی کتاب ہیں۔

ہمارا درس اکثر سیر و تفریح کے وقت شروع ہوتا ہے، اس لئے ہم اور امیل ارسطو کے طریقۂ تعلیم کے مقلد ہیں، میں امیل کے سامنے حوادثات عالم کی کوئی شرح و تفسیر نہیں کرتا، بلکہ خود ان حوادث کو اُس کی تنبہ و شعور کا ذریعہ بناتا ہوں البتہ جب وہ سوالات کرتا ہے، اور واضح شرح کا خواستگار ہوتا ہے، تو مجھے ان کے چہرے سے پردہ اُٹھانا پڑتا ہی، جو لوگ بچوں کو تعلیم دیتے ہیں، اُن میں بہت سے لوگ تفسیر و تشریح میں مبالغہ آمیز وضاحت سے کام لیتے ہیں، گویا وہ لوگ اس طرح اپنے تبحر علمی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں، لیکن میں امیل کو تعلیم نہیں دیتا، بلکہ اُس کے ساتھ تعلیم حاصل کرتا ہوں، اس بنا پر بجائے اس کے کہ میں اُس کو طریقۂ نظر و فکر بتاؤں، خود اُس کے طریقۂ نظر و فکر کے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں، یہی وجہ ہے کہ وہ جس چیز کو جاننا نہیں چاہتا، میں بھی اُس کو بھلا دیتا ہوں اگرچہ اس طریقۂ تعلیم سے طالب العلم کی نگاہ میں اُستاد کی کوئی عزت نہیں قائم ہوتی، اور اس میں نہایت بے نفسی اور ایثار سے کام لینا پڑتا ہے، لیکن سردست جو طریقۂ تعلیم جاری ہے، اُس سے لڑکوں کے دل پر علوم و فنون کا رنگ اُتنا ہی چڑھتا ہے، جتنا ریگ پر خطوط نمایاں ہو سکتے ہیں۔

بچوں میں بحث و نظر کا جو ملکہ ہوتا ہے وہ اور ملکات کی طرح مشق و تمرین سے نشو و نما حاصل کرتا ہے، انسان کے دل میں علم کا شوق پیدا کرایا جاتا ہے، خود اُس کے ساتھ پیدا نہیں

ہوتا، اس لئے نظر و فکر کا ذوق خود نظر و فکر ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، یہ سچ ہے کہ امیل جس چیز کو پہلی نظر میں نہ دیکھ سکے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس کو دکھائیں، تاہم اس حالت میں بھی شوق کا فطری اظہار اُسی کی طرف سے ہونا چاہیئے۔

لڑکے فطرۃً سوالات بہت کرتے ہیں، اس کے سوال سے پہلے جواب دینا، یا اُن کے سوال سے زیادہ جواب دینا، اُن کی اس فطری قابلیت کو صدمہ پہنچاتا ہے، کیونکہ اس سے وہ اکثر خاموش رہتے ہیں، تاکہ سبق کی طوالت اور زحمت سے بچ جائیں۔

شذرۂ دوم

لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت و تعلیم ایک ساتھ

مجھ کو اور ہیلانہ کو "لولا" سے جو غیر معمولی محبت ہے، میں اُس کے انجام سے بہت ڈرتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ اُس کے اعزہ و اقربا کہیں اُس کو واپس بلالیں، بہرحال نتیجہ جو کچھ بھی ہو، لیکن ایک بات کا اظہار جس کا تعلق علم ترکیب انسانی اور علم منافع الاعضاء سے ہے ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ لڑکی اول اول جب ہمارے گھر میں آئی ہے تو ہر قسم کے عیوب کا مجموعہ تھی، سست تھی، کاہل تھی، اور اپنی سُدھ بُدھ بالکل نہیں رکھتی تھی، اور اگر صاف صاف کہنا ضروری ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ نہایت گندی اور میلی کچیلی تھی، اس بے پروائی کے ساتھ اُس کا ناقابل برداشت ناز و غرور ہیلانہ کے لئے موجب ملال تھا، ہیلانہ نے اُس کے غرور و خود بینی کے کم کرنے کے لئے اگرچہ متعدد ذرائع اختیار کئے، نصیحتیں کیں، ڈانٹ ڈپٹ کی، اور خفیف سی سزا بھی دی، لیکن یہ تمام چیزیں بے اثر رہیں اور چونکہ سخت تند مزاج تھی اور بات بات پر مشتعل ہو جاتی تھی، اس لئے پڑھنے کا مطلق شوق ظاہر نہیں کرتی تھی، ہیلانہ نے ہزار

کوششیں کیں، لیکن سب ناکامیاب رہیں، البتہ ایک امیل تھا جو اس معاملہ میں کامیاب ہوا، یعنی لولا چونکہ امیل کو محبوب رکھتی تھی، اور امیل اُس کی جو تذلیل و تحقیر کرتا تھا اُس کی مدافعت کرنا چاہتی تھی، اس لیئے ہمارے وعظ و پند سے زیادہ اُس کا اثر اُس پر پڑتا تھا۔

یہ پہلا اقتدار تھا جو امیل کو اُس کے دل پر حاصل ہوا اور اس سن میں یہ کوئی خطرناک چیز نہیں ہے، بہر حال اس وقت سے فخر و غرور اور تھوڑے سے علمی تفوق نے امیل کے دل میں رقیبانہ جذبات پیدا کئے اور لولا نے غیرت و خودداری کی بنا پر اس علمی تفوق میں اُس کا مقابلہ کرنا چاہا، اس لئے دونوں میں باہم رقیبانہ کشمکش شروع ہو گئی، جس کا نتیجہ اُمید ہے کہ دونوں کے حق میں بہتر ہوگا، کیونکہ امیل جب اپنے آپ کو لولا سے زیادہ مقدم خیال کرے گا تو وہ بھی اس میدان میں اُس سے آگے نکلنے کی کوشش کرے گی۔

اخلاقی حیثیت سے بھی یہ اجتماع مفید ہوگا، کیونکہ تمام لڑکے اپنے عام اور مشترک عیوب سے واقف ہوتے ہیں اور نہایت بے دردی کے ساتھ اُن کی پردہ دری کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ امیل لولا کی بہت کم عزت کرتا ہے، اور وہ بھی انتقام لینے سے نہیں چوکتی، لیکن با ایں ہمہ اس نوک جھوک میں اُن کے دوستانہ تعلقات کو کوئی صدمہ نہیں پہونچتا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بھائی اور بہن کی اجتماعی زندگی میں بھی یہ تمام خوبیاں موجود ہیں، اس لئے دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ تعلیم دینے کی کیا ضرورت ہے، لیکن میرے نزدیک ان دونوں صورتوں میں کافی تشابہ و اتحاد موجود نہیں، اس لئے دونوں کے نتائج بھی متحد نہیں ہو سکتے۔

میں نے گزشتہ ایام میں گونگوں اور بہروں کے ایک مدرسہ کا معائنہ کیا جس کے زنانہ و مردانہ دو مختلف درجے تھے، لیکن چند ہی روز کے تجربہ نے اس تقسیم کی مضرت ظاہر کر دی، کیونکہ جو لڑکیاں اپنے درجہ کی پابند تھیں وہ لڑکوں سے سال دو سال پیچھے معلوم ہوتی تھیں، اور جو لڑکے بھی کچھ ایسے زیادہ ہوشیار اور ترقی یافتہ نہیں معلوم ہوتے تھے، اس لئے بانیان مدرسہ نے دونوں کو ایک کمرے میں جمع کر دیا، اور اس کا نتیجہ اس قدر عمدہ ہوا کہ چند ہی دنوں

کے بعد ایک فریق کا انحطاط و تنزل بالکل زائل ہو گیا اور دوسرے فریق نے غیر معمولی ترقی کر لی اس کی وجہ یہ ہے کہ عجب و غرور مرد اور عورت دونوں کا ایک فطری خاصہ ہے اور مرد ہمیشہ عورتوں کی آنکھ میں مؤقر اور ممتاز رہنا چاہتا ہے، فریقین کے ان جذبات نے اُن کی علمی حالت کو ترقی یافتہ بنا دیا، پھر جو نتیجہ گونگوں اور بہروں کے اجتماع کا ہوا، وہ بولنے والے لڑکوں اور بولنے والی لڑکیوں کی باہمی علمی معاشرت کا کیوں نہیں ہو سکتا؟

اس پر صرف یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر مرد اور عورت دونوں کی تربیت ایک ساتھ کی جائے، تو اُن کے اخلاق پر اس کا نہایت مضر اثر پڑے گا، لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ ان کو سونے کے کمرے میں بھی ایک ساتھ رکھا جائے، اس لئے اگر اشتراک تعلیم کے ساتھ مدرسہ کے کمرے، اُن کے صحن، اور اُن کی ورزشیں الگ الگ کر دی جائیں تو ان اخلاقی خطرات کی بہت کچھ روک تھام ہو جائے گی، لیکن ان معترضین کے خلاف مجھے تو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے، کیونکہ انتہا درجہ کی ریاکارانہ حفاظت اور انتہا درجے کی منافقانہ احتیاط ہمیشہ انسان کو حیلہ جوئی پر آمادہ کرتی ہے، اور اس قسم کے پاکیزہ معاملات میں بہت زیادہ اجتناب و احتراز سے نوخیز لڑکوں کے دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے، اور اُن کا مخفی شوق علانیہ ظاہر ہونے لگتا ہے، اس بنا پر بہتر یہی ہے کہ ان مادی رکاوٹوں کو دور کر کے ان کے عوض حدود اللہ کی چار دیواری قائم کر دی جائے جو ایک فطری چیز ہے۔

لیکن اس تفصیل سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ مرد اور عورت کی تربیت بالکل یکساں اور ہموار طریقے پر ہونی چاہئے اور جو طریقہ ایک کے لئے مفید ہے وہی دوسرے کے لئے بھی موزوں ہے، کیونکہ مرد اور عورت کے قوائے طبعی، اور اُن کے فرائض اور اُن کی پیدائش کی غرضیں بالکل مختلف ہیں اس لئے ہر ایک کی تعلیم و تربیت کا طریقہ بھی مختلف ہے، لیکن باایں ہمہ مرد اور عورت دونوں بعض علوم کا مساویانہ مذاق رکھتے ہیں، اس بنا پر ہم کو یہ غور کرنا چاہئے کہ ہم عورتوں کی لطافت طبع اور مردوں کی قوت قلب کو باہم کیونکر مرتبط و متحد کر سکتے ہیں،

اس طرح دونوں فریق کی زندگی پر لطف ہوسکتی ہے، لیکن اگر نوع انسانی کے نصف حصّہ کی تعلیم و تربیت بالکل علٰحدہ کی جائے، تو اس سے اُن کے اجتماعی تعلقات بالکل منقطع ہو جائیں گے۔

شذرۂ چہارم

ضرب الامثال کے ذریعہ سے تعلیم

کبھی کبھی لڑکوں کو دورانِ گفتگو میں اگر بعض حقائق و معارف بطور تمثیل کے سمجھا دئے جائیں تو یہ ایک نہایت مستحسن طریقہ قرار پاسکتا ہے۔

چند روز ہوئے کہ مجھ سے "امیل" نے دریافت کیا کہ انسانوں میں محتاج لوگ کیوں پائے جاتے ہیں؟ اسی طرح لولا یہ جاننا چاہتی تھی کہ اُن میں دولت مند لوگ کیوں ہیں؟

اس سوال کا جو جواب زبان زد خاص و عام ہے وہ یہ ہے کہ مشیت ایزدی یہی ہے، لیکن میں اس کی توجیہ و تعلیل نہیں کرسکتا تھا، کیونکہ اس سے بچوں کے ذہن میں خدا کے عدل و انصاف کا کوئی بہتر تخیل نہیں قائم ہوسکتا، میں اس موقع پر پولیٹیکل اکانومی کے دقیق اور مشکل ترین مسائل کو بھی نہیں چھیڑنا چاہتا تھا، اس لئے میں نے اس سوال کا بہترین تشفی بخش جواب ایک قصّے کے ضمن میں دیا۔

مشہور ہے کہ ایک جزیرے میں امرا نے سنگ مرمر کے بڑے بڑے محل بنوا رکھے تھے، باغات لگا رکھے تھے، تالاب کھدوا رکھے تھے، اُن کے دسترخوان نہایت پرتکلف ہوتے تھے، جن پر سونے کے پیالے گردش کرتے رہتے تھے، اور اُن کی وضع و لباس نہایت شاندار تھی، بالخصوص عورتیں تو اور بھی زرق برق رہتی تھیں۔

لیکن اس جزیرے میں جو غریب لوگ رہتے تھے اُن کی حالت نہایت ابتر تھی، وہ لوگ

ننگے پاؤں چلتے تھے، اُن کے بچّے روزانہ پھٹے پُرانے کپڑے پہن کر، امراء کے دروازوں پر آتے تھے، اور اُن کے دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں کو اُٹھالے جاتے تھے، امراء اُن کے ساتھ صرف یہی بدسلوکی نہیں کرتے تھے کہ ان سے سخت کام لیتے تھے، بلکہ اُن کو اس قدر ذلیل سمجھتے تھے کہ جن لوگوں کے جسم پر پھٹے پُرانے کپڑے نظر آتے تھے، اُن کو عام سیرگاہوں میں جانے کی اجازت ہی نہیں تھی، اور اس ممانعت کا سبب یا یہ تھا کہ اُن کے ریشمی فرش اُن کے پاؤں کی گرد سے میلے نہ ہو جائیں یا یہ کہ اُن کی یہ بدترین حالت اُن کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔

ان اسباب سے ایک رات تمام غریب لوگوں نے شہر کو چھوڑ دیا، اور ایک پہاڑ پر جاکر امراء کے متعلق ایک کانفرنس کی، اُس کانفرنس میں نوجوانوں کی یہ رائے تھی کہ ہم کو مسلح ہو کر حالتِ خواب میں اُن پر ایک عام حملہ کر کے اُن کے مال و دولت کو تقسیم کر لینا چاہیئے، لیکن اُن کے درمیان سے ایک بڈھا جو فلاسفر تھا اوٹھا، اور تھوڑی دیر کے بعد اس طرح تقریر شروع کی۔

ایسا ہرگز نہ کرنا، جس کے تین اسباب ہیں جیسا کہ میں تم سے بیان کرتا ہوں، اول یہ کہ امراء کے پہرے دار جو اُن کی حفاظت کرتے ہیں اُن سے بھی بُرے ہیں، اور اُن کے کتّے اُن پہرداروں سے بھی زیادہ تیز و مشتعل ہیں، دوم یہ کہ یہ غارت گری عدل و انصاف کے مخالف ہے، کیونکہ اُن لوگوں نے، یا اُن کے آباؤ اجداد نے یہ مال بُری بھلی جس طرح بھی حاصل کیا ہے، وہ قانونی طور پر اُس کے مالک ہو گئے ہیں، سوم یہ کہ یہ ممکن ہے، کہ آج تم نے اپنے دشمنوں سے جو کچھ چھین لیا ہے، کل تم سے طاقتور شخص اُس کو خود تم سے چھین لے، اس بنا پر ہم کو دوسرے ذرائع پر غور و فکر کرنا چاہیئے۔

تم نے اس جزیرے کے علاوہ جس میں بدقسمتی سے ہماری پیدائش ہوئی ہے، اور جزیروں کے نام سنے ہوں گے ہمارے غریب ملاحوں نے جو امراء کے لئے کشتیوں پر اسباب عیش و عشرت

لادلاد کر لاتے ہیں ہم سے بیان کیا ہے کہ اُنھوں نے اپنے سفر کے زمانے میں متعدد بار بہت سرسبز و شاداب جزیرے دیکھے ہیں، اور اُن میں ایک جزیرہ اب تک بالکل غیرآباد ہی، جو محنت کرنے سے ایک شاداب باغ کی صورت اختیار کر سکتا ہی، ہمارے دست و بازو قوی ہیں، اور ہم ان کے ذریعہ سے اُس جزیرے میں بہت کچھ کام کر سکتے ہیں، اُٹھوا میں باوجود بڑھاپے کے تمھارا رہنما بنتا ہوں، اور بوقت ضرورت اپنے نصلح سے تھاری اعانت کروں گا، میری تو یہی رائے ہے جس کو میں نے ظاہر کر دیا، اب تم لوگ غور کرو کہ کیا کرنا چاہتے ہو؟

اُن لوگوں نے اس نصیحت کو قبول کر لیا، اور ٹوٹی پھوٹی کشتیوں پر سوار ہو کر راتوں رات اُس جزیرے کی طرف روانہ ہو گئے، امراء کو اس کا حال معلوم ہوا تو فرطِ مسرت سے ازخود رفتہ ہو گئے، اور تالیاں بجا بجا کر بآوازِ بلند کہنے لگے، "مبارک مبارک یہ نجات"!

بہرحال ان مہاجرین کے سفر پر چند سال گزر گئے، لیکن اُن کا کچھ حال نہیں معلوم ہوا، جزیرے کے باشندوں میں بعض لوگ کہتے تھے کہ سمندر اُن کو نگل گیا، بعض کی رائے تھی کہ خود اُن ہی میں سے ایک دوسرے کو کھا گیا، یہ اختلافی بحث ابھی طے نہیں ہوئی تھی کہ ایک روز ایک تجارتی جہاز اُن کے جزیرے کی بندرگاہ پر لنگرانداز ہوا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد اُس کے ملاحوں کے لب و لہجہ اور خط و خال سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ اسی جزیرے کے قدیم باشندے ہیں، ان ملاحوں نے بیان کیا کہ وہ ایک دوسرے جزیرے سے آرہے ہیں جہاں اُن کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہی، اور زراعت و کاشتکاری سے اُنکو غیرمعمولی فائدہ پہنچا ہے، لیکن اس جزیرے کے دولتمندوں نے اس واقعہ کو خرافات سے زیادہ وقعت نہیں دی اور اُس کو سُن کر پاگلوں کی طرح قہقہہ لگایا، لیکن ان ملاحوں نے جو کچھ کہا تھا اُس میں ذرّہ برابر بھی مبالغہ شامل نہ تھا، واقعی اس بنجر جزیرے میں معجزانہ طور پر نہایت کثرت سے کھیت، گاؤں، شہر، اور راستے پیدا ہو گئے تھے، اور یہاں کے لوگ نہایت اتفاق و اتحاد کے ساتھ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن امراء کے

جزیرے کی حالت بالکل اس کے برعکس ہوگئی، ان لوگوں نے غرور اور کاہلی سے اپنی کھیتی باڑی، صنعت اور حرفت کے تمام کام چھوڑ دئے، اس لیے اُن کی دولت روز بروز گھٹنے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ آرائش کے تمام سامان فنا ہوگئے، اور قصر و محل منہدم ہونے لگے، اور کوئی اُن کا دوبارہ تعمیر کرنے والا نہ رہا۔

اس تنزل کے ابتدائی دور میں ان امرا نے اپنے ہمسایہ جزیرے کے مزدوروں اور کاری گروں سے مدد چاہی، لیکن اُنھوں نے اُن کے مہاجر بھائیوں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کی تھیں، وہ اُن کے سامنے تھیں، اُنھوں نے خود اس ذلت کو برداشت کرنا پسند نہیں کیا اور اُن کی درخواستِ اعانت کو مسترد کر دیا۔

ان امرار کے پاس اگرچہ سونے چاندی کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا، اور اُنھوں نے دوسرے ممالک کے سوداگروں سے ایک مدت کے لئے تمام ضروریات کی چیزیں بھی خرید لی تھیں، لیکن دولت کتنی ہی کثیر المقدار کیوں نہ ہو، جب تک اُس میں تجدد و اضافہ نہ ہوتا رہے، وہ آخر کار ختم ہو جائے گی، اس لئے چند سال کے بعد اُن کا سرمایہ ختم ہوگیا اور اب غربا پر اُنھوں نے جو مظالم کئے تھے اُس پر اُن کو ندامت ہوئی۔

بہرحال اُن کی حالت نہایت دردانگیز ہوگئی، خدم و حشم نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ وہ اُن کی تنخواہ نہیں دے سکتے تھے، اُن کے گھوڑے گاڑی کھینچنے سے عاجز ہوگئے، کیونکہ کوئی اُن کا کھلانے پلانے والا نہ تھا، اُن کی عورتیں راستوں میں ریشمی کپڑے کے ٹوٹے ہوئے جوتے، اور زرّیں حریر کی پھٹی پرانی چادریں اوڑھے ہوئے نظر آتی تھیں، کیونکہ اُن بیگمات کو اپنے ہاتھ سے کپڑوں میں پیوند لگاتے ہوئے شرم آتی تھی، اس لئے جب لوگ اُن کو اس حالت میں دیکھتے تھے تو اُن کی ہنسی اُڑاتے تھے، اگرچہ مصیبت زدہ لوگوں پر استہزا کرنا ایک قسم کی سنگ دلی ہے۔

بہرحال امراء کا جزیرہ فقرار کا جزیرہ بن گیا، اُس میں سال بہ سال قحط کی مصیبت ترقی کرتی جاتی تھی، اور چونکہ کوئی کمانے والا نہ تھا اس لئے زمین کی پیداوار روز بروز کم ہوتی جاتی تھی؛

اور اگر اُن غوبار نے جن کو بدسلوکی کر کے ان لوگوں نے نکال دیا تھا، اِن لوگوں کی مدد نہ کی ہوتی تو یہ سب کے سب بھوک سے مر گئے ہوتے۔

امیل اس قصے کو نہایت غور اور دلچسپی سے سنتا رہا، اور جوں ہی میں نے اس کو ختم کیا وہ بول اُٹھا کہ "اس قصے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عمل، دولت اور ثروت کا اصلی سبب ہے" میں نے جواب دیا کہ یہ کوئی کلّی قاعدہ نہیں ہے، لیکن کم از کم اُس کا یہ فائدہ تو ضرور ہے کہ جو قومیں شاہ راہِ عدل پر چلنا جانتی ہیں، اُن کو وہ دولت مند بنا دیتا ہے۔

شذرہ پنجم

خطِ دیوانی

اگرچہ امیل اب لکھنے لگا ہے، اور وہ جو کچھ لکھتا ہے وہ اُس کی حالت کے لحاظ سے غیر موزوں بھی نہیں ہے، تاہم مجھے اس میں شک ہے کہ جو کچھ وہ لکھتا ہے قواعدِ خط کی پابندی کے ساتھ لکھتا ہے۔

گزشتہ زمانے میں خط کاتب کا ذاتی وصف خیال کیا جاتا تھا، اور اُس کی بُری بھلی حالت پر دلالت کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ بہت سے دقیق النظر لوگ، بعض نامعلوم اشخاص کے خط کو پڑھ کر اُن کی حالاتِ نفسیہ کا پتا لگا لیتے ہیں، اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، تمام انسانی اعمال انسان کی فطرت اور اس کی سرشت سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے اگر خط بھی جو کاغذ پر مختلف جذبات اور مختلف معانی کی نمائش کرتا ہے، نفس کی ایک نشانی، اور طبیعت کی ایک علامت ہو تو اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بہت سی لوگوں نے جن کے خطوط ہمارے سامنے موجود ہیں اپنی زندگی میں متعدد بار اپنے طرزِ کتابت میں تغیرات کئے ہیں، اس لئے لازمی طور پر یہ تغیر کسی نہ کسی عقلی تغیر کا نتیجہ ہوگا۔

اس زمانے میں لوگوں نے بہت سے عمدہ خط ایجاد کئے ہیں، لیکن جب عام طور پر اُن کی اشاعت ہوئی تو وہ سب کے سب گڈمڈ ہو کر ایک ہو گئے، اور یہ زمانہ جو ریل اور لوہے کے قلم کا زمانہ ہے، اُس کا وصف امتیازی صرف یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو ایک کر دیتا ہے۔

موجودہ علوم و فنون کی کثرت نے ہماری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی ہے، متعدد طریقے ایسے ایجاد ہو گئے ہیں، جن کے ذریعہ سے تمام لوگ ان کو آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتے ہیں، علمی روشنی روز بروز پھیلتی جاتی ہے، ہر جگہ اس کا چرچا ہوتا ہے، اور مجھے بھی اس کی عظمت سے انکار نہیں، لیکن اگر میں خود اپنے دل سے یہ سوالات کروں تو کیا مضائقہ ہے۔

کیا اس صدی میں عقل انسانی نے بارھویں صدی سے زیادہ علمی ترقی کر لی ہے؟

کیا اس صدی میں قوت نفس، اور عمل و اخلاق کی ذاتی تحریک بارھویں صدی سے زیادہ پیدا ہو گئی ہے؟ کیا قوت عقلیہ کو اس قدر وسعت حاصل ہو گئی ہے کہ تمام لوگ اُس میں برابر کے شریک ہو گئے ہیں؟

میں نے اپنے آس پاس دیکھا تو مجھ پر حیرت طاری ہو گئی، کیونکہ متوسط عقل کے لوگ نہایت کثرت سے مجھ کو نظر آئے، میں نے لوگوں کو کہتے ہوئے سُنا کہ اس زمانے میں عقل و استعداد کی اس قدر اشاعت ہوئی کہ راہ چلتے لوگ بھی اُس سے محروم نہیں رہے، لیکن اگر وہ لوگ یہ کہتے کہ "ہر شخص کے دماغ میں دوسرے کی عقل حلول کر گئی ہے" تو یہ قول زیادہ صحیح اور مناسب ہوتا۔

عقل انسانی کی یہ موجودہ حالت متعدد اسباب کا نتیجہ ہے، اور اس وقت میں اُن کا استقصا نہیں کرنا چاہتا لیکن اُن میں ایک ہمارا طرزِ معاشرت ہے، ایک ہماری پولیٹیکل غلامی ہے، ایک ہماری مادہ پرستی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ تربیت کی جو موجودہ حالت ہے وہ لڑکوں کے عیوب کو ڈھک لیتی ہے، اور بعض مصنوعی طریقہ تعلیم سے اُن کی کمزوریوں کو چھپا دیتی ہے، جن لوگوں کے ہاتھ میں تعلیمی کام ہے، وہ طلباء کو یہ نہیں بتاتے کہ اس تمام

دردسری کا مقصد یہ ہے کہ وہ بہترین عملی آدمی بن جائیں، بلکہ دولت اور اعلیٰ سرکاری عہدوں کو اُن کا اصلی مطمح نظر قرار دیتے ہیں، اور اس ذروۂ کمال تک پہونچنے کی اُن سے خواہش کرتے ہیں، اور وہ اس طریقہ سے لڑکوں پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تکلف اور تصنع یا خوشامد اور چاپلوسی کامیابی کا بہترین ذریعہ ہیں۔

شذرۂ ششم

لڑکوں سے سخت کام لینا

انگلستان کے بعض مدارس میں یہ ایک عجیب وغریب رسم ہے کہ بعض طلبا، دوسرے طلبار کی خدمت گزاری کرتے ہیں، اور خادم یا مخدوم بننے کے لئے ایک طالب العلم کی غربت اور دوسرے کی امارت بالکل بے اثر چیزیں ہیں، بلکہ اس کا تمام تر دارومدار قدامت اور درجہ پر ہے، اس بنا پر یہ ہوسکتا ہے کہ ایک نہایت دولت مند اور شریف طالب العلم ایک مبتذل اور محتاج طالب العلم کا کپڑا صاف کرے، اُس کے کمرے میں جھاڑو دے، اُس کے لئے آگ جلائے، میز پر اُس کا کھانا چنے، اور مدرسے میں اُس کی کتابیں لائے، کیونکہ خدمت گزاری کا یہ فرض صرف اُن طلبار پر عائد ہوتا ہے جو لور کلاسز میں ہوتے ہیں، اس سسٹم میں مجھے جو بات قابل اعتراض نظر آئی وہ یہ ہے کہ جن طلبا میں اس قسم کے خادمانہ ومخدومانہ تعلقات قائم ہیں، وہ اس کو ایک پرائیویٹ اور ذاتی تعلق سمجھتے ہیں اس لئے اس کے ساتھ نہایت بُرا برتاؤ کرتے ہیں، یہاں تک کہ کبھی کبھی گالی گلوج اور مار پیٹ کی بھی نوبت آجاتی ہے، اس کے سوا مجھے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی، کیونکہ اگر خود طلبار مدرسے کے تمام ضروری کام انجام دے لیں تو اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا، گزشتہ زمانہ میں ایک بلند خیال شخص نے اسی اصول پر ایک مدرسہ کو چلایا تھا، اور اُس کو تعلیم وتربیت کے

متعلق عظیم الشان فوائد حاصل ہوئے تھے، اُس نے پہلے تو تمام طلبار کے فطری ذوق اور میلانِ طبع کی بنا پر اُن کی مختلف پارٹیاں قائم کر دیں پھر اُس مذاق کے مطابق مدرسے کے تمام کام ایک ایک پارٹی کے سپرد کر دئے، مثلاً اُن میں ایک شخص جھاڑو دیتا تھا، ایک روشنی کرتا تھا، ایک صبح کے وقت تمام طلبار کو بیدار کرتا تھا، ایک مدرسے کے کمروں کو منظم اور باقاعدہ رکھتا تھا، اور سب کے سب باری باری سے کھانا پکاتے اور کھانا کھلاتے تھے، ان کاموں میں جو کام جتنا ذلیل ہوتا تھا، اوسی نسبت سے طلبار اُس کو معزز اور باوقعت خیال کرتے تھے، کیونکہ ان کے ذریعہ سے خلوص کی نمائش نہایت نمایاں طور پر ہوتی تھی، یہی وجہ ہے کہ جو طلبار ان حقیر خدمات کو انجام دیتے تھے مہتمم مدرسہ اُن کو امتیازی تمغہ عطا کرکے اُن کو دوسرے طلبار سے ممتاز کر دیتا تھا، اگر تم اس مدرسہ کو دیکھتے تو تم کو معلوم ہوتا کہ ہر طالب العلم اس قدر مسرت آمیز سرگرمی کے ساتھ اپنی خدمات کو انجام دیتا ہے کہ گویا یہ ایک اختیاری فرض ہے جس کو اُس نے خود اپنے اوپر عائد کر لیا ہے، اس خانگی خدمت میں ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ جب طلبار پڑھنے لکھنے سے تھک جاتے تھے تو وہ اُن کے لئے ایک تفریحی مشغلہ بن جاتی تھی، اس سسٹم سے اس مدرسہ کے مہتمم کا اصلی مقصد یہ تھا کہ طلبار کے دل میں تمام پیشوں اور تمام کاموں کی وقعت پیدا کی جائے، کیونکہ انسان خود جس کام کو کرتا ہے اُس کو دوسرے کے لئے ذلیل نہیں سمجھتا۔

میرا خیال ہے کہ ہم لوگ جو مساوات کی محبت کا دم بھرتے ہیں، یہ ایک طرح کی ریاکاری اور منافقت ہے، کیونکہ جو لوگ اس کے مدعی ہیں، خود اُن میں عملی طور پر مساوات کا اثر نہیں پایا جاتا مثلاً جب ایک طالب العلم کو مدرسہ یا گھر میں یہ نظر آتا ہے کہ کچھ لوگ خدمت گزاری کے لئے ملازم رکھے گئے ہیں، تو وہ علانیہ محسوس کرتا ہے کہ سخت اور ناگوار کام رذیلوں کے ساتھ مخصوص ہیں، ان کو شرفار انجام نہیں دیتے، آیندہ زمانے میں تقسیم عمل کا اصول یا اس قسم کے اور دوسرے نظری مسائل اُس کے اس اعتقاد کو زائل نہیں کر سکتے

کیونکہ طلبا، کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ خادم آقا کے دسترخوان پر کھانا نہیں کھا سکتا، اور اُن کے ماں باپ اُن کو پڑھا لکھا کر عالم اسی لئے بنانا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے حقیر اور گندے کام اُن کو نہ کرنا پڑیں، اس بنا پر جو لوگ ان کاموں کو کرتے ہیں، وہ تو اپنی اس رائے کو اس پر منطبق کر دیتے ہیں، اس لئے وہ تمام پیشہ وروں کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔

ہم نے اور رہیلانہ دونوں نے امیل سے بستر، کمرہ، اور کپڑے وغیرہ کے متعلق کل کام لینا چاہا ہے، اور اگر میں اُس کو دیکھوں کہ اپنا جوتا صاف کر رہا ہے، اور اپنا کھانا پکا رہا ہے، تو اُس کو بالکل معیوب نہ سمجھوں گا، کیونکہ اس سے اُس کو صرف یہی فائدہ حاصل نہ ہو گا کہ وہ اس قسم کے کام کرنے والوں کو حقیر نہ خیال کرے گا، بلکہ غیروں کی اعانت سے بے نیاز ہو کر وہ اپنی شخصی آزادی کو ترقی دے سکے گا، کیونکہ سب سے بڑا غلام وہ ہے جو اپنا کام خود نہ کر سکے،

شذرہ ہشتم

علم جلوہ گاہِ عمل میں

کل میں نے "امیل" اور "لولا" کے ساتھ قلعی ڈھالنے کے ایک کارخانہ کی سیر کی، یہ کارخانہ سمندر کے بالکل سامنے واقع ہے، اور اُس کی عمارت قدیم وضع کی بنی ہوئی ہے۔ قلعی پگھلائی جاتی ہے تو بڑی محنت کے بعد کنکری، گندھک اور تانبے کے اجزا اُس سے الگ کئے جاتے ہیں اور اُن کے الگ ہو جانے کے بعد اُس کے ڈھالنے کا وقت آتا ہے اور یہ منظر خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہوتا ہے، یہ شفاف اور وزنی دھات ایک سوراخ سے جو چولھے کے نیچے ہوتا ہے، صاف ہو کر نکلتی ہے، اور لوہے کے ایک بڑے ظرف میں گرتی ہے، اس وقت اُس کی مدور شکل اور اُس کی چمک سے گرمی کی راتوں کا چاند یاد آجاتا ہے۔

قلعی جب دوبارہ پگھلا کر اس آہنی ظرف میں ڈھالی جاتی ہے، تو اُس پر سرسبز درخت بالخصوص سیب کے درخت کی شاخیں ڈال دی جاتی ہیں، اور اُس وقت اُس میں نہایت جوش پیدا ہوجاتا ہے اور اُس سے جو بلبلے اُٹھتے ہیں، اُن سے چھینٹے اُڑ کر چنگاریوں کی طرح ہر طرف پھیل جاتے ہیں، اس لئے جو کاریگر اُس کے پاس سے ہٹ نہیں جاتے اُن کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس کارخانے میں جو کیمیاوی تغیرات و استحالات ہوئے اُن کو اگرچہ امیل اور لولانے نہایت ابہام کے ساتھ سمجھا تاہم یہ جدید منظر اُن کو نہایت پسند آیا، اور اُنھوں نے مجھ سے دوبارہ اُس کے دیکھنے کی خواہش کی۔

مربیان اطفال نے علم کو اُس کے صنعتی تعلقات سے بالکل الگ کر رکھا ہے، اگرچہ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مدارس میں جو کیمیائی تجربہ گاہیں موجود ہیں اُن سے تعلیم میں بہت بڑی مدد ملتی ہے، اور میں آیندہ اپنے بچے کی تعلیم میں اُن سے مدد لوں گا، تاہم سردست مجھے یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں اُس کو دوسرے کارخانے میں لے جاؤں جہاں تمام اعمال اور واقعات اُس کی نگاہ کے سامنے آجائیں، اس لئے میں نے اس کارخانہ کی سیر سے فارغ ہونے کے ساتھ آثارِ قدیمہ کے ایک دوسرے عجائب خانے کو دیکھا جس میں رانگا قلعی، تانبا اور اس قسم کی مختلف دھاتیں بہ کثرت موجود تھیں، لیکن امیل نے ان کی طرف بہت کم توجہ کی، البتہ لولا نے بلور کے ایک ٹکڑے کو خاص دلچسپی کے ساتھ دیکھا، اور اس کے علاوہ اُن پتھروں کو بھی شوق سے دیکھتی رہی، جن سے کوئی زیور یا آرائش کی چیز بنائی جاسکتی ہے، اس کے چند روز کے بعد ہم نے ایک تراشا ہوا پتھر دیکھا جو سمندر کے کنارے پہاڑوں کے درمیان دور تک نمایاں نظر آتا تھا اور یہ بچے تمام دنیا کے عجائب خانوں سے زیادہ شوق کے ساتھ اُس کو دیکھتے تھے، اگر لڑکوں کو چند دھاتیں ایک خاص نظام و ترتیب کے ساتھ دکھائی جائیں، لیکن اُن میں کسی قسم کی جذب و کشش نہ ہو تو ان کا اُن پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بخلاف اس کے، اگر اُن کے سامنے قدرتی چٹانیں، ناہموار زمینیں، اور سیاہ پتھروں کے تودے،

نمایاں ہوں تو وہ بالکل مدہوش ہو جاتے ہیں، امیل پر بھی اس تراشے ہوئے پتھر کا سخت اثر پڑا، اور اُس نے فریفتگی کی حالت میں اُس کے تراشنے والوں کی طرف مخاطب ہو کر گفتگو شروع کر دی جو بالکل بے نتیجہ رہی، ہوج میلار برطانیہ میں ایک نہایت مشہور سنگ تراش ہی، اور امیل بھی فطرۃً اُس کا مقلد بننا چاہتا ہے، اور عام بچوں کی طرح اوس کے راستے میں جو کنکر پتھر آجاتے ہیں، اُن کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، اُس کو جو آثار خود اُن چٹانوں میں نظر آتے ہیں، وہ اُس آثار سے زیادہ قیمتی ہیں جو عجائب خانوں میں نہایت ترتیب و نظام کے ساتھ نمایاں کئے جاتے ہیں، کیونکہ اجسام عضویہ کے آثار زیادہ تر پتھروں کے اندرونی حصہ میں نظر آتے ہیں اس لئے اُن کے نکالنے سے پہلے اُن کو اُس سے الگ کر لینا چاہئے، بلکہ امارات و قرائن سے پہلے ہی ان کا اندازہ کر لینا چاہیئے، اس کے علاوہ بعض پتھر نہایت سخت ہوتے ہیں جو سنگ تراش کے ہتوڑے کا مقابلہ کرتے ہیں، بعض نہایت نرم ہوتے ہیں، اس لئے فوراً ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں، بہر حال ان دونوں حالتوں میں ہتھوڑے کی ایک ضرب زمانے کے صدیوں کے بنے بنائے کھیل کو بگاڑ دیتی ہے، اور لڑکا ان سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے، یہ سچ ہے کہ امیل اس میں بارہا غلطیاں کرے گا، اور جو صحیح و سالم پتھر پائے گا اُن کو پسند نہ کرے گا، تاہم اس میں کوئی حرج نہیں، لڑکوں کی عام عادت ہے کہ جب وہ اس قسم کی چیزوں سے مغلوب ہو جاتے ہیں، تو اُن پر غصہ کرتے ہیں، اور اُن سے انتقام لینا چاہتے ہیں، امیل بھی یہی طریقہ اختیار کرے گا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ سنگتراشی کے ان نمونوں کو دیکھ کر انسان کی توجہ علم طبقات الارض سے ہٹ کر فنِ عمارت کی طرف مبذول ہو جاتی ہے، اس لئے امیل جب بڑے بڑے شہروں کی عالیشان عمارتیں دیکھتا ہے، تو اُس کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے پتھر قدیم سمندروں کی تہ سے نکال کر تراشے گئے ہیں، اور جب اُس کو عبادت گاہ اور محل نظر آتے ہیں تو اُن کے پتھر اُس چٹان کو اُس کی نگاہ کے سامنے کر دیتے ہیں جس سے یہ تراشے گئے ہیں۔

انسان جس علم کو نہایت عرق ریزی سے حاصل کرتا ہے، وہ اگرچہ وسیع نہیں ہوتا تاہم

نہایت مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے، مثلاً ایک کلی جو ہزاروں دشواریوں کے بعد توڑی گئی ہی، انسان کو اُس کلی سے زیادہ یاد رہ سکتی ہے جس کا نقشہ علم النباتات کی کسی کتاب میں دکھایا گیا ہے، انسان جو گھونگھے اور سیپ سمندر کے کنارے سے چن لیتا ہے، وہ اُس کے لئے اُن گھونگھوں سے زیادہ نتیجہ خیز ہوتے ہیں جو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الماریوں میں رکھے جاتے ہیں، بہر حال جستجو وتلاش سے انسان کی نگاہ اور انسان کے ہاتھ پاؤں میں لچک، اور حرکت پیدا ہوتی ہے، جو لوگ تعلیم کا شوق رکھتے ہیں اُن کے لئے طبعی اور کیمیاوی تجربے بے شبہ مفید ہیں، لیکن لڑکوں کے دل میں ان تجربوں سے زیادہ علم کا شوق اُن آثار سے پیدا ہوتا ہے جو صنعت گاہوں میں نظر آتے ہیں، اس لئے ہر بڑا کارخانہ، کارخانہ ہونے کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ بھی ہے، اُس میں قوای طبعیہ کا نظارہ جو کبھی مقید نظر آتے ہیں اور کبھی آزاد کس قدر عجیب ہے؛ اگرچہ اول اول یہ نظارہ لڑکوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے، لیکن اگر اُن میں کوئی علمی شوق کی بات ہوتی ہے، تو وہ اُس کو دریافت بھی کر لیتے ہیں، مثلاً یہ کہ اس مادہ کا دوسرے مادے پر کیا اثر پڑتا ہے؛ اور کس طرح قدرتی چیزیں مصنوعی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

بننے کی حالت میں چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی انسان کے دل میں علم کا شوق پیدا کر دیتی ہی؛ اس لئے دیا سلائی کی ڈبیہ، اور آلپین کو بھی جیسا کہ علم الطبعیات کے ایک عالم کا بیان ہے، علم طبعی اور علم کیمیا سے خاص تعلق ہے، جس کو ہر شخص اول نظر میں معلوم کر سکتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ متعدد صناعیوں کے علم کے لئے ایک بڑی طویل عمر کی ضرورت ہے، اس لئے میں امیل سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ ایک شخص کو کسی صنعت گاہ میں مصروفِ عمل دیکھ کر اُس کے تمام ہتھکنڈوں سے واقف ہو جائے گا، تاہم نوجوانوں کو بہ نسبت دوسروں کے کم وقت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اگر لڑکے کی توجہ اُس کے مقصد کی طرف عمدہ طریقے سے مبذول کر سکیں تو مجھے یقین ہے کہ ایک بارہ یا تیرہ برس کے سن کا لڑکا کارخانوں میں بہت کچھ سیکھ سکتا ہی۔

خلاصہ یہ کہ بڑے بڑے شہروں بلکہ دیہاتوں تک میں ایسے کارخانے موجود ہیں کہ اگر لڑکے اُن میں آتے جاتے رہیں، تو مادہ کے بہت سے قوانین اُن کو معلوم ہو سکتے ہیں، اور ایک مزدور یا کاریگر کی وقعت اور محبت اُن کے دل میں قائم ہو سکتی ہے، اس کے ساتھ یہ فائدہ بھی ہوگا کہ اس کو زراعت اور صنعت کے بہت سے طریقے نظر آجائیں گے، اگرچہ وہ خود ان کاموں کو نہیں کرے گا، تاہم اس قدر دیکھ لینا بھی مفید ہے، تو کیا عقل اُس کو جائز رکھتی ہی کہ علوم وفنون کے ان سرچشموں سے بے پروائی کی جائے، اور صرف الفاظ کے رٹ لینے کو اپنی توجہ واہتمام کا مرکز قرار دیا جائے؛

شذرہ نہم

یونانی اور لیٹن زبان کی تعلیم پر تنقید

ہر بچے کو ایسی تعلیم دینی چاہئے جس سے وہ ایک بڑا آدمی بن سکے، اور تعلیم کی یہی خصوصیت اس کو آیندہ زمانے میں عام لوگوں سے ممتاز کر سکتی ہے، اس طریقہ تعلیم کے لحاظ سے مربی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ لڑکے کے انداز طبیعت، میلانِ طبعی، اور استعدادِ عقلی کا پتہ لگائے، اور دنیا میں فضل وامتیاز حاصل کرنے کے جو سیکڑوں طریقے ہیں، اون میں وہ طریقے اختیار کرے جو اُس کی انداز طبیعت، میلان طبع اور استعدادِ عقلی کے مناسب وموزوں ہوں۔

میں موجودہ طریقہ تربیت میں جس چیز کو سب سے زیادہ قابلِ اعتراض پاتا ہوں وہ یہ ہے کہ بچوں کے قوائے طبعی، اور اُن کی شخصی استعداد وقابلیت کا بالکل لحاظ نہیں رکھا جاتا، مثلاً ایک بچہ فطرتاً سیر وسیاحت کا ذوق رکھتا ہی اور اس لحاظ سے اس کو موجودہ زندہ زبانوں کے

لہ ۔ ہمارے ہندوستان میں اگرچہ لیٹن اور یونانی زبانیں نہیں پڑھائی جاتی تاہم بہت سی چیزیں ایسی پڑھائی جاتی ہیں جن پر وہ تمام اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں جو لیٹن اور یونانی زبانوں کی تعلیم پر وارد ہوتے ہیں۔

سیکھنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ وہ غیر ملک کے لوگوں سے گفت وشنید کر سکے، لیکن ہمارے مربیان اطفال اس کو دو مہمل زبانیں (لیٹن اور یونانی) ایسی سکھاتے ہیں جو بالکل مردہ ہو چکی ہیں، اور دنیا میں کوئی شخص اُن کو نہیں بولتا، اسی طرح ایک لڑکا میکانکس کا طبعی ذوق رکھتا ہے، جس کے لئے عملی تعلیم کی ضرورت ہے، لیکن ہمارے مربیانِ اطفال اُس کو کتابوں کے ایک بحر بیکراں میں غرق کر دیتے ہیں، علیٰ ہذا القیاس ایک لڑکا تجارت کے لئے موزوں ہے، ایک میں زراعت کی صلاحیت ہے، لیکن ان کے ان میلانات کا بالکل لحاظ نہیں رکھا جاتا، اور اُن کو وہی تعلیم دی جاتی ہے جو عام طور پر شائع و ذائع ہے، کیونکہ عرف عام کی بنا پر عالم صرف اُسی شخص کو کہہ سکتے ہیں جو آٹھ برس تک مدرسہ میں مقید رکھا جائے۔

ہم نے لیٹن اور یونانی زبان کے بہت سے ایسے طالب العلم دیکھے ہیں، جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں ان زبانوں کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا، کیونکہ جب یہ لوگ مدرسہ سے نکل کر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں، تو اُن میں کون ورجل[1] اور ہومر[2] کے کلام کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھتا ہے؟ لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا کا کوئی علم ہر قسم کے فائدے سے بالکل خالی ہے، البتہ مجھ کو اس میں شک ہے کہ طلباء ان دونوں زبانوں کی تعلیم میں جو وقت صرف کرتے ہیں، اُن کو ان زبانوں کی تعلیم سے اُس کے برابر فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے؛

ان زبانوں کے حامی اُن کی تعلیم کی ضرورت کو جن دلائل سے ثابت کرتے ہیں میں اُن سے واقف ہوں، وہ کہتے ہیں کہ ان زبانوں کا علم ایک چھٹے قسم کا حاسہ ہے، جس سے ہم اپنی زبان کی باریکیاں معلوم کر سکتے ہیں، وہ ہم کو مادی اشغال سے نجات دلاتی ہیں، وہ ہمارے موجودہ زمانے کے بالمقابل جس میں تمام لوگ مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں، جس میں تمام درجات و مراتب فنا ہو گئے ہیں، جس میں ہر شخص صرف حقائق واقعیہ سے غرض رکھتا ہے، ابطال و مشاہیر کے زمانوں کو پیش کرتی ہیں، اور مخترعاتِ خیالیہ کو جلوہ دیتی ہیں۔

---

[1] ایک مشہور لاطینی شاعر [2] یونان کا سب سے بڑا شاعر۔

اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ان زبانوں کی کتابیں اس قسم کے پرجوش وطنی گیتوں سے بھری ہوئی ہیں جنھوں نے جمہوریت کے عہد زرّیں میں بادشاہوں کو نہایت ذلت آمیز ٹھوکریں لگائی تھیں، اور اُن ہی کا یہ اثر ہے کہ اس اٹھارھویں صدی میں روما ایتھنز کی ہوا کے ایک جھونکے سے ہمارے سینوں میں بادشاہوں کی بغض و عداوت کا آتش کدہ بھڑک اُٹھتا ہے، مجھے اس سے بھی اختلاف نہیں ہے کہ یونانی اور لیٹن زبانوں کی تعلیم ایک قسم کی روحانی ورزش ہے، لیکن میرے نزدیک روحانی ورزش اور عقلی تربیت، کے مختلف طریقے ہیں، اس لئے تعلیم کو علوم و فنون کی صرف ایک شاخ میں محدود کر دینا سخت ظلم ہے، ایک آدمی مشہور عالم ہو سکتا ہے، ایک آدمی فصیح البیان مقرر ہو سکتا ہے، اور ایک آدمی ایک دلیر پالیٹشن ہو سکتا ہے، اور امریکہ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، لیکن با ایں ہمہ اُس نے عمر بھر ارسطو[۱] دیما ستھینیز[۲]، اور سسرو[۳] کی کتابیں اُن کی اصلی زبانوں میں نہیں پڑھی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بذاتِ خود تمام کاموں پر غور و فکر کر کے، لوگوں کے ساتھ معاملات رکھ کے لوگوں سے مل جل کے، اپنی زبان کی تعلیم حاصل کر کے، اپنی فطری استعداد کے ذریعہ سے ایسی قابلیت پیدا کر سکتا ہے جو اُس کو مدارس کے مزخرفات سے بالکل بے نیاز کر سکتی ہیں، اس بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ لڑکا جن حالات سے گھرا ہوا ہے، اور اُس میں جو قوتیں اور صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، اُن ہی کو طریقۂ تعلیم و تربیت کی تاسیس میں اصل قرار دینا چاہیئے، کیونکہ طریقۂ تعلیم بچوں کے لئے بنایا جاتا ہے، بچے طریقہ تعلیم کے لئے نہیں بنائے جاتے۔

مجھے اچھی طرح امیل کی قابلیتوں کا حال معلوم نہیں ہے، اس لئے میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس قسم کی تعلیم اُس کے انداز طبیعت کے لئے موزوں ہے، البتہ مجھے یہ اُمید ہے کہ وہ علوم و فنون اور زبان کے ذوق سے بالکل ناآشنا نہ ہوگی مجھے زبان اور علوم و فنون کی تعلیم پر صرف یہ اعتراض ہے کہ یونانی اور لیٹن زبانوں کی تعلیم میں وقت بہت صرف ہوتا ہے، کیونکہ ایک بیکار زبان کی تکمیل

---

[۱] مشہور حکیم۔ [۲] مشہور یونانی اسپیکر۔ [۳] مشہور رومی اسپیکر۔

تعلیم میں آٹھ سات سال کا زمانہ صرف کر دینا ایک عظیم الشان اسراف ہے، اور اس لئے میں اس پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتا ہوں کہ آیا طلبار کی موجودہ مشکلات کے لحاظ سے یہ اسراف ایک ضروری چیز ہے؟ یا یہ کہ اس میں تغیرات کر کے اس طویل مدّت کو بہت کچھ گھٹایا جا سکتا ہے؟

اس طوالت کے متعدد اسباب ہیں، جن میں ایک سبب یہ ہے کہ ابھی تک طلبائ کو روم اور یونان کے حالات سے بالکل واقفیت نہیں ہوتی کہ لیٹن اور یونانی زبان کی تعلیم شروع کرا دی جاتی ہے، حالانکہ میرے نزدیک انسان کسی زبان کی بہترین تعلیم اُن ہی ملکوں میں حاصل کر سکتا ہے جہاں وہ بولی جاتی ہے، اسی بنا پر میں امیل کی تعلیم میں روم اور یونان کے آثار قدیمہ کو جمع کر کے ایک شہر آباد کروں گا جس میں وہ ان زبانوں کی تعلیم حاصل کرے گا اور اس طرح قصر بلوری کے نمونے پر علمی یادگاروں کے قائم کرنے کا فائدہ علانیہ نظر آجائے گا، یہ سچ ہے کہ ان یادگاروں میں جو تصویریں اور مجسّمے ہوں گے، اور جو قدیم عبادت گاہیں، اور پرانی عمارتیں نمایاں کی جائیں گی، اُن کو دیکھ کر کوئی شخص ورجل اور ہومر کے اشعار کو نہ سمجھ سکے گا، لیکن اگر یونانی اور لیٹن زبانوں کی تعلیم کے ساتھ ان دونوں قوموں کی تاریخ بھی شامل کر لی جائے تو یہ زبانیں اس قدر بے کار اور فرسودہ نہ رہ جائیں گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ طلبار پر فنِ تصویر کا نہایت غیر معمولی اثر پڑتا ہے، وہ اسلاف کے کارناموں کو اُن کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے، اور طلبار کی عقل کو اُس میں جولانی دکھانے کا موقع ملتا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سن (قبل بلوغ) میں استقلال ذاتی کا ظہور بہت کم ہوتا ہے، اس لئے بچے نہایت آسانی کے ساتھ دوسرے شخص کا قالب اختیار کر لیتے ہیں، اس بنا پر اگر طلبار کو یونانی تصاویر اور رومن آثار قدیمہ ہی کے ذریعہ سے اُن کے ساتھ معاشرت کا موقع حاصل ہو، تو اُن کی زبان جاننے سے پہلے وہ اُن کے اخلاق وعادات کو اختیار کر سکتا ہے۔ شاید تمھارا یہ خیال ہو کہ زمانہ قدیم کے آثار کا یہ خیالی وجود محض ایک وہمی

چیز ہے، لیکن درحقیقت گزشتہ زمانے کی کوئی چیز پورے طور پر مری نہیں ہے، اس لئے اپنے آدھے وجود کے ساتھ وہ ان آثارِ قدیمہ کے پردے میں زندہ ہے۔

اِن دونوں زبانوں کے طریقہ تعلیم نے ہم کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہونچایا، کیونکہ اس طریقہ پر ہمیشہ قدامت کا اثر غالب رہا، جس کی وجہ یہ تھی کہ آثار سلف کی حقیقی تعلیم میں ہمیشہ رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں، اور سب سے پہلے عیسائی مذہب نے اُس کی راہ میں کانٹے بچھائے، عیسائی مذہب یونانیوں اور رومیوں کے دیوتاؤں کو اگرچہ پامال کرچکا تھا، تاہم اُس کا خیال تھا کہ وہ اس پائمالی کی حالت میں بھی اُس کو مزید نقصان پہونچا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو اس مذہب کے پیشوا قدیم زبانوں کی تعلیم کو اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتے تھے، دوسری طرف اُن کی جو تعلیم دیتے تھے، اُس سے اُس کی اصلی روح نکال لیتے تھے، یعنی اسلاف کے کارناموں اور صناعیوں کو بالکل نظر انداز کردیتے تھے، ان بت پرستوں کے علوم وفنون، اور لٹریچر اور زبان کی یہ لوگ بڑی قدر کرتے تھے، لیکن طلبار کے سامنے اُن کے اسرار وغوامض کی پردہ کشائی کرنے میں سخت احتیاط سے کام لیتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ ان اسرار کے چہرے سے پردے کا صرف ایک گوشہ ہی اُٹھانا مناسب ہے، ورنہ اگر طلبار کو اُس کے تمام خال وخط نمایاں طور پر نظر آگئے، تو وہ مادہ پرست، فطرت پرست، اور نیچر پرست ہو جائیں گے اسی بنا پر عیسائی مذہب کے پادری طلبار کو ہمیشہ یہ سکھلاتے رہے کہ بت پرستوں کے دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں، وہ محض کذب وفریب ہیں، اُن کو صرف دور ہی سے دیکھنا چاہیئے، وہ بھی عیسائی مذہب کی رہنمائی کے ساتھ۔

لیکن ان دونوں زبانوں کی تعلیم میں امیل کو اس شکنجہ میں نہ جکڑوں گا، میرے نزدیک جو شخص کسی چیز کی تعلیم حاصل کرتا ہے، اُس کو کچھ نہ کچھ اُس کا معتقد ضرور ہونا چاہیئے، کیونکہ اگر اُن اشخاص کے چہرے سے پردہ اُٹھا دیا جائے جن کو خُرافاتِ قدیمہ نے قدمار کے عالمِ خیال میں پیدا کیا تھا اور اُن کی زندگی بچوں کے خیالات کے بالکل مطابق واقع ہوئی تھی، اور اگر ان

تمام توہمات کو دور کر دیا جائے جو بچّوں کے دل میں اُن کی نسبت پیدا ہوئے ہیں، تو نہایت سرعت کے ساتھ خود نوع انسانی کے متعلق اُن کے عقائد متزلزل ہو جائیں گے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میں امیل کو بت پرست بنانا چاہتا ہوں، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ جو شخص کسی قوم کی زبان کے اسرار و غوامض کو سمجھنا چاہتا ہے، اُس کو اُس کے دیوتاؤں کو بھی اُٹھتی ہوئی نگاہ سے دیکھنا پڑے گا۔

شذرہ دہم

تقلید اور قوتِ حافظہ

عقلی فتنہ گری کے لحاظ سے ان دونوں قوتوں کو خرافات کہن کی اُس پری پیکر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو بحر صقلیہ میں نمودار ہو کر اپنی نرم و نازک آواز سے ملاحوں کو فریفتہ کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیتی تھی، کیونکہ زبانوں کی تعلیم میں ان دونوں قوتوں کو جو اہمیت حاصل ہے، اور عقل کو اسالیب زبان کا فریفتہ کر کے وہ جس طرح دوسرے کلام کی خوبیوں سے غافل کر دیتی ہیں، اُس کے لحاظ سے یہ دونوں حقیقی استعداد کا بالکل گلا گھونٹ دیتی ہیں، لیکن درحقیقت ان دونوں قوتوں پر یہ الزام نہیں عائد ہوتا، اصلی جرم مربیانِ اطفال پر عائد ہوتا ہے جنھوں نے ایک خاص طریقہ سے عقل کی تربیت کی ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ دونوں قوتیں فطرت کا ایک مبارک عطیہ ہیں، لیکن با ایں ہمہ اُن کی نشو و نما میں غلو کرنا مناسب نہیں، ایک طالب العلم جس نے ہمارے طریقہ کے موافق تربیت پائی ہے، بہت سی ایسی چیزوں کا وصف بیان کرتا ہی جن کو اُس نے کتابوں میں تو پڑھ لیا ہے، لیکن خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے، وہ نظم و نثر کے بہت سے فقرے بولتا ہے، جو مختلف احساسات و جذبات پر دلالت کرتے ہیں، لیکن وہ ان احساسات و جذبات سے بالکل غیر متاثر ہے، اور وہ غیروں کے مختلف تاثراتِ قلبیہ کا اظہار

کرتا ہے، لیکن خود اس کے دل پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے، اگر تم اُس سے خواہش کرو تو وہ درختوں اور اُن کے سایوں، مویشیوں اور اُن کے چرواہوں، اور فصل بہار اور اُس کی کلیوں کے متعلق ورجلؔ[1] اور ہوراسؔ[2] کی تمام نیچرل نظمیں تم کو سُنا دے گا، لیکن اگر تم اُس سے یہ کہو کہ خود کھیتوں میں جاکر دیکھے کہ اُن میں کیا پیدا ہوتا ہے اور کیونکر پیدا ہوتا ہے، تو وہ اس سے سخت احتراز کرے گا، اور اُس کے دل میں یہ ڈر پیدا ہو جائے گا کہ کہیں وہ لیٹن زبان کو نہ بھول جائے، اور قدما نے اظہار خیالات کے لئے جو لفظی تراش خراش کی ہے وہ کہیں اُس کو فراموش نہ ہو جائے، اگر تم اُس سے کسی جنگ کا حال پوچھو تو وہ نہایت واضح طور پر اُن ہتھیاروں کا نام گنا دے گا جو اُس میں استعمال کئے گئے، وہ نہایت شاندار الفاظ میں یہ بتا دے گا کہ فوجیں باہم کیونکر ایک دوسرے سے ٹکرائیں، لیکن بااین ہمہ اُس نے اس جنگ کا منظر خود نہیں دیکھا ہے، اس لئے اگر تم دشمن کے محاصرہ کے متعلق خود اس کا عملی امتحان لینا چاہو تو وہ اپنی سپر ڈال دے گا۔

مجھ کو ایک ایسے شریف لڑکے کا نام معلوم ہے، جس نے ایک نظم کے صلے میں جو سمندر میں کشتی رانی کا منظر نمایاں کرتی تھی ایک تاج انعام میں پایا، لیکن اُس نے خود اپنی تمام عمر میں نہ کشتی دیکھی تھی نہ سمندر۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں جو نوجوان مدرسوں کو چھوڑتے ہیں، وہ آثار سلف کو بالکل پس پشت ڈال دیتے ہیں لیکن اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ قدما کی یادگاروں کی بجائے دور حاضر کی یادگاروں پر جان دینے لگتے ہیں، کیونکہ دل پر تقلید کے زنگ کی جو تہیں چڑھی ہوئی تھیں اُن کو دور کر کے نفس کی فطری صفائی کا اعادہ کچھ ایسا آسان کام نہیں ہے ہم روزانہ شاعروں اور انشا پردازوں کے متعلق اُن کے مداحوں کا یہ فقرہ پڑھتے رہتے ہیں کہ "وہ فرد کامل ہے لوگ اُس کی شاعرانہ روح کی جستجو کرتے ہیں" لیکن خدا کے لئے مجھ کو یہ بتاؤ کہ ان جستجو کرنے والوں نے خود اپنی روح کہاں گم کر دی ہے کہ دوسرے کی روح کو ڈھونڈھتے ہیں، جو تربیت انسان

---

[1] ایک مشہور لیٹن شاعر۔ [2] ایک مشہور لیٹن شاعر۔

کے شعور ذاتی کو اس طرح گم کردے کہ اُس کی تلاش میں برسوں لگ جاتے ہوں وہ ایک نہایت عجیب چیز ہے، میں امیل کو صرف آداب لغت کی تعلیم کا شوقین بنانا نہیں چاہتا، اگر ہم قوت حافظہ کی نقش آرائیوں سے اُس کی عقل پر پردہ ڈالدیں تو یہ ہماری انتہائی ناکامیابی ہوگی، اس بنا پر میں نے یہ مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ لغات قدیمہ کی تعلیم کو ابھی ملتوی رکھوں گا، اور مشاہدہ اشیاء کو علم الالفاظ پر مقدم کروں گا، اس طرح اُس کا نامکمل علم دنیا میں ایک اصل پر منطبق ہوسکے گا۔

البتہ ہم یونانی اور رومن انشا پردازوں کے ذریعہ سے اُن کی زبان کی روح، اُن کے اسلوبِ بیان، ترتیب معانی، اور اُن کے مناسب منتخب اور برگزیدہ الفاظ کو لے سکتے ہیں، مثلاً جو لوگ غیر ملکوں کے برگزیدہ اصحاب کی صحبت اختیار کرتے ہیں، وہ اُن کی بہت سی خصوصیات اپنے اندر پیدا کرلیتے ہیں، لیکن بایں ہمہ بالکل اُن کے مشابہ نہیں ہوجاتے اسی طرح قدماء کی یادگاروں کے ذریعہ سے ہم کو اُن کے ساتھ جو میل جول ہوجاتا ہے، وہ ہم کو اُن کی عقل اور زبان کی بہت سی رسمی باتوں سے الہامی طور پر واقف کردیتا ہے، اور یہ واقفیت ہر متمدن قوم کے لئے موزوں ہوتی ہے۔

غیر شریفانہ تقلید (چاہے قدماء کی ہو یا موجودہ دور کے لوگوں کی) کا اثر صرف یہی نہیں ہوتا کہ اس سے علوم وفنون کا ذوق بالکل فنا ہوجاتا ہے بلکہ بچوں کے دل سے عزت نفس کا احساس بالکل جاتا رہتا ہے، کیونکہ الفاظ کے ذریعہ سے جو غلط یا صحیح معانی اُن کی سمجھ میں آتے ہیں، وہ اُن کو سخت سے سخت فریب دیدیتے ہیں، اسلوبِ زبان طرز انشاء الفاظ اور جملے ایسی چیزیں ہیں جو دل پر جادو کی طرح اثر کرجاتی ہیں، اس لئے طلباء جو کچھ بولتے ہیں یا جو کچھ لکھتے ہیں، اُس کی نسبت اُن کو یہ وہم پیدا ہوجاتا ہے کہ اُنھوں نے یہ کام سوچ سمجھ کر کیا ہے، حالانکہ اُنھوں نے نہ سوچا ہے نہ سمجھا ہے بلکہ دوسرے سوچنے سمجھنے والوں کے خیالات کا اعادہ کردیا ہے۔

خدا کی قسم جن اباطیل واکاذیب نے صدیوں سے عقلی روشنی کو بجھا دیا ہے، اُن کا اصلی

سنگ بنیاد یہی تقلید ہے، کیونکہ غلامی کی جو مختلف قسمیں ہیں وہ باہم لازم وملزوم ہیں، اس لئے جو شخص ایک قسم کی غلامی کو قبول کرلیتا ہے، اُس کی گردن دوسری قسم کی غلامی کے سامنے بھی آسانی سے جھک جاتی ہے۔

جو طالب العلم تقلید کا خوگر ہو جاتا ہے، اُس کے کیریکٹر میں نرمی اور اطاعت کی روح سرایت کر جاتی ہے اس لئے وہ عزم و استقلال کے موقعوں پر مضطرب القلب اور بزدل بن جاتا ہے، یہ سچ ہے کہ وہ کبھی کبھی شہرت کے لئے اپنی جان کو جنگی خطرات میں ڈال دیتا ہے، لیکن اگر اُس سے یہ کہا جائے کہ ایک وحشیانہ عادت کا مقابلہ کرے، یا حق کی تائید اس لئے کرے کہ اُس کی تائید کرنے والے بہت کم ہیں، تو وہ لومۃ لائم کے خوف سے فوراً اپنے قدم پیچھے ہٹالے گا، اور بزدلوں کی طرح بھاگ نکلے گا۔

اس قسم کے لوگ جن کا قالب ذاتی روح سے خالی ہے، اگرچہ نہایت عیش و آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن یہ زندگی ذلتوں سے لبریز ہوتی ہے، مجھے ایک طویل القامت حاضر جواب بیوہ عورت کا نام معلوم ہے، جس کے صرف ایک ہی لڑکا تھا چنانچہ اُس نے بہترین مروجہ طریقے کے موافق اُس کی تربیت کرنا چاہی، اور اس غرض سے اُس نے گفتگو کے مناسب اوقات میں لیٹن انشا پردازوں کے اقوال سے استشہاد کرنا، اُن کے اشعار پڑھنا اُن کی ضرب الامثال کو بیان کرنا مناسب خیال کیا، اُس کے بعد اُس نے اپنے لڑکے کو مدرسہ میں بھیجا تو داخلہ کے دن وہ جس قدر بے وقوف تھا، اُتنا ہی بے وقوف ہمیشہ رہا، لیکن چونکہ اُس کی قوتِ حافظہ نہایت عمدہ تھی اس لئے ہر موضوع پر گفتگو کرتا تھا، اور جو رائے ظاہر کرتا تھا اُس کو لوگ نہایت پسند کرتے تھے، کیونکہ جو لوگ ہر شخص کی بات کو مان لیتے ہیں، اور اُن کی رائے کی مخالفت نہیں کرتے وہ لوگوں کو نہایت آسانی کے ساتھ خوش رکھ سکتے ہیں، بہرحال وہ بڑا بولنے والا تھا، لیکن اُس میں اخلاقی طاقت نہیں پائی جاتی تھی، اُس کی صورت نہایت عمدہ تھی، مگر اُس کی فکر بانجھ تھی اس کی ماں نے اس کو ایک مدبر، کسی حاکم کا نائب، یا ایک پولیٹکل

وزیر بنانا چاہا، اب اگر تم یہ سوال کرو کہ اُس نے اُس کو کیا بنایا ؟ تو میں کہوں گا کہ طفیلی۔

بظاہر ہمارا طریقہ تربیت ایک تمسخر انگیز چیز ہے، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہو، اور اُس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ہمارے نظام سیاسی کے مطابق نہ ہو، تاہم بظاہر اُس کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔

ہمارے مدرسے کے طالب العلموں کو حکومت ایک دانشمندانہ معنوی نظام کے مطابق کام کرنے کے لئے تیار کر دیتی ہے چنانچہ جو لوگ اُن کی تعلیم و تربیت کا فرض انجام دیتے ہیں، وہ اُن پر علوم و فنون کا ایک سرمایہ تقسیم کر دیتے ہیں جن کی تقلید آئندہ زمانے میں اُن پر فرض ہو جاتی ہے، اس کے ساتھ ایک نرم آواز میں کہتے ہیں، بچو! اس شاہ راہ سے قدم کسی دوسری طرف نہ ہٹانا" یہ سچ ہے کہ بہت سے طلباء اُن کی نہیں سنتے، اور بہت سے طلباء آزاد خیالوں کی پارٹی کی طرف اپنا میلان رکھتے ہیں، لیکن اس جرم میں اُن کو کتنی سخت سزائیں دیجاتی ہیں وہ یونیورسٹیوں میں کوئی علمی کام نہیں کرنے پاتے، سلطنت کی طرف سے اُن کو کوئی عہدہ نہیں ملتا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ جب وہ عمدہ چال چلن اختیار نہیں کرتے تو حکومت خود اُن کو سزائیں دے کر صحیح راستے پر چلانا چاہتی ہے،

شذرۂ یازدہم

لڑکوں کے لئے مفید کتابیں اور ان کتابوں کا انتخاب

میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہمارے اساتذہ قدماء کی کتابوں کے جس قدر مداح ہیں اور گرویدہ ہیں، اُسی قدر ان کتابوں کے چھوڑنے کی ضرورت زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ان کتابوں کے انتخابات کو لازمی طور پر لڑکے سے یاد کرواتے ہیں، اور اُن کی

ضروری خوبیوں کی طرف اُس کی رہنمائی کرتے ہیں، اور اُن کی ہر چھوٹی بڑی چیز یہاں تک کہ علامات وصل وفصل کی طرف بھی جبراً اُس کو متوجہ کرتے ہیں، اور ان تمام کوششوں کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ عقل انسانی کے بہترین اعمال بھی اُس کے لئے ایک جبری بن جاتے ہیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ اگر معلم کی طرف سے کسی چیز کی حفاظت میں مبالغہ سے کام لیا جائے گا تو اس سے طالب العلم کے اندر کمزوری پیدا ہوگی، اور اگر وہ جس چیز کی تعلیم دیتا ہے اُس پر خود نہایت فریفتہ ہے، تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے متعلق طالب العلم کی حمیت نفس زائل زائل ہو جائے گی۔

بہر حال تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ لڑکے کی قوت ممیزہ کو ترقی دی جائے، اور مجھے اس میں شک ہے کہ اس طریقہ سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ میں یہ فرض کر لیتا ہوں کہ ایسے طلباء موجود ہیں جن میں اطاعت گزاری کا اس قدر مادہ موجود ہے کہ جس چیز پر اُن کی تعریف کر دی جاتی ہے اُس کو اچھا اور جس پر برائی کی جاتی ہے اُس کو برا سمجھنے لگتے ہیں لیکن با ایں ہمہ اُن کے ذوق کو دوسروں کے ذوق سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں کہہ سکتے، بلکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن کی قوت تمیز یہ فنا ہو گئی ہے، اس لئے وہ اپنے مستقبل میں صرف اُن لوگوں کی رایوں کو قبول کر لینا کافی سمجھتے ہیں جو عام طور پر قابل سند تسلیم کئے گئے ہیں، معاملات کے متعلق خود غور و فکر کر کے کوئی مستقل فیصلہ نہیں کر سکتے۔

انتخاب کتب میں میں اپنے لڑکے کو آزاد کر دوں گا، اور اُس کو صرف اُن ہی کتابوں سے اجتناب کرنے کی ہدایت کروں گا جو اخلاقی حیثیت سے مضر ہیں، کیونکہ میری خواہش یہ ہے کہ جو اخلاقی کتابیں اُس کو بہتر معلوم ہوں، اُن کے انتخاب کا حق بھی اُسی کو حاصل ہو، البتہ اگر اُس کا ذوق غلط راستہ اختیار کرے گا، تو میں اُس کو سیدھے راستہ پر لانے کی کوشش کروں گا، لیکن ڈانٹ ڈپٹ کر نہیں، بلکہ اُس کی عقل کو مختلف طریقوں سے نشوونما

دے کر اس مقصد کو حاصل کروں گا، اگرچہ اُس کی رہنمائی کرنے میں مجھ کو کوئی بخل نہیں ہے تاہم اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرے گا تو میں اُس سے صرف یہ کہوں گا کہ اپنے مطالعہ کی کتابوں میں اپنے خیالات کی نشو ونما اور اپنے ذاتی احساسات کی تربیت کا سراغ لگائے، البتہ میں بعض مخصوص کتابیں اُس کی خدمت میں پیش کروں گا، اور اگر میری طرح وہ بھی ان سے متاثر ہوا تو میں نہایت خوش ہوں گا، لیکن باایں ہمہ میں اُس سے اس کی خواہش کرنے میں حق بجانب نہ ہوں گا کیونکہ کسی چیز کے ساتھ فریفتگی اُسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب اُس کا ظہور خود فریفتہ ہونے والے کی طرف سے ہو، جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان انفرادی یا اجتماعی زندگی کے ہر دور میں حسن کا جو معیار کمال قرار دیتا ہے، اُس کا تعلق کبھی اُس کے بعض نفسانی حالات سے ہوتا ہے، اور کبھی اُس کے اعضار کے فوائد کے ساتھ اُس کو وابستگی ہوتی ہے، مثلاً ہم نے زمانہ شباب میں جو کتابیں پڑھی ہیں آج اُن کا اور اُن کے مصنفین کا نام بھی ہم کو یاد نہیں، اور جو شعرا، اور جو انشا پرداز اُس زمانے میں ہمارے اُستاد تھے، اب بڑھاپے میں اُن میں بہت کم ہمارے رفیق ہیں۔

شذرۂ دوازدہم

یونانی اور لیٹن لٹریچر پر تنقید

میں[1] اس وقت صرف یونانی اور لیٹن لٹریچر پر اپنی تنقید کو محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ ہمارے اساتذہ کی عام عادت یہ ہے کہ قدمار کے تمام آثار کو چھوڑ کر صرف اُن کے لٹریچر کی تعلیم دیتے ہیں، گویا اُن کے نزدیک لٹریچر کو ان آثار سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ ایک علیحدہ چیز ہے، لیکن یہ اُن کی غلطی ہے، اور میں اس سے پہلے اس غلطی کی غلطی کو

[1] ہمارے ہندوستان میں اگرچہ یونانی اور لیٹن زبان کی تعلیم نہیں ہوتی تاہم فارسی، عربی، انگریزی، اُردو غرض دنیا کی ہر زبان کے متعلق اس تنقید سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، اور ہمارے یہاں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، اُن پر بھی اسی قسم کی تنقیدی نظر ڈالی جا سکتی ہے۔

ثابت کر چکا ہوں۔

شعرائے قدیم میں میں نے ہومر کا نام لیا ہے، اور اس مناسبت سے میں یہ جا[نـ]ـنا چاہتا ہوں کہ ہمارے اساتذہ نے جس حیثیت سے ان کو طلبا رکے سامنے پیش کیا ہے اُس سے اُن کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ہومر کے دونوں دیوان یعنی الیڈ اور آڈیسی ایک نہایت قدیم شخص کے نتائج فکر کی یادگار ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اندر بڑی بڑی خوبیاں اور بڑی بڑی عبرتیں اور بصیرتیں مخفی ہیں، لیکن بااین ہمہ میں اخیل[1] کے کیریکٹر کو "امیل" کے لئے نمونہ و مثال بنانا ہرگز پسند نہیں کرتا، کیونکہ یہ بہادر (جس نے صرف اس بنا پر قومی مصالح کو نظر انداز کر کے قومی دشمنوں کے مقابلہ سے میدانِ جنگ میں کنارہ کشی کر لی، کہ وہ جس نازک اندام لڑکی پر فریفتہ تھا، اُس کی قوم اُس کے تعلق کو جائز نہیں رکھتی تھی) معبودانِ یونان کی رضامندی اور خوشنودی کا حقیقی مستحق نہ تھا، یہ معبود اگرچہ اُس کی بہادری کی وجہ سے دشمنوں کے مقابل میں اُس کی اعانت کرتے تھے، تاہم اُنھوں نے اس جنگ کے انجام کو ایک بدترین عبرت انگیز واقعہ بنا دیا، یعنی ہکٹر پر اُس نے جو فتح حاصل کی وہ ایک ایسی فتح تھی جو ایک خفیف الحرکات قومی آدمی کو وطنیت صحیحہ کے مقابل میں حاصل ہوئی۔

ہمارے قدماء کی جہالت صرف یہیں تک محدود نہیں ہے کہ اُنھوں نے بعض ایسے اصول کو چھوڑ دیا ہے جو آج احساس انسانی کا سنگ بنیاد قرار دئے جاتے ہیں، بلکہ اُنھوں نے اپنی میراث میں اباطیل، اکاذیب، اور مذاہب فاسدہ کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ اگر کامل احتراز و اجتناب سے کام نہ لیا جاتا تو اُن کی کتابوں کی تعلیم اُن کو باقی و قائم رکھتی، ان ہی آثار قدیمہ کی ساحرانہ طاقت نے کئی صدیوں تک قومی مظالم کی حمایت کی ہے، اور عقلی حملے سے اُن کو محفوظ رکھا ہے، آج ہم میں جو لوگ مطالعہ کے شیدائی ہیں، وہ اکثر اوقات اُن بدترین عادتوں سے بہت کم متاثر ہوتے ہیں جو قدماء کی یادگار کے

---

[1] ایک یونانی بہادر جو الیڈ کا ہیرو ہے۔

طور پر عام لوگوں میں شائع و ذائع ہیں۔

یونانی تمدن اگرچہ بہت سی دل فریب خوبیوں کا مجموعہ تھا، تاہم چونکہ اُس میں متعدد برائیاں بھی پائی جاتی ہیں اس لئے اُس کے ساتھ بہت زیادہ دلاویزی بھی ظاہر کرنی نہیں چاہیئے، اس تمدنی دور میں غلاموں کا طبقہ سب سے زیادہ ذلیل کیا گیا، اور مظلوم اور مصیبت زدہ لوگوں کے حقوق فراموش کر دیئے گئے، لیکن ضمیر انسانی کی دو تین آوازوں کے سوا کسی نے اُن کی حمایت میں لب تک نہیں ہلایا، اس تمدن میں کتنی قومیں اور کتنی نسلیں تباہ ہوگئیں، لیکن کسی نے مصیبت زدہ لوگوں کی تکلیفوں کو کم کرنا نہیں چاہا، مزدوری پیشہ لوگوں کو کسی قسم کا کوئی حق حاصل نہ تھا، بلکہ وہ صرف طپانچہ مارنے والوں کے ہاتھ کا ایک کھلونا تھی، یہ سچ ہے کہ اس تمدن کی ظاہری صورت نہایت دل فریب تھی، شاعری، فنون لطیفہ اور بہادروں کے سامنے مسکرانے والے معبودوں نے یونانی قوم کو ہر قسم کے فضائل و مناقب کا مجموعہ بنا دیا تھا، لیکن بااین ہمہ حُسن و جمال ظاہری صورت و شکل کا اعتبار نہیں کیا جاتا، صرف نتائج و انجام قابل لحاظ ہوتے ہیں۔

یونانی تاریخ کے مقابل میں رومن تاریخ اور بھی کم درجہ کی چیز ہے، جس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ روما نے بڑے بڑے لوگوں کو پیدا نہیں کیا، بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ طاقت کی پرستار تھی، اور اُس کا خمیازہ بھی اُس نے بھگت لیا، چنانچہ بہت سی قوموں کو غلام بنا کر اخیر میں وہ خود اپنی غلام ہوگئی۔

میں جب امیل کو یونانی اور لیٹن زبان کی تعلیم دوں گا، تو اگرچہ اس کا مقصد صرف اُس کی عقل کو نشو و نما دینا ہوگا، تاہم میں ایک اور مقصد کو بھی پیش نظر رکھوں گا، یعنی اُس میں یہ استعداد پیدا کراؤں گا کہ دنیا میں رہ کر کیوں کر زندگی بسر کرنا چاہیئے، کیونکہ اس لٹریچر میں بہادری، شجاعت، خلوص اور حب الوطنی کی جو مثالیں ہیں وہ لڑکوں کے لئے اسپیکروں کی تقریروں اور حکما کی نصیحتوں سے زیادہ مؤثر ہیں۔

جس لڑکے کو کوئی چیز دل فریب نہیں معلوم ہوتی وہ دنیا میں کامیاب نہیں ہوسکتا، البتہ جو لڑکا دوسروں کی عظمت وشان سے متاثر ہوتا ہے، اُس کے نفس میں بے شبہہ اسرار الٰہی کا ایک خزانہ محفوظ ہے۔

قدماء کی خوبیوں پر چونکہ قوت دلیری، اور شجاعت کا ملمع چڑھا ہوا ہے، اس لئے وہ موجودہ دور کے لوگوں کے محاسن سے زیادہ دل فریب معلوم ہوتی ہیں، یونان اور روما کے کارنامے بھی چونکہ قدیم زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ہمارے نزدیک استحقاق سے زیادہ اُن کی قیمت قرار پائی لیکن باایں ہمہ وہ طلباء کو اپنی عزت کرنے پر مجبور کرتے ہیں، اور اسی بناء پر میں کہتا ہوں کہ خیالات وافکار کی ترقی اور محاسن اخلاق کی نشوونما میں قدماء کے اثر کا بہت بڑا حصہ شامل ہے، لیکن باایں ہمہ میں اس سے بھی اچھی طرح واقف ہوں کہ قدماء کی یہ تمام یادگاریں اول سے آخر تک دل فریب ہی دل فریب نہیں ہیں، مثلاً سیسون جس نے قرطاجہ کو تباہ کر دیا، کوئی ایسا لیڈر نہیں ہے، جس کی کیرکٹر کی طرف میں امیل کو توجہ دلاؤں، بلکہ میں پوری کوشش کے ساتھ اُس کو یہ سمجھاؤں گا کہ جس شکست کی بنیاد حق پر قائم ہوتی ہے، وہ اُس فتح سے زیادہ قابل عزت ہے جو صرف چمکنے والی تلواروں کے بل پر حاصل کی گئی ہے،

میں اُس سے کہوں گا کہ جس دن روما نے قرطاجہ پر فتح پائی تم نے اُس کو دیکھا ہے؟ وہ، وہ دن ہے جس میں رجولوجن نے اپنے عہد کو پورا کر دیا اور تنہا افریقہ کو چلا گیا، اُس کی بی بی، اُس کے بچے، اُس کے بھائی، اور اُس کے دوستوں نے اگرچہ نہایت اصرار کے ساتھ اُس کو روکا مگر وہ نہ رُکا، حالانکہ وہ یہ جانتا تھا کہ وہ موت کے مُنہ میں جا رہا ہے، اسی دن یہ ظاہر ہو گیا کہ روما نے قرطاجہ پر صرف صداقت اور وفائے عہد کی بنا پر فتح پائی اُن کے علاوہ فتح کے اور اسباب محض وقتی تھے، اور قرطاجہ کی قسمت میں شکست لکھی ہوئی تھی۔

اس میں شبہہ نہیں کہ جمہوریت روما کے زمانہ شباب میں جن شریفانہ اخلاق اور شریفانہ

خصائل کا اظہار ہوتا تھا وہ اُس کے دورِ تنزل میں باقی نہیں رہے اور اس کا سبب صرف جمہوری فضائل کا وہ افسوسناک خاتمہ تھا جس نے استبداد اور شخصیت کو کامیاب اور دیرپا بنایا، آزادی اور حرّیت پر جو مادی مصیبتیں آتی رہتی ہیں میں اُن سے بالکل نہیں ڈرتا صرف اُس ساعتِ بد سے لرزتا ہوں جس میں قوم کے ضمیر میں کمینہ پن، اور نیتوں میں سخت دنائت پیدا ہو جائے ظلم وعدوان کی اصلی کمین گاہ خود ہمارا نفس ہے، اس لئے ہم کو ظالم بادشاہوں سے پہلے خود اپنے نفس ہی کے ساتھ جہاد کرنا چاہئے، بروتوس نے اگر قیصر روم کے پیٹ کو چاک کر دیا تو یہ اُس کی کوئی بڑی کامیابی نہیں تھی، کیونکہ خود روما کا دل اسی مرضِ قیصری میں مبتلا تھا، اگر یہ شخص کسی کے سر سے سلطنت کا تاج اُتار لینا چاہتا تھا تو اُس کا سب سے ضروری فرض یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے خود اپنے دل سے شاہانہ کبر وغرور کو نکال ڈالے، اس کے بعد اپنے ہمسروں کے دل کو اُن تمام رذائلِ اخلاق سے پاک کر دے، جن کی بے اعتدالیوں کی روک تھام کی سخت ضرورت ہے، اگر اُس میں اتنی کسر نہ ہوتی تو جو دلیرانہ کام اُس نے کیا وہ تاریخ کے صفحات میں روشن حروف میں لکھا جاتا، لیکن وہ قوم کو انحطاط و تنزل کے غار سے اوپر نہ اُچھال سکا۔

جمہوریت روما کے آخری دور میں چند واقعات مثلاً وحشیانہ نظام فوج، خونریزی وسفاکی، مختلف قسم کی سزائیں، مبتذل خواہشیں اور ضمیر فروشی وغیرہ ایسے پیش آئے، جس نے اُس کے خوبصورت چہرے کو نہایت بدنما کر دیا، لیکن بایں ہمہ مختلف اطراف میں مصیبت زدہ اور تنزّل پذیر لوگ ہمیشہ اخلاقِ فاضلہ کا اظہار کرتے رہے، اور وہ اس طرح نمایاں طور پر نظر آتے رہے جس طرح بلند چٹان پانی کی سطح سے اوپر نمایاں نظر آتی ہے، اگر قوم میں خوددار اور غیور لوگ موجود ہوں، اور وہ آزادی کی فاتحانہ مدافعت کا یقین رکھیں، تو آزادی کا بول بالا ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ لوگ اس راہ میں جہاد کرتے ہیں، اگرچہ کبھی کبھی شکست بھی کھا جاتے ہیں لیکن جب انسانی عقل تھک کر خاموشی کے ساتھ حکومت استبدادی کے دامن میں پناہ

ڈھونڈھنے لگتی ہے تو امن کی ترقی کے ساتھ ساتھ خود یہ حکومت اپنی رعایا کے لئے نرم ہوتی جاتی ہے، اور یہ ایک ایسا وقت ہوتا ہے جس میں امید کی زندگی کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے، اس لحاظ سے کسی قوم کے لئے سب سے زیادہ خطرناک پولیٹکل نظام وہ حکومت استبدادی ہی جس میں تشدد کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، اور روما میں اگسٹس کی حکومت کا زمانہ اسی قسم کا زمانہ تھا۔

اس دورِ حکومت میں رومن قوم کا غرور مختلف قسم کے غروروں سے پرورش پاتا رہا، مثلاً وہ اپنے آپ کو صرف بہترین قوم ہی نہیں سمجھتی تھی، بلکہ قوموں کی حکمراں خیال کرتی تھی، اُس کا جھنڈا ہمیشہ سربلند رہتا تھا، وہ وحشی قوموں کے مقابلہ میں ہمیشہ فتوحات حاصل کرتی تھی، وہ فنونِ لطیفہ، اور آثارِ عظیمہ کی مالک تھی، وغیرہ وغیرہ، لیکن افسوس ہے کہ فوجی نظام، اور قلعوں اور عبادت گاہوں کی تعمیر، کسی قوم کے زوال و انحطاط کو نہیں روک سکتی، روما کے مٹ جانے کے بعد بھی مشتری کا ہیکل روما میں قائم رہا۔

اخیر میں میں اس دورِ حکومت کے شعراء کے متعلق بھی ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ ہمارے اساتذہ کی نگاہ میں ان تمام شعراء میں ورجل اور ہوراس سب سے زیادہ ممتاز ہیں، اور طلباء کے ہاتھ میں وہ زیادہ تر ان ہی کے مجموعۂ اشعار کو جن کا بیشتر حصہ غوث نفس کے جذبات سے خالی ہے دیکھنا چاہتے ہیں، جن لوگوں نے ورجل کے اُس قصیدہ کو پڑھا ہی، جس میں اُس نے (غنی[1]) کی مدح کی ہے، اُس کو صاف نظر آتا ہے کہ اُس نے اُس کو ایک ایسے انسان کی صورت میں نمایاں کیا ہے، جس میں عنایت الٰہی جلوہ گر ہے، تمام قوم تنہا اُس کی ذات کے اندر نظر آتی ہے، وہ اپنی قوم کا نجات دہندہ ہے، اپنی نسل کا بانی اور موجد ہے، اس قصیدہ میں اس قسم کے اور بھی مضامین ہیں، جن میں اُس دور کی تمام شاہانہ خصوصیات و علامات نظر آتی ہیں۔ اس وقت اس سے بحث نہیں کہ فن شاعری کے لحاظ سے

---

[1] غنی طرواجی کا امیر ہے، اور ورجل نے اُس کو نسل رومانی کا بانی قرار دیا ہے۔

یہ قصیدہ برا ہے یا بھلا، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ اُس دور کی عقلی حالت کا آئینہ ہے، جس سے اُس اثر کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس حکومت نے بہترین اشخاص کے قلوب پر ڈالا تھا۔

بہتر سے بہتر شعر بھی نفس انسانی کی دنائت کو نہیں چھپا سکتے، لیٹن شعراء اپنے ذاتی اغراض کے لئے اگسٹس کی جو خوشامدانہ مبالغہ آمیز مداحی کرتے تھے، اُس کے لحاظ سے وہ اپنے اخلاف کے لئے بدترین مثال تھے، اُنھوں نے اس طرح غیر معلوم طریقہ پر خوشامد پیشہ انشا پردازوں اور شاعروں کے لئے ایک خاص مشغلہ پیدا کر دیا، جن کے پیش رو صرف ورجل اور ہوراس تھے۔

اب میں اپنے گزشتہ بیانات کا ملخص بیان کر دینا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ قدماء کی علمی یادگاروں کی تعلیم مختلف حالتوں میں مختلف نتائج پیدا کرتی ہے، اگر اُن کو بلا نقد و بحث اور بلا قید و تمیز بزرگ ترین ہستی تسلیم کر لیا جائے، تو اُس کا نتیجہ وہی ہوگا جو بت پرستی کا ہوتا ہے، یعنی اُن کے مقابل میں خود ہم کو ہمارا نفس پست اور ذلیل و حقیر نظر آئے گا، کیونکہ قدماء کے اشعار قدماء کے واقعات، اور قدماء کی تصنیفات کا جو جابرانہ اثر لوگوں کے قلوب پر ہے، وہ طلباء کے لئے ظالم اور مستبد بادشاہوں کے ظلم و جور سے کچھ کم خطرناک نہیں۔

اگرچہ قدماء کی طرح ہم پر بھی تنزل و انحطاط کا دور آسکتا ہے، اور اگرچہ ہم میں بھی بہت سی کمزوریاں اور بہت سے عیوب موجود ہیں تاہم ہماری حالت قدماء سے بہت بہتر ہے، کیونکہ ہم جہاں سے گرے ہیں وہاں تک اُبھر کر پہونچ سکتے ہیں، اور ہم کو بلند حوصلگی کے لحاظ سے بھی اُن پر فضیلت حاصل ہے، اس لحاظ سے اگرچہ ہم عالم وجود میں اُن کے بعد آئے، لیکن ہم نے اپنے آپ کو شرطیہ طور پر اُن سے بہتر بنا لیا، کیونکہ فرض کا احساس زمانہ کے

لہ ورجل اور ہوراس کے مقابل میں عربی، فارسی، اور اُردو کے ہزاروں شعراء کا نام لیا جا سکتا ہے، جو اس حیثیت سے ہمارے لیے بدترین مثال تھے۔

ساتھ ساتھ ترقی کرتا جاتا ہے ، آج لوگوں کے دل پر موجودہ دورِ تمدن کا جو اثر ہے اُس سے کون انکار کر سکتا ہے ؛ میں یہ نہیں کہتا کہ اس تمدن نے ہم کو قدما سے زیادہ خوش اخلاق ، زیادہ دلیر ، زیادہ وسیع العلم ، اور زیادہ طالب خیر بنا دیا ہے ، بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ ہم میں عدل و انصاف ، اور حقوق غیر کے احترام کا ملکہ نہایت راسخ ہو گیا ہے اس لئے ہم اُن سے بہت زیادہ اُن لوگوں کا لحاظ کرتے ہیں جو ہم سے قومیت میں ، ملک میں اور چمڑے کے رنگ میں مختلف ہیں[1] ، پس ہم بہ حیثیت انسان ہونے کے انسانی ضروریات سے بہ نسبت یونان اور روما کے بہت کم دور ہیں ۔

شذرۂ سیزدہم

سفر تربیت کا ایک رُکن ہے

بچپن میں انسان کے دل و دماغ پر مؤثرات نفسانی کا نہایت گہرا اثر پڑتا ہے ، شکسپیر کو شاعری میں جو درجۂ کمال حاصل ہوا اُس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ ایک ایسے مقام میں پیدا ہوا تھا جو مناظر طبعی کا بہترین مجموعہ تھا ، چنانچہ ایک مذاقیہ قصے میں اُس نے اپنے بچپن کی سیرگاہ کا نہایت عمدہ منظر دکھایا ہے ، اور نہایت مختصر الفاظ میں اُس کے تمام مقامات کو نمایاں کیا ہے ، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے مولد و منشا سے نکل کر کبھی اپنے ابتدائی زمانے کے ماحول کو بھول نہ سکا بلکہ وہ اُس کے بطونِ دماغ میں محفوظ رہا ۔

گولڈ اسمتھ اگرچہ لندن جیسے پرشور شہر میں قیام رکھتا تھا ، تاہم اس شور و غل میں وہ اپنے وطن کی خصوصیات کو فراموش نہ کر سکا ، وہاں کی نہر ، وہاں کی پن چکی ، وہاں کا اور وہاں کی اور متعدد چیزیں اُس کو یاد رہیں ، اور ایک قصے میں اُس نے اِن سب

[1] لیکن دنیا کی موجودہ شورش اس سے انکار کرتی ہے ۔

مدحت طرازی کی، واشنگٹن جس کی ظریفانہ انشا پردازی نے تمام دنیا کو فریفتہ کر لیا ہے، دریائے آٹسن کے کنارے پیدا ہونے پر خدا کا شکر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ "میری مختلف العناصر طبیعت نے جو نیکی اور جو تہذیب حاصل کی ہے اُس کا اصلی منشا اسی نہر کی وہ محبت ہے جو مجھے بچپن میں اُس کے ساتھ تھی، بچپن کی بے اعتدالیوں میں میں اُس کی طرف بعض روحانی خصوصیات کو منسوب کرتا تھا، اور میرا یہ عقیدہ تھا کہ اس نہر کی روح کے ساتھ یہ تمام خصوصیات تعلق رکھتے ہیں، اس نہر کی فطرت میں جو حرّیت، جو شجاعت، جو صداقت اور جو استقامت پائی جاتی ہے وہ میرے لئے نہایت دل فریب ہے، وہ اُن نہروں میں نہیں ہے جس کی سطح پر خداعانہ مسکراہٹ پائی جاتی ہے، اور خطرناک گھاٹیوں اور چٹانوں کے ذریعہ سے وہ اپنی منافقانہ بدنیتی کا اظہار نہیں کرتی، بلکہ وہ ایک مسرت انگیز آبی راستہ ہے، جو گہرائی کے ساتھ وسعت بھی رکھتا ہے، جو کشتیاں اُس کی موجوں کے حوالے کی جاتی ہیں، اُن کو وہ نہایت خلوص قلب، اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہے، اور مجھ کو اُس کی متانت آمیز روانی میں ایک شریفانہ شان اور غرور نظر آتا ہے"۔

میں نے ان شعراء کا ذکر صرف اس لئے کیا ہے کہ ہم کو صرف اُن ہی کی زندگی کے نفسانی حالات معلوم ہوئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ انسان کے ماحول انسان کے گرد و پیش، اور امور خارجیہ کا اثر سب پر یکساں نہیں پڑتا، بلکہ اثر، اور اثر کے ساتھ درجۂ تاثر میں بھی اختلاف ہوتا ہے، اور اسی کے ساتھ انسان جو کچھ بچپن میں دیکھتا ہے، اُس کا اثر بڑھاپے تک اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتا بلکہ اُس کی روح کا ایک جزو بن جاتا ہے، اور ابتدائی سن بلوغ میں انسان کے آس پاس جو چیزیں رہتی ہیں، اُن کا اثر اُس کی جسمانی ساخت اور خیالات کی رفتار تک سے ظاہر ہوتا ہے۔

انسان کے تمام ماحول اور انسان کے تمام محسوسات اُس کی صحت عقل کی حفاظت

کے لئے موزوں و مناسب نہیں ہوتے، چنانچہ ملٹن جب کیمبرج میں تعلیم حاصل کرتا تھا تو نہایت دردانگیز طریقہ پر اس بات کا شاکی تھا کہ اس مقام میں گھنے سائے نہیں پائے جاتے جن کی آڑ میں شعر کے دیوتا پناہ لیتے ہیں، رابرٹ ہل جس نے ملٹن سے ڈیڑھ صدی کے بعد اسی یونیورسٹی میں تعلیم پائی، اپنے جنون کے پہلے دورے کو اسی چٹیل زمین کی طرف منسوب کرتا تھا، جو ٹیلوں اور پہاڑوں کی سرسبز چوٹیوں سے یکسر خالی تھی۔

انسان پر مناظر طبعی کی عدم موجودگی کا جو اثر پڑتا ہے، اگرچہ اُس کا درجہ تاثر مختلف ہوتا ہے، تاہم کم وبیش ہر شخص دیہاتی مناظر کے نقائص و عیوب کو محسوس کرتا ہے، اور جب یہ عام حالت ہے تو بچوں کے دل و دماغ پر اُس کا اثر کس قدر بُرا پڑے گا؟ ایک بالغ انسان کو جو نفسانی اور خیالی قوت حاصل ہے، وہ ان مناظر کے اثر سے اُس کو بے نیاز کر سکتی ہے، اور اس کے دل پر محبت کی بعض شعاعیں پڑ کر اُس کی زندگی کے اکثر اوقات میں اُس کے لئے کافی ہو سکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کے دل میں ایک ایسا قوی ترین احساس پیدا ہو جائے، یا اُس کے دل و دماغ میں بعض معانی ایسے مرتکز ہو جائیں جو ان مبتذل اور بے قیمت مناظر کی دل فریبیوں کو بھلا کر اُس کو عالمِ خیال کے بلند کنگروں تک پہونچا دیں، لیکن ایک دوازدہ سالہ یا سیزدہ سالہ بچے کی حالت اس سے مختلف ہے، کیونکہ اس سن میں وہ صرف ماحول سے متاثر ہو سکتا ہے، خود اُن پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا، اس لئے اُس کے حقیقی فوائد اسی میں ہیں کہ اُس کی ولادت یا اُس کی تربیت ایسے مقام میں کی جائے جس کے آس پاس مختلف قسم کے مناظر طبعی، مثلاً نہر، جھیل پہاڑ اور جنگل وغیرہ موجود ہوں۔

دیہات کا منظر اگرچہ نہایت شاندار ہوتا ہے، تاہم اُس کی حالت ہمیشہ یکساں ہی رہتی ہے اُس میں تعدد، تجدد اور تغیر نہیں ہوتا، اس لئے جولڑکا صرف فطرت کے ایک ہی صفحے کا مطالعہ کرتا ہے، اور اُس کو صرف چٹان ہی چٹان اور سمندر ہی سمندر نظر آتا ہے، اُس کی

مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے صرف ایک ہی کتاب پڑھی ہے۔

انسان کی تربیت بالخصوص بچپن کی تربیت کے لئے مؤثرات کا تنوع اور اُن کی بوقلمونی ایک لازمی چیز ہے، کیونکہ ان کے متنوع اثر کے نتائج بھی متنوع ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے ہر فرد کو بعض قسم کے مناظر سے دلچسپی ہوتی ہے، اور دوسری قسم کے مناظر سے اُس کو شغف نہیں ہوتا، لیکن جن مناظر سے اُس کو دلبستگی ہوتی ہے وہ گویا اُس کا ایک طبعی خاصہ بن جاتے ہیں، جس کا فلسفہ یہ ہے کہ عالم فطرت میں جتنی خوبیاں پائی جاتی ہیں، اُن کے مقابل میں خود انسان کے اندر بھی اُتنی ہی فطری مناسبتیں موجود ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس فطری مناسبت کی بنا پر انسان جن مناظر کو پسند کرتا ہے، وہ خود بخود اُس کی نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی اُن کے لئے تلاش وجستجو کی بھی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً یہ ممکن ہے کہ ایک انسان جو کوہستانی مناظر کو محبوب رکھتا ہے بدقسمتی سے اُس کی ولادت یا تربیت ریگستانی مقام میں کی جائے، چنانچہ اسی نکتے کو ایک انشا پرداز ان الفاظ میں بیان کرتا ہے، "وہ ایک عرب ہے جو نارمنڈی[۱] کے سیب کے درختوں کے سائے میں پیدا ہوا ہے"۔

اب ایمل اس سن کو پہونچ گیا ہے جس میں بچے کو اپنے ماحول کے ساتھ میل جول پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن مربیان اطفال نے اس ضرورت کے پورا کرنے کا یہ خداعانہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اُن کو سیر وسیاحت کے متعلق قصص وحکایات سناتے ہیں جن سے درحقیقت بچوں کو نہایت دلچسپی ہوتی ہے، لیکن باایں ہمہ اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کسی ملک کی حالت کتنی ہی پرزور عبارت میں بیان کی جائے، لیکن اُس کا وہ اثر نہیں پڑسکتا جو خود مشاہدے کا پڑتا ہے، اس لئے یہ حالات خود مشاہدہ ومعائنہ سے بے نیاز نہیں کر سکتے، چنانچہ جو ملک سمندر کے گرد آباد ہیں، وہاں کے بچوں کے دل میں تیرھویں

---

[۱] فرانس کا ایک صوبہ۔

یا چودھویں سال کشتی رانی کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ بہادر قوم کے بعض بچوں میں مرض کی حد تک پہونچ جاتا ہے، اس لئے وہ اپنے گھروں سے جب نکلتے ہیں تو دوبارہ واپس نہیں آتے، لیکن دوسرے ملکوں کے لوگوں میں اکثر سفر کا شوق وقتی ضروریات کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، اس لئے وہ چند سال کے بعد اپنے وطن میں واپس آ کر مستقل طور پر زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔

یہ ایک نہایت عجیب بات ہے کہ مربیان اطفال نے اب تک سفر کے منافع وفوائد سے بحث نہیں کی، کہا جاتا ہے کہ چونکہ سفر کے لئے ایک طویل زمانے کی ضرورت ہے، اس لئے اس کو تعلیم وتربیت کا ضروری جزو نہیں بنایا گیا، لیکن کرۂ ارضی کی شکل کے سمجھانے کے لئے جتنی مدت درکار ہوتی ہے، امریکہ کے سفر میں اس سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا، اس کے ساتھ سفر میں مشاہدہ اشیاء سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہ جغرافیہ کی کتابی یا زبانی تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتے، مصارف کی کثرت بھی مربیان اطفال کو سفر سے روکتی ہے، لیکن سفر کے متعدد طریقے ایسے بھی ہیں، جن میں بہت زیادہ صرف کی ضرورت نہیں ہوتی، سیر وسیاحت کے متعلق اصلی رکاوٹ جو پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ باپ ماں اُس کو اپنے بچوں کے لئے ایک خطرناک چیز سمجھتے ہیں کیونکہ بچے کو تنِ تنہا، سمندر کی موجوں میں ڈال دینا ایک ایسا کام ہے جس سے ماں باپ کا دل لرز اُٹھتا ہے، اور اُن کے اعصاب کانپنے لگتے ہیں، ماں باپ کے یہ جذبات بے شبہ عزت واحترام کے مستحق ہیں، لیکن اُن کو سمجھانا چاہیئے کہ چند روزہ مفارقت سے رحمی تعلقات منقطع نہیں ہو جاتے، اور جس قدر دوری ہوتی ہے، اُسی قدر محبت کی کشش شریف دلوں کو باہم جوڑ دیتی ہے اس کے ساتھ ماں باپ کو بچوں کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ اُس کا اصلی مقصد خود بچوں کے مصالح کا لحاظ اور اُن کی تکمیل ہے، لیکن اگر ان مصالح کو نظر انداز کر کے بچوں کو صرف گود میں روک رکھا جائے تو یہ فعل خود غرضی کے مشابہ ہوگا۔

اس کے علاوہ اس زمانہ میں اسٹیم اور بخار کی قوت نے دور دراز مسافتوں کو اس قدر قریب کر دیا ہے کہ نوجوان انگریزوں کے نزدیک سفر ایک تفریحی چیز بن گیا ہے، نوع انسانی نے اپنے پر و بال ترقی کی فضا میں کھول دئیے ہیں، اور موجودہ نسل دنیا کے دیکھنے کی جو ضرورت اور خواہش رکھتی ہے، اُس کو کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

تمام آزاد قومیں سیّاح بن گئی ہیں، جن کی راہ میں مسافتوں کا بُعد، ملکوں کا اختلاف اور مادی مشکلات حائل نہیں ہو سکتیں۔

مختلف ممالک میں نوع انسانی کو جن اصول کے مطابق تقسیم کر دیا گیا ہے اُن میں بعض فطری بعض تاریخی، اور زیادہ تر سیاسی ہیں، اس بنا پر حکام کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ان کی رعایا کی موت و حیات اُسی سرزمین میں ہو جس پر وہ حکومت کر رہے ہیں، چونکہ یہ ملکی مصالح کے لئے ایک مفید چیز ہے، اس لئے وہ اس کو رعایا پر اپنا حق سمجھتے ہیں، اور اُنھوں نے رعایا کو اس کے فوائد کامیابی کے ساتھ سمجھا دئیے ہیں، مربیان اطفال، شعرائے ذی شعور، اور پیشوایانِ مذہبی نے ایک طویل زمانے کی کوششوں کے بعد لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی کا ایک عام جذبہ پیدا کر دیا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک نہایت شریفانہ جذبہ ہے، اور اسی کی بدولت انسانی جماعتوں کی تنظیم و ترتیب ہوئی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس جذبہ کے غلط استعمال سے کم زور لوگوں کو طاقت ور ظالموں کا غلام بھی بنا کر رکھا جا سکتا ہے، چونکہ ابتدا میں تمام انسانی جماعتوں کو ایک محدود قطعہ زمین میں سمٹ کر رہنا پڑا، اس لئے وہ بچپن ہی سے اُن مقامات میں زندگی بسر کرنے کی خوگر ہو گئیں جہاں اُن کے ذریعۂ معاش کا سامان ہو سکتا ہے، اور یہ عادت اس قدر راسخ ہو گئی کہ اس کو انسانی فضائل میں شمار کیا جانے لگا، لیکن میں اس کو ایک عیب سمجھتا ہوں، اور اُس کی غیر ضروری عزت نہیں کرتا، ایک کاشتکار جو اپنے وطن میں رہ کر کاشتکاری کرتا ہے، ایک متمدن آدمی کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اور خود ایک متمدن بھی تمام دنیا کے ساتھ اپنے تعلقات کو وسیع

کرکے زیادہ ترقی حاصل کرسکتا ہے۔

جو قومیں صرف اپنے وطن پر بار ہو کر رہ جاتی ہیں اور دوسری قوموں کی زبانوں سے نا آشنا رہتی ہیں، وہ بے شبہ بڑے بڑے نمایاں کام کرسکتی ہیں، لیکن اُن کو دوسری قوموں سے زیادہ سیاسی تیروں کا نشانہ بننا پڑتا ہے، کیونکہ قوانین کے تعطل، افراد کے حقوق کی پامالی، اور آزادی کی بیخ کنی سے وہ متاثر نہیں ہوتیں، اور مردوں کی طرح ایک محدود جائے پناہ میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں اس بنا پر وہ جلاوطنی کو تمام قومی مصائب کے مقابل میں سخت خطرناک مصیبت خیال کرتی ہیں، اور کسی ضرورت یا زمانۂ شورش کے ظلم و استبداد کی بنا پر اگر اُن کا کوئی لیڈر جلاوطن کردیا جاتا ہے، تو وہ اُس کو ایک درد انگیز آزمائش سمجھتی ہیں، اور ان کے وطن سے باہر کی دنیا اُن کو ایک چٹیل میدان کی صورت میں نظر آتی ہے جس میں اُن کا کوئی رہنما نہیں ہوتا، صرف ایک وحشت اُن کی غم گسار ہوتی ہے، اُن کو دوسرا مونس و غمخوار نہیں ملتا۔

لیکن جو قومیں بچپن ہی سے سفر کی خوگر ہوتی ہیں، دوسری قوموں کی زبان سے نا آشنا نہیں ہوتیں، مختلف قسم کے تمدّن و تہذیب کا مطالعہ کرتی ہیں، اُن تک زمانے کی مصیبتوں کا گزر نہیں ہوسکتا، اور قانون کی سخت گیری اور جلاوطنی سے وہ مرعوب نہیں ہوتیں، بلکہ فلپ ثانی[1] سے بھی زیادہ صداقت کے ساتھ کہہ سکتی ہیں کہ "سورج ہماری حدودِ حکومت میں نہیں ڈوب سکتا"۔

کہا جاتا ہے کہ سفر کی عادت بچوں کے جذبۂ وطنیت کو ضعیف کردیتی ہے، میں اگرچہ وطنیت کے عام اور وسیع معنی کو پسند نہیں کرتا، اور اُس شخص کو نہایت بدقسمت سمجھتا ہوں جو کل دنیا کو اپنا وطن خیال کرتا ہے، کیونکہ میرے نزدیک انسان اُسی وقت انسان ہوسکتا ہے جب وہ خاندان انسانی کی ایک محدود جماعت کی طرف منسوب ہو، اور اُس کی ایک مخصوص قومیت

---

[1] مقدونیہ کا ایک قدیم بادشاہ جس نے بہت سی فتوحات حاصل کی تھیں۔

اور مخصوص زبان قرار دی جائے، باایں ہمہ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اگر حب الوطنی کو مادی بت پرستانہ تعلقات سے آزاد کر لیا جائے تو اُس کے مفہوم کی بہت سی خوبیاں برباد ہو جائیں گی، وطن اُس پہاڑ، اُس ریگستان یا اُس تالاب کا نام نہیں ہے جن کے درمیان انسان اتفاقاً پیدا ہو جاتا ہے، وطن اینٹوں اور پتھروں کے مجموعے کا بھی نام نہیں ہے اور گھر کی چار دیواری کو بھی وطن نہیں کہہ سکتے، بلکہ وطن ایک ذہنی مفہوم کا نام ہے، قومی تاریخ کا نام ہے، اسلاف کی یادگاروں کا نام ہے، بلکہ وہ ایک وجودِ کلّی کا نام ہے، جس کی جزئیات کا احساس اُس میں رہنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، اور اگر وطن کی یہ حقیقت انسان کے دل پر کالنقش فی الحجر ہو جائے تو بحری و برّی سفر کی بادیہ پیمائیاں اُس کو مٹا نہیں سکتیں۔

لڑکے کا زمانہ بلوغ جب قریب آتا ہے تو اُس وقت اُس میں اثر پذیری کا جذبہ قوی ہو جاتا ہے، اس لئے اس سن میں اُس کے صفحۂ قلب پر عالمِ خارجی کی صورت کا نہایت گہرا نقش قائم ہو سکتا ہے، اسی کو اس وقت علوم صحیحہ سے اس قدر واقفیت حاصل ہو گئی ہی کہ وہ اس مادی کائنات سے بہت کچھ سبق حاصل کر سکتا ہے، ایک ایسے لڑکے کو جس نے کچھ نہیں دیکھا ہے، زبان کی تعلیم دینا بالکل ایسا ہی ہے، جیسا کہ ایک تیرۂ و تاریک غار میں پھولوں کی کلیوں کا بکھیر دینا۔

شذرۂ چہاردہم

تربیت بحری سفر کے ذریعہ سے

میں نے آج سے چھ ہفتے بیشتر انگریزی اخبارات میں یہ اعلان پڑھا تھا کہ ایک جہاز جس کا نام مانیسٹر ہے، چند روز میں بیروت کی طرف روانہ ہوگا، اس لئے لندن پہونچنے کے ساتھ ہی

میں نے اُس کا حال دریافت کیا اور بندرگاہ میں اُس کے کپتان سے ملا، میں نے گزشتہ زمانے میں اُس کے ساتھ سفر کیا تھا، اور ہم دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، چنانچہ جب اُس کو اُس دوستی کا حال معلوم ہوا تو اُس نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ میری طرف توجہ کی، اور اُس تعارف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں میں یہ قرار پا گیا کہ میں جہاز کا ڈاکٹر بن کے چلوں گا، اور "امیل" دوران سفر میں میرا بحری شاگرد رہے گا، چنانچہ اوس کی والدہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اول اول بہت گھبرائی، لیکن میں نے اس سفر کے مقاصد بیان کر کے اُس کی تسکین کر دی، اب امیل کی عمر ۱۳ سال سے زیادہ کی ہوئی اور وہ طویل القامت، قوی الاعضاء اور صحیح البدن نظر آتا ہے، چونکہ ہمارا اور ہیلانہ دونوں کا کبھی یہ مقصد نہ تھا کہ وہ ایک ایسا عالم بن جائے جس کی زندگی صرف اُس کے دماغ تک محدود رہتی ہے، اس لئے مجھے محسوس ہوا کہ قوت جسمانی کی نشو ونما اعضاء کے گٹھاؤ، اور پٹھوں کی لچک کے لئے ملاّحی کی تعلیم کا یہ بہترین موقع ہاتھ آیا ہے۔

میں نے ایک مقام پر دیکھا کہ لوگ سیپ کے اندر چھری سے اس لئے کونچتے ہیں کہ اُس میں مصنوعی طور پر موتی پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کریں، بہترین لڑکوں کے ساتھ اُن کے مربیوں کا برتاؤ بھی اسی کے قریب قریب ہے، وہ لوگ اُن کے ڈھانچے کو برباد کر دیتے ہیں، اور اُن کے جسم کو ضعیف بنا دیتے ہیں، اور اُس سے اُن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چند معانی و مطالب جن کو وہ اپنی اصطلاح میں علم کہتے ہیں اُن کے دل و دماغ میں مرتکز ہو جائیں، لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے میں اُنھوں نے اپنی قوت اور صحت کا جو نقصان اُٹھایا ہے، مجھے اس میں شبہ ہے کہ یہ علم اُس کی تلافی کر سکے گا، میں طلبا کو تحصیل علم سے روکنا نہیں چاہتا، انسان تو صرف علم ہی کے حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، بلکہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عمل بدنی اور عمل عقلی، دونوں عقلی نشو ونما میں لازم و ملزوم ہیں، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ تمام قوائے فطریہ کی تربیت کریں اور کسی کو

حقیر نہ سمجھیں۔

بہر حال اس ارادہ سے پہلے میں نے امیل سے مشورہ کیا تو اُس کو نہایت مسرت آمیز طریقہ پر آمادہ سفر پایا، کیونکہ وہ اور بچوں کی طرح ہر نئی چیز کو پسند کرتا ہے، اور اس بات پر نازاں نظر آتا ہے کہ وہ ایک پیشہ کی تعلیم حاصل کرے گا، میرے اصول او اعتقاد کے موافق اگرچہ جس طرح مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ میں اُس کو کسی مذہبی یا سیاسی عقیدہ کے اختیار کرنے پر مجبور کروں اُسی طرح مجھے یہ بھی حق حاصل نہیں ہے کہ میں اُس کے لئے کوئی پیشہ متعین کروں، لیکن بااین ہمہ اگر کوئی مربّی لڑکے میں نفع اندوزی کا میلان بہت جلد پیدا کرنا چاہتا ہے، تو اُس کی یہ عجلت پسندی کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے، چونکہ امیل اپنی والدہ کے اسباق میں کام کرنے کی فضیلت پڑھ چکا ہے، اس لئے اُس کا خیال ہے کہ کہ وہ جہاز کے مستول پر چڑھ کر اپنے سفر کا کرایہ کما سکے گا، اگرچہ اُس کا یہ خیال صحیح نہیں ہی تاہم میں نے اُس کے دل سے اس وہم کو دور کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور اُس کو اس امر پر فخر کرنے کا موقع دیا کہ وہ اپنی خشک روٹی اپنے قوتِ بازو سے حاصل کرنا چاہتا ہی،

بحری سفر میں چھوٹے چھوٹے متعدّد فوائد ہیں، لیکن ان میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان کو یہ علانیہ نظر آجاتا ہے کہ عالم کائنات کی بڑی سے بڑی قوتیں کیا ہیں؟ اور انسان کو اُن کے مقابلہ یا اُن کے تسخیر کے لئے کس قدر استقلال اور غور و فکر کی ضرورت ہے؟ مجھے اُن اساتذہ پر بے اختیار ہنسی آتی ہے جو اپنے بیکار، اپاہج اور ناز پروردہ شاگردوں کو لوگوں کا بادشاہ کہتے ہیں، وہ اُن کے گورے گورے نرم ہاتھوں کی مدح میں یہی کیوں نہیں کہتے کہ وہ اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ آسمان کے اطراف وجوانب میں سورج کی گاڑی کو کھینچتے پھریں، بہر حال یہ اساتذہ اگر اُن بادشاہوں کو سمندر کے سامنے لاکر کھڑا کر دیں تو اُن کو معلوم ہو کہ سمندر کی موجیں اُن کے منہ پر تھوک کر اُن کو کس قدر مرعوب کر دیتی ہیں۔

لیکن "امیل" تو وہ ابھی سے یہ جان لے گا کہ مؤثرات عالم پر حکومت کرنے کے لئے کس قسم کی قربانی کی ضرورت ہی، اور پانی کے تخت پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے کس قسم کی مستقل و متواتر جنگ لازمی ہے۔

شذرۂ پانزدہم

جہاز میں کیا کیا سیکھا جاسکتا ہے

اگرچہ میں نے سمندر کو جب جب دیکھا میرے دل میں کسی نہ کسی قسم کا تعجب ضرور پیدا ہوا، لیکن انسان نے بحری تجربات سے جو جو علوم حاصل کئے ہیں اُنھوں نے آج میرے دل و دماغ کو خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ رکھا، مثلاً علم ہیئت جس میں نظام عالم سے بحث کی جاتی ہے، ملاحی سے پیدا ہوا ہے، اگر انسان کو بحری سفر میں رہنمائی کی ضرورت نہ واقع ہوتی، تو غالباً وہ اس علم کی طرف متوجہ نہ ہوتا، ایک بھولا بھالا ملاح جو بالکل ان پڑھ ہے بہت سے علمی مسائل سے واقف ہوتا ہے، اور بعض طبعی امور کے متعلق اس کی معلومات ایک دائم المطالعہ عالم کی معلومات سے بالکل ملتی جُلتی ہوئی نظر آتی ہیں، ہوا اور آندھی کا جو طبعی قانون ہے، اُس کے متعلق آج ہم کو معلوم ہوا کہ یہ اُن مختلف ملاحوں کے تجربات اور مشاہدات کا نتیجہ ہے جو مختلف سمندروں میں پھیلے ہوئے تھے، غرض اس طرح جو مؤثرات عالم کسی کے قابو ہی میں نہیں آتے تھے وہ ایک عام قانون کے پابند ہوگئے اور جن واقعات کو نظام سے کوئی تعلق نہ تھا اُن کا ایک عام علمی نظام قائم ہوگیا، اور بعض آلات کے ذریعہ سے سمندر کی گہرائی تک معلوم ہوگئی، اور آج آسانی کے ساتھ سمندر کے سب سے آخری حصہ کا نقشہ تیار کیا جاسکتا ہے، اور ان تمام علوم کے انکشاف کا فخر صرف ملاحوں کو حاصل ہے۔

سمندر بعینہ عالم ازل کا ایک نقشہ ہے، کیونکہ وہ ایک دائمی حرکت کی تصویر ہے،

اس لئے خشکی کی جو چیزیں پیدا ہو کر معدوم ہو گئیں اُن سب کو اُس نے دیکھا ہے، پہاڑوں
کی بلندی، اور زمین کے مختلف تاثرات و انقلابات کا اُس نے مشاہدہ کیا ہے، اور
اس مہیب نظارہ سے اُس کا دل کانپ اُٹھا ہے، وہ آج بھی اپنی دوڑ دھوپ
میں اُسی طرح سرگرم نظر آتا ہے، جس طرح تخلیق عالم کے پہلے دن تھا، پتھر کی جو چٹانیں اُس کے
ساحل کا مقابلہ کرتی ہیں وہ اُن کو چور چور کر دیتا ہے، اور زمین کے بعض قطعات کو مختلف مقامات
سے اُٹھا کر لے جاتا ہے، اور نئے نئے سواحل اور نئے نئے جزائر بناتا ہے، پھر اُن کو برباد
بھی کر دیتا ہے، وہ جس طرح مخلوقاتِ عضویہ کے لئے رحم مادر ہے، اُسی طرح زندگی کا
سرچشمہ بھی ہے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بحری تجربات نے ہمارے علوم کا دائرہ بہت کچھ وسیع
کر دیا ہے، لیکن ہم نے اُس سے بعض ایسی باتیں بھی سیکھی ہیں جو علم سے بھی بالاتر ہیں، یعنی
ہم نے اُس سے اخلاق کے وہ اصول سیکھے ہیں جو خطرناک سمندر کے مقابلہ سے پیدا ہوتے
ہیں، اس لئے ملّاحی تربیت کا کس قدر بہترین طریقہ ہے؟ یہ سنگ دل اور ترش رُو مربّی
یعنی سمندر، اپنے شاگردوں کو روز یہ سکھاتا ہے کہ تمام نفوسِ انسانی کی یکساں حالت
ہے، اور کامیابی صرف اُن پر اعتماد کرنے سے حاصل ہوتی ہے، وہ اُن کو ایک ایسی بہادری
کی تعلیم دیتا ہے جس کو مصائب متزلزل نہیں کر سکتے، ایسے صبر کی ہدایت کرتا ہے، کہ
وہ ہر قسم کی ناکامیوں کو برداشت کر سکتے ہیں، اور اپنے آپ کو تمام خطرات میں ڈال
سکتے ہیں، ملّاح جب سمندر کو استقلال کے ساتھ مغلوب کر لیتا ہے، تو اس سے دلیری
جو عزم و ثبات پیدا ہوتا ہے اُس کا کون شخص انکار کر سکتا ہے؟ اس مغلوبیت کی حالت
میں بھی سمندر اپنے غالب آنے والوں پر فخر کر سکتا ہے، کیونکہ اُسی نے ان ملاحوں کو پیدا
کیا ہے، اور وہ اُسی کے شاگرد ہیں۔

شذرهٔ شانزدہم

بحری سفر کے ذریعہ سے تربیت

چند روز سے مجھے اپنے کام سے فرصت مل گئی، اس لئے میں نے اپنے اوقات کو خود جہاز کے مطالعہ میں صرف کرنا شروع کیا، جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک چھوٹی سی دنیا ہے جو پانی پر تیرتی پھرتی ہے، اور تمام علوم و فنون اُس میں سمٹ کر آگئے ہیں، اس میں ملاح کی ضروریاتِ روزانہ اُس کو ایک جدید تمدّن کے پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہیں، گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ رابنسن اپنے جزیرے میں اپنے فوائد کے لئے اکثر فنون نافعہ کی ایجاد کرتا ہے، چونکہ اُس کے ساتھ بی بی نہیں ہے اس لئے خود ہی اپنا کپڑا دھوتا ہے، خود ہی اپنا بستر بچھاتا ہے، اُس کے کمرے کی صفائی سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ آیندہ زمانے میں اُس کا خلوت خانہ کس انداز کا ہوگا؟ اس بحری شیر کو فطرۃً مکان کا اُسی قدر اہتمام ہے جس قدر چیونٹی کو ہوتا ہے۔

جہاز کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو لوگ کام کرنا چاہتے ہیں اُن کے مشغلے کے لئے کوئی نہ کوئی کام ضرور مل جاتا ہے۔

مثلاً کا بیڈن کھانا پکاتا ہے جس کا اُس کو خاص سلیقہ ہے، ہیلانہ مریضوں کی دیکھ بھال میں میری مدد کرتی ہے، اور مسافروں اور ملاحوں کی تفریح کے لئے پیانو بجاتی ہے۔

امیل ابتدائی مشقوں سے گزر چکا ہے، اور اب وہ ایک ملاح ہوگیا ہے، جہاز کے دونوں جانب اسی کی جو سیڑھیاں ہیں وہ اُن پر چڑھ جاتا ہے اور ملاح جو کام اُس کے متعلق کردیتے ہیں اُس کو وہ کافی اور متوقع ہوشیاری کے ساتھ انجام دیتا ہے، اس قسم کے طالب العلموں کی بحری زندگی اگرچہ تکلیف سے خالی نہیں، تاہم وہ صحت اور تندرستی کی

زندگی ہے، سمندر کی ہوا اُس میں غذا کی اس قدر اشتہا پیدا کر دیتی ہے کہ اگر اُس کو بڑی سے بڑی مچھلی بھی مل جائے تو وہ اُس کو نگل سکتا ہے۔

نیلگوں قمیص میں جس کا گریبان اس طرح کھلا ہوا ہے جس سے اُس کا سینہ نظر آتا ہے، اُس کی چال پھرا اور اُس کے چہرے کا آب و رنگ دیکھنے کے قابل ہے، کل ایک سخت کام کر کے پسینے میں شرابور آیا اور میرے زانو پر سر رکھ دیا، میں نے اُس کو حوصلہ تو دلایا، لیکن تعریف کرنا پسند نہیں کیا، کیونکہ مدح و ستائش ایک زہر ہے جس کو باپ ماں اپنے لڑکوں کو کثرت سے استعمال کراتے ہیں، اس طرح اُن میں دوسروں کے خوش کرنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے، حالانکہ بچوں کو خود اپنے احساس کے خوش رکھنے کی تعلیم دینی چاہئیے بہرحال میں نے اُس کی ہمت افزائی کے لئے اُس کو سینے سے لگا لیا، اور اُس کو بوسہ دیا، بااین ہمہ اُس نے میری اس رفق و ملاطفت کو مدح و ستائش پر محمول کیا اور میرے پاس سے نہایت شاداں و فرحاں اپنے کام پر واپس گیا، اور میرے خیال میں وہ اس مدح یعنی اس ملاطفت کا مستحق بھی تھا۔

جہاز میں ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے آپ کو مفید ثابت کرے، مثلاً میں کل دفعتہ "لولا" کے پاس چلا گیا، تو دیکھا کہ اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے، اور وہ ایک پنج سالہ لڑکی کو پڑھا رہی ہے۔

شذرۂ نوزدہم

ایک بحری تجربہ

اس بحری سفر میں ملاحوں نے دریائی کتے کے شکار کے بعد ایک دریائی مور کا شکار کیا، جس کو لولا نے رحم آمیز نگاہ سے دیکھ کر کہا کہ "یہ اس کا مستحق تھا کیونکہ میں نے اُس کو بہت ہی خوبصورت

اُڑنے والی مچھلیوں کو نگلتے ہوئے دیکھا ہے"۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام قوانین میں بچے صرف قانون جزاء وسزا کو سمجھتے ہیں[1]۔

شذرۂ پنج وبستم

لڑکے حادثہ موت سے کیوں متاثر ہوتے ہیں

جہاز کی ایک لکڑی جو غیر مستحکم طور پر بندھی ہوئی تھی، ہوا کے جھونکے سے جہاز کے تختہ پر گری، جس سے ایک ملاح کے سر میں سخت چوٹ آئی، اور باوجود بہترین طبی امداد کے وہ جاں بر نہ ہو سکا، اس واقعہ پر تمام اہل جہاز نے ماتم کیا، اور تمام مراسم تجہیز و تکفین کے ادا کرنے کے بعد جب کپتان نے اُس کی لاش کو سمندر میں ڈالا تو بھرائی ہوئی آواز میں کہا "تم سمندر کی امانت ہو"۔

یہ مراسم ادا ہو رہے تھے اور میں وقتاً فوقتاً امیل کو دیکھتا رہتا تھا، مجھے اس دیکھ بھال میں معلوم ہوا کہ اُس پر اس حادثہ کا سخت اثر پڑا ہے، اور "لولا" تو علانیہ رو رہی ہے، میرے خیال میں ان دونوں کی اثر پذیری کے دو سبب تھے، اولاً تو یہ کہ مراسم تجہیز و تکفین اس متانت اور وقار کے ساتھ ادا ہوئے کہ اُنھوں نے دلوں کو ہلا دیا، دوسرے یہ کہ اس سے پہلے اُنھوں نے کسی میت کی تجہیز و تکفین کا منظر نہیں دیکھا تھا، کیونکہ وہ اب تک موت سے ناواقف تھے، یہ سچ ہے کہ وہ اس قدر یقینی طور پر جانتے تھے کہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے، کیونکہ اُنھوں نے بہت سے جانوروں کو مرتے ہوئے دیکھا تھا، بہت سے بھائیوں کو اُن کے گرد سے موت نے اُچک لیا تھا، لیکن بااین ہمہ اُنھوں نے اِن قدرتی حوادث پر کبھی غور و فکر

---

[1] اس لئے لڑکوں کی تعلیم و تربیت ترہیب و ترغیب سے خالی نہیں ہو سکتی، البتہ سزا اور انعام وغیرہ کی مناسب صورتیں اختیار کرنی چاہئیں۔

نہیں کیا تھا، اور انسان جب تک کافی غور و فکر نہ کرے کسی چیز کی حقیقت کو صحیح طور پر نہیں جان سکتا بعض لوگ خود مجھ پر اس جہالت و لاعلمی کا الزام لگاتے ہیں، کیونکہ قدیم اصول کے مطابق "امیل" کی تربیت کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ اُس میں خوف وہراس کی آمیزش کی جائے اور زندگی کو قبر اور جہنم کی دھمکیوں سے لبریز کر دیا جائے، لیکن افسوس ہے کہ میں ایسا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، کیونکہ میں نے اس کو زندگی کا سخت فریفتہ پایا، اس لئے میں نے فرائض زندگی کے محبوب بنانے میں اپنی تمام کوششیں صرف کیں، اور عذابِ آخرت کی دھمکیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا، درد انگیز اور رقت آمیز نصیحتیں بچوں کے احساس کو جلا نہیں دیتیں، بلکہ اون کو اور مکدّر کر دیتی ہیں، اس لئے کاش وہ وقت آتا کہ بچہ خود موت کے مناظر کو دیکھ کر متاثر ہوتا، اور خود اُخروی جزا وسزا کی تہ تک پہنچنے کی ضرورت محسوس کرتا۔

شذرۂ بست ونہم

ملّاحوں کی شجاعت کو سپاہیوں کی بہادری پر ترجیح حاصل ہے

اور وہ کسب وتعلّم کے ذریعہ سے حاصل کی جا سکتی ہے

ملّاحوں کی شجاعت سپاہیوں کی بہادری سے مختلف ہے، اور میرے خیال میں اُس پر ترجیح رکھتی ہے، ملاح اپنی جرأت و شجاعت سے موت کا دو بدو مقابلہ کرتا ہے اور دونوں حریفوں کے درمیان صرف ایک لکڑی کے تختے کی اوٹ ہوتی ہے، اُس کے اس مقابلہ کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اپنے حریفوں کو تباہ و برباد کردے، بلکہ وہ اپنی مدافعت کے ساتھ بہت سے لوگوں کو ہلاکت و بربادی سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے، اللہ اکبر، دریا کے پاس کس قدر مہلک ذخیرے اور کس قدر خطرناک سامانِ جنگ ہیں، ایک کمزور کشتی صرف لکڑی کی ایک چرخی سے زیادہ حیثیت

نہیں رکھتی، لیکن اس کمزور دشمن سے ہوا، سردی، بجلی اور موج سب جنگ کرتی ہیں، اس لئے وہ دنیا کی تمام قوتوں کا تنہا مقابلہ کرتی ہے۔

ایک سوفسطائی جو دقیق استدلالات سے قضا و قدر کی دلیرانہ مخالفت کرتا ہے وہ ملّاح کا ہم پلہ نہیں ہوسکتا، اُس کی یہ جرأت آمیز مخالفت عملی نہیں ہوتی، لیکن ملاح کی عزت تمام تر اُس کے عمل، اُس کی قوت قلب، اور اُس کی ہمت کے آئینے میں جلوہ گر ہوتی ہی وہ بہ حیثیت ایک پابند مذہب ہونے کے خدا سے مدد چاہتا ہے، لیکن اُس کے بعد صرف اپنی ذات پر یعنی اپنی صحیح نگاہ پر، اپنے باقاعدہ حرکات پر اور اپنی قوت اعصاب پر بھروسا کرتا ہے، اگر دشمن اُس کو مغلوب کر دیتا ہے تو وہ اُس کی اطاعت قبول کر لیتا ہی، لیکن جب تک اُس کا آخری ہتھیار ٹوٹ نہیں جاتا وہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالے نہیں کرتا۔

یہ بہادری تعلیم کے ذریعہ سے حاصل کی جاسکتی ہے، اور یہ اعتماد نفس میل جول سے انسان کے اندر سرایت کرسکتا ہے، امیس نے اول اول ملاحی شروع کی تو سخت خائف رہتا تھا، لیکن اپنے رفقا کی دیکھا دیکھی تھوڑے دنوں میں اُس کا خوف جاتا رہا، کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ اگر ان ثابت قدم لوگوں کے درمیان اُس کے قلب میں اضطراب پیدا ہوا، اور اُس کے پاؤں ڈگمگائے تو یہ سخت شرمناک بات ہوگی، اوس سے یہ لوگ جہاز کے مختلف کام لیتے تھے، اور جسمانی کام سے زیادہ کوئی چیز دل کو مضبوط نہیں کرسکتی، معمولی سے معمولی کھٹکا بھی مسافروں کے دلوں کو خوف و ہراس سے اس لئے لبریز کر دیتا ہے کہ وہ جہاز کے اندر بیکار رہتے ہیں، لیکن ملاح کے مصروف اوقات میں خوف کی گنجائش نہیں ہوتی۔

ملاحی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ملاحوں کو چونکہ ہمیشہ خطرات سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اس لئے اُن کے دل میں زندگی کی محبت خاص طور پر بڑھ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن میں خودکشی کا مادہ نہیں پایا جاتا، اس جدید دور کی ایک نہایت خطرناک اور نہایت درد انگیز خصوصیت یہ ہے کہ لوگ زندگی سے گھبرا اُٹھے ہیں، لڑکے پیدا ہوتے ہیں تو اُن کو

کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی، ہر چیز سے اُن کو دُکھ پہنچتا ہے، اُن کے احساس پژمردہ اور قلب مردہ ہوتے ہیں، بہت سی لڑکیاں بعض چیزوں کو واقعی اور حقیقی سمجھتی ہیں، لیکن جب حقیقت کے چہرے سے پردہ اُٹھتا ہے تو اُن کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ایک وہم تھا، اور اس وقت اُن کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ کاش انکشافِ حقیقت سے پہلے وہ موت سے ہم آغوش ہو چکی ہوتیں، بہت سے کاہل الوجود لڑکے جن کی عمر ابھی سولہ سال سے زائد نہیں، اور تقدیر نے ابھی تک اُن کے ساتھ ایک کم سِن بچے کا سا برتاؤ کیا ہے، شور کرتے ہیں کہ "زندگی سے کیا فائدہ ہے" اس وقت میں اس اخلاقی اور روحانی مصیبت کے علل و اسباب سے بحث کرنا نہیں چاہتا، بلکہ اُن لوگوں سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "ملاح کو دیکھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ اُس نے زندگی کی قیمت کا صحیح اندازہ کیا ہے، کیونکہ وہ حقیقی خطرات سے زندگی کی مدافعت کرتا ہے تاکہ اُس کو ایک مفید مقصد میں صرف کرے، یہی وجہ ہے کہ وہ پورے طور پر اُس کی قدر کرتا ہے"۔

بہرحال ان اسباب سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت امیل نہایت ہوشیار اساتذہ کی تربیت میں ہے لیکن "لولا" نے اب تک کسی قسم کی شجاعت کا اظہار نہیں کیا ہے، بلکہ اپنے کمرے کے ایک گوشے میں چھپی پڑی رہی ہے، اور اس وجہ سے ہیلانہ نے اُس کے ازالۂ خوف کے لئے اپنے آپ کو بطور نمونہ و مثال کے پیش کیا ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ عورت کے لئے شجاعت کوئی مفید چیز نہیں کیونکہ اگر شجاعت سے صرف فوجی شجاعت مقصود ہو تو میرے نزدیک وہ عورت تو عورت خود مردوں میں بھی کوئی اہم اور قابلِ لحاظ چیز نہیں، فوجی ضروریات کے علاوہ اور بھی بہت سے خطرات ہیں جو انسانی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں، اور بہت سے حالات ہیں، عورتوں بلکہ اُن کے بچوں کی زندگی کا تمام تر دار و مدار اُن کے سکون اور استقلال پر ہوتا ہے، اس لئے عورتیں بھی مردوں کی طرح قوت عزم اور قوت قلب کی محتاج ہوتی ہیں۔

لڑکیوں کی تربیت اس حد تک خراب ہو چکی ہے کہ اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ اگر مصنوعی طور پر نوجوانوں کے سامنے خوف و اضطراب کا اظہار کیا جائے تو اس سے وہ اُن کی طرف ملتفت ہو جاتے ہیں اور اس حالت میں اُن کو دیکھ کر ہر شخص کہہ اُٹھتا ہے کہ وہ کبوتری کی شکل میں نمودار ہوئی ہیں، لیکن اُن کو بتانا چاہیئے کہ خوف میں کوئی حسن نہیں ہے، تکلیف و مصیبت کے وقت عزم و ثبات کے اظہار سے اُن کے اصلی حسن کی نمائش ہو سکتی ہے۔

لڑکیوں کا یہ غلط خیال ہے کہ قوت قلب سے عورت کے اخلاق میں کرختگی پیدا ہو جاتی ہے، میرے نزدیک تو ایک ایسی ذات میں جو حملہ و مدافعت کی طاقت نہیں رکھتی باایں ہمہ مردوں کی طرح صبر و استقلال کے خطرات میں کود پڑتی ہے، اور بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔

یہ ایک وہمی خیال ہے کہ سختی اور کرختگی شجاعت کے لوازمات میں سے ہیں، میں نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ بہادری نے عورت کی رقت قلب، لطافتِ طبع، اور اُس کے لطف و کرم میں کسی قسم کا تغیر پیدا کیا ہے، بلکہ خود بزدلی اور خود غرضی ہی انسان کے دل کو سخت کر دیتی ہیں۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ عزم و استقلال، بہادری اور اعتماد علی النفس کی ضرورت صرف دو چیزوں یعنی جنگ اور ملاحی میں پڑتی ہے، مرد اور عورت ہزاروں مہلکات سے گھرے ہوئے ہیں، اور ان تمام حالات میں یہ اخلاقی اوصاف نافع و مفید ہو سکتے ہیں۔

سمندر صرف ہماری روح نکالنا چاہتا ہے، لیکن اور بھی بہت سے حالات پیش آتے رہتے ہیں، جو ہماری عزت و آبرو کو غارت کر دینا چاہتے ہیں۔

شذرۂ سی و ہشتم

مؤثرات طبعیہ کے ذریعہ سے تربیت

آج ہم نے شہر لیما کے قریب ایک حبشی کو دیکھا جو یہاں اس غرض سے آیا تھا کہ ایک جانور کی نمائش کے ذریعہ سے کسب معاش کرے۔

سخت افلاس اور تنگ دستی کے ساتھ اس حبشی کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جو پتلی چادر اوڑھے ہوئے تھی، اور لنگڑاتی ہوئی چلتی تھی میں نے اُس سے لنگڑانے کی وجہ دریافت کی تو اُس نے میرے جواب میں اپنی ایک پنڈلی دکھائی، میں نے اُس کو دیکھا تو اُس میں ایک زخم تھا، اور اُس کے دونوں پاؤں نہایت شدت کے ساتھ پھول گئے تھے، میں نے دوبارہ اُس کی زخمی پنڈلی کو غور سے دیکھا تو مجھے اُس کے اندر ایک بہت بڑا کانٹا نظر آیا، جس نے اُس میں یہ زخم کر دیا تھا، اس کے بعد چلنے پھرنے سے اس زخم نے اور بھی خطرناک صورت اختیار کر لی تھی، میں نے بڑی محنت سے اُس کانٹے کو نکالا پھر زخم پر ٹانکے لگائے، چونکہ اس وقت میرے پاس پٹی موجود نہ تھی، اس لئے لولا نے مجھ کو اپنا رومال دیدیا، اور صرف رومال ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس لڑکی پر ترس کھا کر اپنے پاؤں کے جوتے بھی نکال کر اُس کے زخمی پاؤں میں پہنا دئے، اور وہ اُن میں اس قدر ٹھیک آگئے گویا اُسی کے لئے تیار کئے گئے تھے، اُس نے لولا کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کیا، اور ہم لوگوں نے اُن دونوں کو چھوڑ کر اپنا راستہ لیا۔

اگرچہ لولا نے اس نیک کام کو خود اپنے جذبۂ دل کی تحریک سے کیا تھا، تاہم تھوڑی دیر کے بعد سخت زمین میں برہنہ پا چلنے سے اُس کو تکلیف محسوس ہونے لگی، امیل نے پہلے پہل تو اُس کی ہنسی اُڑائی، لیکن بعد کو اُس پر اِس زحمت کا اثر پڑا، اور اُس نے اُس کو اپنی

پیٹھ پر لاد لیا، جس کو اُس نے مسکرا کر قبول کیا۔

ہمارا راستہ اگرچہ بہت دور نہ تھا تاہم میری نصیحت کے مطابق امیل نے راستے میں دو تین بار ٹھہر کر دم لیا، آخری مرتبہ ہم نے پھر اُس حبشی کو دور سے آتے ہوئے دیکھا، اور جب لولا کو یہ نظر آیا کہ اُس کی لڑکی نے پاؤں سے جوتے نکال کر ہاتھ میں لے لئے ہیں، تو اُس کو سخت رنج ہوا کہ اُس کے عطیہ کی ناقدردانی کی گئی، اور ناقدردانی کے ساتھ اُس کا غلط استعمال کیا گیا، لیکن میں نے یہ کہہ کر اُس کو تسکین دیدی کہ عادت انسان کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے، یہ لڑکی چونکہ ہمیشہ سے برہنہ پا رہتی چلی آئی ہے اس لئے جوتا پہننے سے تھک گئی ہے۔ با ایں ہمہ احسان اور سلوک کی ہمت ہر حالت میں قابل مدح وستائش ہے، لیکن اس نصیحت سے بہتر ایک اور تجربہ بھی مجھ کو ہوا اور وہ یہ کہ امیل کے پیٹھ پر لاد لینے سے اُس کے دل پر یہ اثر پڑا کہ انسان جب کوئی نیکی کرتا ہے تو اُس کا معاوضہ کسی نہ کسی صورت میں اُس کو مل جاتا ہے۔

چوتھی کتاب

جوان لڑکے کی تربیت کے متعلق

پہلا خط

امیل کی طرف سے باپ کے نام

اپنی معاشرت کا بیان، جرمن طلبہ کی مجلس اور ان کی گفتگو، سرکاری ملازمت پر ان کا نوٹ
نوٹ کے گرز، اپنے معاملہ کے متعلق امیل کی فکر، جرمن زبان نہ سمجھنے کا رنج، لولا کی یاد و بیچ کیا
سے وحشت

میں ایک ضروری امتحان کے بعد یونیورسٹی کے مدرسے میں داخل ہو گیا، اور اب ایک ہفتہ سے مجھ کو "سید طالب" کے لقب سے پکارا جاتا ہے، اس وقت میرا فرض یہ ہے کہ میں آپ کو اپنی معاشرتی حالات سے اطلاع دوں، میں حکمت، تاریخ، قانون ، اور ان کے علاوہ متعدد علوم و فنون کی تحصیل میں دن گزارتا ہوں، رات ایک گھر میں بسر کرتا ہوں جس کو میں نے ۲ ماہ کے لئے تقریباً ۲۰ فرنک کرایہ پر لیا ہے، کھانا یونیورسٹی ہی کے مطبخ میں کھاتا ہوں جس کی قیمت ۴۴ سالڈی یعنی سوا فرنک ادا کرنی پڑتی ہے، اور عشاء کے بعد کبھی اپنے کمرے ہی میں

اب امیل جوان ہو کر جرمنی میں تحصیل علم کے لئے گیا ہوا ہے، وہاں سے اس خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو امیل اور اس کے ماں باپ کے درمیان ہوئی ہے۔

پڑا رہتا ہوں، اور کبھی شہر کی سیر کو نکل جاتا ہوں، اگرچہ ابھی تک اجنبیت کی وجہ سے تمام لڑکوں سے تعارف نہیں ہوا ہے، تاہم ایک طالب العلم مجھ کو ایک رات ایک سگریٹ خانہ میں لے گیا جہاں بعض جرمن طلبا جمع ہوتے ہیں، دروازہ کھلا تو مجھے تمام گھر دھوئیں کی تاریکی سے اندھیر انظر آیا، مجھے صرف قہقہے لگانے اور گانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، لیکن کوئی زندہ صورت نظر نہیں آتی تھی، مکان کے بعض اطراف میں کچھ سرخ روشنیاں نظر آتی تھیں، جن پر تنباکو کے دھوئیں کا سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا، اس لئے معلوم ہوتا تھا کہ وہ روشنیاں ایک گہرے سمندر میں تیر رہی ہیں، میں اندھے کی طرح اپنے رہنما کے ساتھ ساتھ چلا جاتا تھا، اسی کے قریب دو صفوں کے درمیان چند کھانے کے میز بچھے ہوئے تھے، اور مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہروں کے درمیان تیر رہے ہیں، اور اُن پر قلعی کے کچھ برتن رکھے ہوئے ہیں، جن کی چمک اس سیاہ دخانی پردے کو چاک کرنا چاہتی ہے، مجھے اُن برتنوں کے درمیان کچھ انسانی چہرے بھی نظر آئے، لیکن وہ اچھی طرح اُس وقت نمایاں ہوئے جب میں ہال کے آخری حصے میں جہاں ایک بہت بڑا آتشدان لگا ہوا تھا پہونچا، اب میں نے اپنے آپ کو نوجوانوں کی ایک عظیم الشان مجلس میں پایا، جن کے سر پر ٹوپیاں، ہاتھ میں جام مے، اور مُنہ میں سگار تھے، اور اِن ہی کے درمیان ایک حلقۂ طلبا کا بھی تھا، جو مہمات مسائل پر بحث و مباحثہ کرتا جاتا تھا، اور ساتھ ساتھ شراب نوشی اور سگرٹ نوشی کا مشغلہ بھی جاری تھا۔

ابھی تک میرے کان جرمن زبان سے اس قدر آشنا نہیں ہوئے کہ سُننے کے ساتھ ہی اُس کو سمجھ سکوں، تاہم میں نے فحوائے کلام سے اس قدر سمجھ لیا کہ یہ سب اصلاح بشری کے مقاصد اور اُس کے ذرائع و وسائل کے متعلق بحث کر رہے ہیں، آدھی رات کے بعد تمام طلبا نے ہال کو چھوڑ دیا اور جن لوگون کو مصالح انسانی کے ساتھ ہمدردی تھی، وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے، لیکن یہ لوگ راستے میں اس قدر مبتذل گیت گاتے جاتے تھے کہ

یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اُنھوں نے اصلاح عالم کا باہم جو معاہدہ کیا ہے وہ اُنھیں یاد بھی ہے۔

طلبا، یونیورسٹی کے مدارس میں جن اغراض سے داخل ہوتے ہیں اُن میں جیسا کہ ہمیں نے سنا ہے سب سے زیادہ اہم غرض یہ ہے کہ اُن کو کوئی سرکاری ملازمت مل جائے، اس لئے جب کسی طالب العلم کو ڈاکٹری کی ڈگری مل جاتی ہے تو وہ اپنا سرٹیفکیٹ لے کر سرکاری محکموں میں خالی شدہ جگہ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے، لیکن اکثر یہ عہدے بغیر امتحان کے نہیں ملتے، اور امتحان میں بھی مقابلہ کا امتحان دینا پڑتا ہے اس لئے جو لوگ ناکامیاب رہتے ہیں وہ دوسرے مستقل کام شروع کر دیتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ یونیورسٹی سے نکل کر ڈاکٹروں کی عقل میں جو تغیر و انقلاب پیدا ہو جاتا ہے، وہ اسی شوقِ ملازمت کا نتیجہ ہے، یا اُس کا کوئی دوسرا سبب ہے؟

جرمن طلبا اور دوسرے ملکوں کے طلبا میں کسی قسم کی مناسبت اور مشابہت نہیں ہے، جرمن طلبا نہایت فخار، اور جھگڑالو، ہوتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ اور جرمن اس قدر متین اور سنجیدہ ہوتے ہیں کہ اُن کی متانت جمود اور بلادت کی حد تک پہونچ جاتی ہے، اس کے بخلاف جرمن طلبا کا میلان شورش اور انقلاب کی طرف ہوتا ہے، وہ جمہوری حکومت کو پسند کرتے ہیں، اور ہر قسم کے سیاسی، مذہبی، اور قومی مسائل میں اندھا دھند حصہ لیتے ہیں ان کے علاوہ اور تمام قوم قدامت پسند ہے، اور شاہی حکومت یعنی شخصی حکومت کو پسند کرتی ہے، جرمن طلبا کا سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ وہ نسبی امتیازات و اعزازات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن متوسط درجہ کے جرمن خطابات وغیرہ کی حد سے زیادہ عزت کرتے ہیں، غرض دونوں گروہ الگ الگ دو قوم بن گئے ہیں اور طلبا کو بقیہ قوم سے صرف اس قدر تعلق رہ گیا ہے، کہ یونیورسٹی کو چھوڑ کر قوم کے فوائد کے لئے سرکاری خدمات انجام دیں، لیکن اسی تعلّق کی بنا پر حکومت اُن کی آزاد رائے کی کوئی

پروا نہیں کر سکتی،

ان کی روشِ زندگی نے مجھے بھی اپنی روشِ زندگی کی طرف توجہ دلائی، اور میں اس پر غور کرنے لگا، کیونکہ میری عمر ۱۹ برس کی ہو چکی، اور لوگوں کے درمیان میری کوئی حیثیت قائم نہیں ہوئی، بلکہ اب تک میں اپنے لئے کسی پیشے کا انتخاب بھی نہ کر سکا اور بالکل سچ تو یہ ہی کہ جب میں کسی مناسب کام کے کرنے کا قصد کرتا ہوں، تو مجھے اپنے عزم و ہمت میں ضعف محسوس ہونے لگتا ہے، اور دل گرفتہ ہو کر رہ جاتا ہوں، اگرچہ میں نے علوم و فنون میں بہت جلد ترقی کر لی ہے، اور چار یا پانچ سال میں قدمار کی کتابوں سے فارغ ہو چکا ہوں اور یہ عقلی ترقی آپ کی اور والدہ کی تربیت کا نتیجہ ہے، اس میں شبہ نہیں کہ میں علم کا حریص ہوں، لیکن جو اوصاف و محاسن مجھ میں موجود نہیں ہیں، میں اُن سب کو حاصل کرنا چاہتا ہوں اس لئے مجھے اپنے اندر کبھی روح الٰہی محسوس ہوتی ہے جو مجھ میں ہر چیز کے حاصل کرنے کی استطاعت پیدا کر دیتی ہے، کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں عاجز ہو کر فنا ہو گیا اور میری قوت و استطاعت کا تمام سرمایہ ختم ہو چکا، کبھی مجھ پر افکار و خیالات کا قبضہ ہو جاتا ہی، اور کبھی مجھ پر ضرورت عملی کا جذبہ غالب آجاتا ہے، اور بالکل یقینی بات تو یہ ہے کہ میرے اندر جو قوتیں موجود ہیں، اُن کو کسی کام پر اب تک ثبات و قرار حاصل نہیں ہوا ہے۔

دو مہینے پیشتر میں جب لیما میں گیا تھا تو میرا خیال تھا کہ میں جرمن زبان جانتا ہوں، لیکن چند ہی روز کے بعد مجھ پر میری یہ غلطی ظاہر ہو گئی، اور اس غلطی کا سبب یہ تھا کہ میں اخبارات، دوکانوں کے سائن بورڈ، سڑکوں کے نام، اور دیواروں پر لگے ہوئے اعلانات کو پڑھ لیتا تھا، لیکن جب میرے سامنے جرمن زبان میں گفتگو کی گئی تو میں صرف آواز ہی آواز سنتا تھا، معنی مطلب کچھ نہیں سمجھتا تھا، میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، لیکن کان بند تھے، میں اس قسم کی گوشہ نشینی سے سخت کبیدہ خاطر ہوا، اور سخت کوشش کے بعد اس زندگی کا دور ختم ہوا، اور اب میں جرمن زبان میں گفتگو کر سکتا ہوں اگرچہ ابھی مجھے اس زبان کو

بہت کچھ سیکھنا ہے، لیکن میرے سن کا لڑکا چند دنوں میں اس کو آسانی کے ساتھ سیکھ سکتا ہے، اس زبان میں گفتگو کر لینا مشکل نہیں ہے، البتہ دو شخصوں کی گفتگو کا سمجھنا دشوار ہے۔ میں ایک روز تھیٹر میں گیا دو ایکٹر باہم گفتگو کر رہے تھے، لیکن اُن کی تیز رواں گفتگو میں میں صرف شام کا سلام سمجھ سکا یعنی یہ فقرہ کہ "تمھاری رات سعید ہے"۔

دوسرا خط

از ڈاکٹر اراسمس بنام امیل

ماں باپ سے بچے کی جدائی ایک فطری قانون ہے، علم جرمنی میں، طالب العلم کی تنقید غیروں کے اُن خیالات پر جن کو وہ پڑھتا ہے، معقولات کی تحصیل میں میانہ روی بقدر طاقت فرض کے ادا کرنے میں قوم کا فائدہ، بعد تحصیل علم کے نوجوان لڑکے کا انتخاب عمل، جب قوم کے نوجوان سرکاری عہدوں پر ٹوٹتے ہیں اُس کو آزادی نصیب نہیں ہو سکتی، ملاحدہ سے بچنا، جب تک حکومت جمہوری نہ ہو پبلک رائے کی کوئی قیمت نہیں، قوم کی خدمت خود قوم کی خدمت کے لئے، نہ صلہ و معاوضہ کے لئے۔

پیارے امیل! اگر تم اپنی وحشت اور غربت سے ملول ہوتے ہو، تو ہم کو بھی تمھاری جدائی کا رنج ہے، لیکن ہونے والی بات پر تسلیم و رضا بھی فرض ہے، بالفرض اگر یہ میرے امکان میں بھی ہوتا کہ میں مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے کسی کو اپنا قائم مقام کر کے، لندن کو تمھاری رفاقت کے لئے چھوڑ سکتا، تب بھی مجھے اس میں تامل ہوتا، اب تمھارے لئے مردانہ روش کے سیکھنے کا وقت آگیا ہے، چڑیاں بھی اپنے بچوں سے محبت رکھتی ہیں، لیکن جب اُن کو نظر آتا ہے کہ خود بچے میں اُڑنے کی طاقت آگئی، تو وہ اُن کے بازوؤں سے کام لینے کے لئے خود اُن کی ہمت افزائی کرتی ہیں، یہ اُس خدا کی سنت ہے جو تمام مخلوقات کو آزادی عطا فرمانا چاہتا ہے۔ تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے تم کو "برن" میں صرف اس لئے بھیجا ہے کہ جرمن

زبان، جرمن خیالات، اور جرمن اخلاق کی تعلیم وتحصیل میں تمھارے لئے آسانیاں پیدا کروں، اور مجھے یقین ہے کہ اب تک تم نے خود اپنی تعلیم کا مستقل انتظام کر لیا ہوگا، اور اندرونی طور پر خود اپنے رہنما اور خود اپنے اُستاد بن گئے ہوگے، تم نے مجھ سے جو اسباق پڑھے ہیں وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں، لیکن دنیا کے عام حالات کے مطابق، تمام طرق ومذاہب کی تعلیم خود اُن کے اصل ماخذ ہی سے حاصل کرنی چاہیئے، آج جرمنی علم کی روشنی کا منارہ ہے، اور وہ ایک ایسا ملک ہے کہ حکمت، تنقید، اور لٹریچر کے متعلق تمام ممالک پر اُس کی مرجعانہ حیثیت کو تسلیم کرنا چاہیئے، اُس کی یونیورسٹیوں کے کالج، بڑے بڑے علما، اور بڑے بڑے پروفیسروں کا مہبط ہیں، لیکن بااین ہمہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ بلا سوچے سمجھے اُن کی تعلیمات کو قبول کر لو، اور اُن کے اقوال وخیالات کو مسلم قضایا کی طرح تسلیم کر لو، اگر میں نے ایسا کیا تو مجھے اُن تمام اُن اصول کو چھوڑ دینا پڑے گا جن پر آج تک میں چلتا رہا، انسان کے پاس صرف ایک ہی چیز ہے، جو کسی کو نہیں دی جا سکتی، اور وہ اُس کے خیالات کی آزادی ہے، اس بنا پر تم یونیورسٹی میں جن علوم کی تعلیم حاصل کرتے ہو، جب تک خود اُن پر غور وفکر نہ کر لو، وہ تمھاری عقل کا دائرہ وسیع نہیں کر سکتے، اپنی طاقت کو ہرگز ہرگز معقولات کی تحصیل میں برباد نہ کرنا، کیونکہ جب تک انسان معقولات کو اپنے ہمسروں کی نفع رسانی کا ذریعہ نہ بنا سکے وہ ایک بے قیمت چیز ہیں، تحصیل علم بے شبہ ایک عمدہ چیز ہے، لیکن اس سے بھی عمدہ یہ ہے کہ انسان اپنے وطن کا دوست ہو اور اپنے اہل وعیال کو فائدہ پہونچائے، اس لئے تم کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ جرمنی تمھارا ملک نہیں ہے تمھارے اسلاف کی یادگار اٹھارھویں صدی کا فلسفہ ہے، اور تمھاری ماں شورش فرانس ہی، تمھارے خط کے اس فقرے نے کہ "میں کبھی کبھی اپنی ہمت میں کمی اور اپنے عزم میں ضعف پاتا ہوں اور تنگ دل ہو کر اپنے نفس سے یہ سوال کرتا ہوں کہ میں کس کام کے لئے موزون ہوں" مجھے رنج پہونچایا، تم کو یقین کرنا چاہیئے کہ نفع رسانیِ خلق کے لئے یہ ضروری نہیں ہے

کہ انسان بہت بڑا آدمی ہو، ہر صادق النیت شخص اگر صحیح طور پر اپنی قوم کو فائدہ پہونچاتا چاہتا ہے، تو وہ اُس کی حالت میں کچھ نہ کچھ تغیر ضرور پیدا کر سکتا ہے، زندگی صرف چھوٹے چھوٹے فرائض کے انجام دینے کا نام ہے، اس لئے جس شخص نے اپنی استطاعت کے مطابق ان سب کو ادا کر لیا وہ اُس شخص سے افضل ہے، جو بڑے بڑے کاموں کا ڈھنڈورا پیٹ کر شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے، ہمارے خیالات اور ہمارے اعمال خود ہمارا ذاتی سرمایہ نہیں ہیں، اُن کے آثار صرف اُن لوگوں میں ظاہر ہوتے ہیں جو ہمارے ارد گرد موجود ہیں یا ہمارے بعد ہمارے قائم مقام ہونے والے ہیں، یہ کون کہہ سکتا ہے کہ جن عظیم الشان سیاسی اور اجتماعی تحریکات نے دنیا کو اولٹ پلٹ دیا اُن میں کمزور، اور گمنام لوگوں کی عملی خدمات کا حصہ بڑے بڑے لیڈروں کی خدمات کے حصے سے کم تھا؟ بلکہ اکثر اوقات تو ان لیڈروں کا وجود اور اُن کی شہرت خود اِن ہی ضعیف اور گمنام لوگوں کے مساعی وفضائل کی عکسی تصویر تھا

تم جیسے ہو تم کو ویسا ہی رہتے پر قناعت کر لینی چاہئے، لیکن اس کے ساتھ اپنے قوائے نظریہ کی نشو ونما اور اپنے وہبی طاقتوں کے دائرہ کی توسیع کے لئے ہمیشہ علمی اور عملی کوشش کرتے رہنا چاہئے، اگر کسی وقت تم کو اپنے دائرۂ وجود کے بڑا کرنے کی ضرورت پیش آئے تو تم کو حقیقی شعراء کے دواوین کا مطالعہ، اور مشہور ائمہ کی تصنیفات کا مطالعہ کرنا چاہئے، اور اس مطالعہ سے تم میں بڑائی کا جو خیال پیدا ہو اُس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے، لیکن اگر تم ان بلند مقامات سے نیچے اُترے، تو تمھارے ارد گرد بہت سے چھوٹے چھوٹے لوگ نظر آئیں گے، جن کی نفع رسانی کے کام تم کو اوروں سے بالکل بے نیاز کر دیں گے، اور اس صورت میں اگرچہ تم بہت سے فضائل کے حاصل کرنے سے محروم رہوگے، تاہم نیکی کے یہ کام تمھارے دل کی تسکین کے لئے کافی ہوں گے، عقلی ضعف اور عقلی کمی سے صرف وہی لوگ کبیدہ خاطر ہوتے ہیں جو خودغرض یا خبیث النفس ہیں، لیکن جو شخص اپنی تقدیر پر راضی ہو کر صرف کام کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ اپنی موجودہ عقل سے زیادہ

کچھ نہیں چاہتا، بلکہ خود اپنے آپ پر رشک کرتا ہے، دوسروں سے حسد نہیں رکھتا۔
مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ جو کام کر رہے ہیں، تم اُن میں سے کسی کام کے انتخاب کر لینے کے لئے کوشش بلیغ کر رہے ہو، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ ہر شخص پر اپنی محنت سے اپنی زندگی بسر کرنے کا سامان کرنا فرض ہے، اور اگر تم نے انسان کے اس اوّلین فرض میں سہل انکاری سے کام لیا تو مجھ کو نہایت رنج ہوگا، تاہم تم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ تم جن چیزوں کی تعلیم حاصل کر رہے ہو، وہ باوجودیکہ ہر پیشے کی طرف رہنمائی کر سکتی ہیں، لیکن تمھارے سامنے اُن میں ایک کا دروازہ بھی نہیں کھول سکتیں اس سے تم کو رنجیدہ نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ تم جس علم کو حاصل کرتے ہو وہ تمھاری عقل کا ذخیرہ ہے، اس لئے اگر تم کو اُس سے فائدہ نہ پہنچے گا، تو وہ کم از کم دوسروں کی نفع رسانی کا ذریعہ ہوگا، اس کے علاوہ دنیا میں مختلف کام، اور مختلف واقعات کا جو سلسلہ نظر آتا ہے، وہ ایک دوسرے سے بالکل مربوط ہے، اس لئے اگر تم ایک کام کو صحیح طور پر جاننا چاہتے ہو تو تم کو بہت سی چیزوں کو جاننا پڑے گا، جن کو اس سے دور کا تعلق ہے، میں اس تقریر سے تم کو علم عام کے تحصیل کی ترغیب نہیں دیتا، کیونکہ وہ ایک خیالی اور وہمی چیز ہے، بلکہ صرف یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ علوم کے قضایائے عامہ کے حقیقی تصور کے لئے پورے طور پر اُن علوم کو حاصل کر لینا چاہیئے۔

جو کام تمھارے لئے موزوں و مناسب ہوں تم اُن کے اختیار کرنے میں پورے طور پر آزاد ہو، میں صرف اس قدر باز پرس کروں گا کہ تم نے اس معاملہ میں دوسرے طلبہ کی تقلید تو نہیں کی ہے؟ تم کو صرف وہی راستہ اختیار کرنا چاہیئے جس کی طرف تمھارا اخلاق اور تمھارا طبعی میلان رہنمائی کرے، تم ڈاکٹر، وکیل، انجنیر، وغیرہ سب کچھ بن سکتے ہو، لیکن خدا کے لئے حکومت کا عہدہ دار نہ بننا۔

جس قوم کے نوجوان طلبا رعمال حکومت کی جماعت میں شامل ہونے کے لئے ہمیشہ تاک جھانک کرتے رہتے ہیں، اوس کے لئے آزادی کی کیا توقع ہے؟ قدیم زمانے میں

حکام کے مظالم کا فن نہایت مشکل خیال کیا جاتا تھا، اور اُس کی تعلیم و تعلم کے لئے خاص قسم کی استعداد اور قابلیت درکار تھی لیکن اس وقت رعایا کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکام مکر و فریب اور جبر و تشدد کے ذریعہ سے لوگوں کو جو غلام بناتے تھے، اب خود رعایا نے اپنے گلے میں غلامی کا طوق ڈال کر اُن کے اس کام کو بہت کچھ ہلکا کر دیا ہے اگر ایک بادشاہ یا ایک حاکم کے تخت کے گرد، جھکے ہوئے سر، اور نہایت پست درجہ کی طاعیاں موجود ہیں، تو اُس کے پاس جب تک روپیہ، عہدہ، خطاب، تمغہ، اور سند وغیرہ کا کافی ذخیرہ موجود ہے، غلامی کے یہ مظاہر موجود رہیں گے۔

الحاد اور بے دینی صرف جرمن طلبا رہی تک محدود نہیں ہیں، تم جہاں بھی جاؤ گے تم کو ایسے نوجوان ملیں گے جو نہ کسی چیز کا عقیدہ رکھتے اور نہ کسی چیز کا احترام کرتے، تم کو ان سے بچنا چاہیئے، کیونکہ یہ عقلی بدکاری اوضاع قدیمہ کے قیام و بقا میں ممد و معاون ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ جو آزادی خیال کے مدعی ہیں، خود غرضانہ جذبات سے خالی نہیں ہیں، اس لئے حکومت ٹانگ پکڑ کر اُن کو ہر طرف گھسیٹ سکتی ہے، یعنی ذاتی اغراض کی حرص عہدوں کی پیاس، اور تنخواہوں کی خواہش اُن کو نظام حکومت کے توقیر و احترام پر مجبور کر سکتی ہیں، اور میرے نزدیک عقلی دلیری کے ساتھ جب تک روحانی شجاعت اور بے غرضانہ جذبات کا عنصر شامل نہ ہو وہ کوئی قابلِ اعتبار چیز نہیں ہو سکتی۔

اس کے علاوہ جبکہ دنیا میں دوسروں کی خواہش کو پورا کر کے تمام خواہشیں پوری کی جا سکتی ہیں، تو استبداد پسند لوگوں کے لئے بہادر غلاموں کی کمی نہیں ہو سکتی، اور جو لوگ کل تک بڑے منطقی اور ماہرِ فن تھے، وہ آج قوت کے سامنے سر بسجود ہو سکتے ہیں۔

اس زمانے میں سرکاری خدمات قوموں کی سب سے بڑی مصیبت ہیں، کیونکہ جن ملکوں میں خود بادشاہ سرکاری مناصب کی تقسیم کرتا ہے، اُن میں لوگوں کی رائے اُس عملِ حسابی کا نتیجہ ہوتی ہے جس کا تعلق ان عہدوں کے منافع سے ہوتا ہے، مثلاً حاکم سے

کوئی سیاسی یا مذہبی غلطی ہو جائے، اور اُس کے بعد اُس کے حامیوں کے ہاتھ دس ہزار فرنک آجائیں، تو اُس وقت یہ غلطی صحت کے قالب میں نمایاں کی جا سکتی ہے، اور اگر وہ ذلیل سے ذلیل کام کر کے ۲۰ ہزار فرنک ان لوگوں کو دیدے تو کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے بڑی ہمت اور دلیری کا کام کیا ہے، اس لئے اُس کے ساتھ خلوص کا اظہار کرنا چاہیئے، اس زمانے میں لوگ رائے عام کا بہت تذکرہ کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ صداقت اور حُرّیت کی سب سے بڑی ضامن وکفیل ہے، یہ اُس صورت میں بالکل صحیح ہے جب قوم کا نظامِ حکومت خود قوم کے ہاتھ میں ہو، لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو خود رائے عام استبداد کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ سرکاری عہدہ داروں کی مضر تعداد قومی جماعتوں کے مقابل میں کوئی وقعت نہیں رکھتی، لیکن معترض نے اعتراض کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ ہر سرکاری عہدہ دار کے مقابل میں ہزاروں آدمی ہیں جو اُس کے عہدے کے خواستگار ہیں، اور اُن کو قوی امید ہے کہ ایک نہ ایک دن اُن کو بھی عہدہ ملے گا، اس بنا پر سرکاری عہدہ داروں کی دنیا تہ بہ تہ قائم ہوئی ہے، سب سے پہلے طبقے میں تو خود یہ عہدہ دار ہیں، اس کے بعد ان عہدوں کے امیدواروں کی جماعت ہے، اور ان سب کے پیچھے وہ لوگ ہیں، جن کو ان کے ذریعہ سے دولت حاصل ہوتی ہے۔

بدقسمتی سے لوگوں کی آزادی ابھی لوگوں کی اعانت پر موقوف ہے، لیکن جب کہ ان عہدہ داروں کی ضروریات معاش نے غلامی کو اُن کی زندگی کا سنگ بنیاد بنا دیا ہے، اور ایک فریق ایسا ہے جو اس زندگی پر رشک کرتا ہے، اور اُن کی جماعت میں نہ شامل ہونے کا اُس کو افسوس ہے، تو یہ لوگ کس طرح آزادی کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں؟

لیکن میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ پبلک عہدوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ ان عہدوں پر مامور کئے جائیں، یا اُن کی اُمیدواری کریں وہ خواہ نخواہ ذلیل وحقیر ہو جائیں، مثلاً آزاد حکومتوں

میں جیسا کہ امریکہ کی حکومت ہے، یہی عہدے، حکام کی قوت عزیمت اور فضائل اخلاق کو ترقی دیتے ہیں، کیونکہ تمام قوم اُن کو انتخاب کرتی ہے، اور اسی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ جو حکومتیں جمہوریت کے اصول پر قائم ہیں میں اُن سے بحث نہیں کرتا، میں صرف اُن حکومتوں سے بحث کرتا ہوں جو سرکاری عہدے رعایت، سفارش، یا ذاتی اغراض کی بنا پر دیتی ہیں، اس لئے لازمی طور پر ان حکومتوں میں ہمارے نوجوان، ان عہدوں کی کوشش میں سعی و سفارش سے کام لیتے ہیں اور اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہیں، کیونکہ یہ حکومتیں صرف ایسے اشخاص کی تلاش کرتی ہیں جو اس قدر نرم اور لچک دار ہوں کہ دفتری کاروبار کے ساتھ چپک جائیں، وہ ایسی نرم طبیعتیں چاہتی ہیں جن کو ہر طرف موڑا جا سکتا ہو اور خود اُن کا رُجحان کسی طرف نہ ہو، وہ ایسی سُلجھی ہوئی عقل کی خواستگار ہیں، جو نظامِ حکومت کو معقول صورت میں نمایاں کرنے کے لئے ہر قسم کے دلفریب الفاظ استعمال کر سکتی ہوں۔

میں بعض اوقات دل ہی دل میں یہ گفتگو کرتا ہوں کہ قوم حکام پر اپنے غلام بنا لینے کا جو الزام لگاتی ہے، وہ حکام پر ایک قسم کا ظلم ہے، اس میں حکام کا کیا قصور ہے؟ جبکہ خود قوم نے اپنی باگ اُن کے ہاتھ میں دے دی ہے، باپ اپنے بیٹے کے لئے دوسرے ذرائع معاش کے بجائے بڑے بڑے سرکاری عہدے تلاش کرتا ہے، جس میں کچھ کام کرنا نہیں پڑتا، بلکہ جب تمام لوگ حکومت کے سر پر اپنا بار ڈالنا چاہتے ہیں، تو یہ کس قدر حماقت کی بات ہے کہ خود اپنے آپ کو خاک بناتے ہیں، پھر جب حکام اُس کو پاؤں سے روندتے ہیں تو سب کے سب گھبرا جاتے ہیں، با ایں ہمہ مجھ کو اس سے انکار نہیں کہ سرکاری عہدوں کی جو ایک بہت بڑی تعداد معین ہے، اُن میں سے کسی عہدے کا حاصل کر لینا ہمارے نوجوانوں کے لئے آسان ہے، لیکن خود اپنی ذاتی قابلیت سے قوم میں کسی ذریعہ معاش کا پیدا کر لینا مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ جو تو میں حکومت سے اپنی معاش حاصل

کرنے کی خوگر ہو گئی ہیں، اُن میں نئے نئے کاموں کے پیدا کرنے کی قابلیت بالکل معدوم ہو جاتی ہے، اُن میں صنعت و حرفت اور زراعت تجارت سب کی سب سخت دشواریوں سی چلتی ہیں، دولت مندوں کی جیب سے بہ مشکل روپیہ نکلتا ہے، تمام آزاد پیشے بادشاہ کے گرد گھوم گھوم کر طالب مراعات ہوتے ہیں، لٹریچر اور علوم و فنون سب کے سب شاہی طاقت سے متاثر ہوتے ہیں، اور قومی زندگی کے انحطاط کے ساتھ جو ایک ہی شخص کے اقتدار کا نتیجہ ہوتا ہے، ان میں بھی انحطاط آجاتا ہے، اور حکومت کے ہاتھ سے لقمۂ تر حاصل کرنے کی ضرورت خوشامدیوں اور مصاحبوں کی تعداد کو ہمیشہ بڑھایا کرتی ہے۔

تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ عیب حکومت کی تمام شکلوں میں سے صرف ایک شکل میں پایا جاتا ہی، اور جو قوم حکومت کی اس شکل کو پسند کرتی ہے وہ مجموعی طور پر اس کی مجرم ہے، اور اگر عمّال حکومت کی تعداد میں ایک کا اضافہ یا ایک کی کمی ہو جائے تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوگی، کیونکہ اُن کی ایک عظیم الشان فوج ہے جس کا شمار نہیں ہو سکتا۔

بے شبہ میں خود بھی اس سے ناواقف نہیں ہوں کہ ایک آدمی پوری قوم کی حالت کو بدل نہیں سکتا، لیکن اگر قوم کا ہر فرد اسی مغالطہ کو اپنی دلیل قرار دے کر اپنے آپ کو اُس طوفان کی آغوش میں ڈالدے، جو دوسروں کو بہالے جاتا ہے، تو قومی عزت اور عام آزادی کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی، اگر کوئی قوم تنزل پذیر ہو جائے، اور اُس میں تقلید و اتباع کی وبا پھیل جائے تو ہر اُس انسان کا جو حقیقی طور پر انسان کہا جاسکتا ہے، یہ فرض ہے کہ خود بزرگی اور عظمت کا جھنڈا بلند کرے اور قوم کو اُبھرنے کی دعوت دے، کیونکہ کوئی قوم گر کر اس وقت تک اُبھر نہیں سکتی جب تک وہ اپنی ذاتی قوت کا سرمایہ صرف نہیں کرتی، بہت سے لوگ اپنی قوم کی پست ہمّتی اور دنائت کی شکایت کرتے ہیں، حالانکہ جس چیز نے یہ عام قومی حالت پیدا کردی ہے اُس میں وہ بھی بالواسطہ شریک ہیں، مثلاً ایک شخص خود تو سرکاری ملازمت سے احتراز کرتا ہے، لیکن اپنے بھتیجے یا خاندان کے دوسرے

اشخاص کے لئے وہ اُسی ملازمت کا خواستگار رہتا ہے، اور اس طرح اس نافرجام نقصان میں اُس کا سہیم و شریک رہتا ہے۔

جانِ پدر! میرے یہ خیالات ہیں جن کو میں نے تمہارے سامنے نہایت وضاحت کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے، پس اگر تم کو سرکاری ملازمت کی خواہش ہے تو اس کا ذریعہ تم کو حاصل ہے اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو ذلیل اور حقیر بنا دو، لیکن اگر اس آسان اور جلد حاصل ہونے والے ذریعۂ معاش پر تم اپنی عزتِ نفس، اپنے استقلال ذاتی، اور اپنے شرفِ قومی کو ترجیح دیتے ہو، تو میں تم کو اس پر نہایت خلوصِ قلب کے ساتھ مبارکباد دیتا ہوں، لیکن اس وقت تم کو یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ اب تم کو کیا کرنا پڑے گا؟ کیونکہ تم حکومت کی سرپرستی کو چھوڑ کر اپنے عمل اور اپنی کوشش سے اپنی روزی پیدا کرنے پر مجبور ہوگے، اور اس محنت و مشقت پر کوئی شخص تمہاری تعریف نہ کرے گا بلکہ بہت سے لوگ تمہارے اس دلیرانہ اقدام پر تمسخر کریں گے، آخر جب تم اُن کو اپنے طرزِ عمل سے احمق بتاؤ گے تو وہ تمہاری محبت کیوں کریں گے؟ قوم کی خدمت کرو اور اُس سے صلہ اور شکریہ کی توقع نہ رکھو، کیونکہ اُس کے پاس صلہ دینے کے لئے کیا رکھا ہوا ہے؟ ملک کی دولت، خطابات، اور تمغہ جات وغیرہ اُس کے پاس کہاں ہیں؟ بلکہ اس کے بجائے وہ تمہاری نیک نیتی پر بھی شبہ کرے گی، اس لئے تم کو اس حالت میں صرف اپنے جسمانی اور عقلی قوت پر اعتماد کرنا پڑے گا، لیکن قوم کے اس شک و شبہ سے تم کو بددل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ انسان کی زندگی کا اہم مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی بہت بلند درجہ حاصل کر لے، بلکہ سب سے عظیم الشان مسئلۂ زندگی یہ ہے کہ انسان نے جس کرسی پر جگہ پائی ہے، اُس سے اس کا مرتبہ بلند ہو۔

پانچواں خط

ازامیل بنام ڈاکٹر اراسم

آپ نے خواہش کی ہے کہ میں اپنے درس وتدریس کی حالت سے آپ کو اطلاع دیتا ہوں اس لئے آپ کی خواہش کے مطابق میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ میں جس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہا ہوں اُس کی عمارت بالکل نئی ہے، اور گرمی کے زمانے میں صبح سات بجے سے کھل کر ایک بجے، اور سہ پھر کو تین بجے سے کھل کر ۶ بجے بند ہو جاتی ہے، پروفیسروں کے درس دو قسم کے ہوتے ہیں ایک عام اور دوسرا خاص، پہلے قسم کا درس بالکل مفت دیا جاتا ہے، اور دوسرے قسم کے لئے ہر شش ماہی میں ۵۰ فرنک ادا کرنے پڑتے ہیں یہ یونیورسٹی تمام جرمن یونیورسٹیوں کی طرح چار اختیاری کالجوں میں منقسم ہے، جن میں ایک قانون کے لئے، دوسرا سائنس کے لئے، تیسرا ڈاکٹری کے لئے اور چوتھا الٰہیات کے لئے مخصوص ہے، اوران چاروں کالجوں کی مختلف شاخیں ہیں جن میں مخصوص پروفیسر تعلیم دیتے ہیں۔

یونیورسٹی ہمارے اوقات کے متعلق ہم کو پوری آزادی دیتی ہے، چاہے ہم اُس کو ضائع کریں یا مفید مشاغل میں صرف کریں، کوئی کالج ہمارے کیرکٹر کے متعلق کسی قسم کی نگرانی نہیں کرتا۔ جیسا کہ آپ نے مجھ سے بار بار کہا ہے، میرے نزدیک کامیاب نظامِ تربیت وہی ہے جس کو انسان خود اپنے لئے بنائے اور اُس کی پیروی کرے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہماری یونیورسٹی کے پروفیسر علوم وفنون کے دریا ہیں، لیکن افسوس ہے کہ اثنائے درس میں میں اُن کے سلسلۂ خیالات کی پیروی نہیں کرسکتا جس کے دو سبب ہیں ایک تو یہ کہ خود یہ خیالات ہی واضح نہیں ہوتے، دوسرے یہ کہ چونکہ جرمن زبان میں خیالات کے قائم کرنے کی اب تک مجھ کو عادت نہیں ہوئی ہے، اس لئے میں ان خیالات کے سمجھنے میں دشواری محسوس کرتا ہوں۔

مجھے سخت تعجب ہے کہ اس قدر بلند رتبہ، اور مشہور و معروف علماء کی تنخواہیں نہایت کم ہیں، اُن کی غربت، اُن کی قناعت، اُن کے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں سے جب اس کا پتہ چلتا ہے، تو مجھے اگرچہ تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن میرے دل میں اُن کی علمی فضیلت کے ساتھ ایک اور فضیلت کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے، یہ لوگ علم سے عشق رکھتے ہیں لیکن مال و دولت کے لئے نہیں، بلکہ خود لذت و مسرت کے لیئے۔

بعض پروفیسر فی البدیہ طویل لکچر دیتے ہیں، اور بعض اور اُن ہی کی تعداد زیادہ ہے) اپنے لکچروں کو لکھ کر لاتے ہیں، اور طلباء کو پڑھ کر سناتے ہیں جن کو طلباء سُنتے ہیں اور نوٹ لکھتے جاتے ہیں۔

مذہب کے اعتبار سے دو قسم کے طلباء ہیں، ایک کیتھولک اور دوسرے متعصب پروٹسٹنٹ جن میں بعض اپنے آپ کو وعظ و پند اور خطبہ و تقریر کے لئے تیار کرتے ہیں بعض حکیم ہیں جو تطبیق معقول و منقول کے لئے کوشش کرتے ہیں، تھوڑے سے مادہ پرست بھی ہیں جو صاف صاف کہتے ہیں کہ مذہب کا دور گذر گیا اور اب قرونِ وسطیٰ کے غیر حقیقی خواب و خیال کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

آپ نے میرے ساتھ مذہبی معاملات کے متعلق بحث و مباحثہ سے ہمیشہ احتراز کیا ہے، اور آپ کی اس خاموشی سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ آپ عقائد کے بارے میں مجھ سے استقلال ذاتی کے خواستگار ہیں، لیکن آپ نے میرے سر پر یہ ایک بڑا بوجھ ڈالدیا ہے، کیونکہ بہت سے دقیق مذہبی مسائل کے متعلق اب تک میری کوئی رائے نہیں قائم ہو سکی ہے، بایں ہمہ میں نے ان خیالات کو بالکل نظر انداز نہیں کر دیا ہے، میں نے رات کے سکون میں اکثر اوقات آسمان کو دیکھا ہے، اور باوجود کم سنی اور بے علمی کے کوشش کی ہے کہ اُس کے ستاروں کے ذریعہ سے نظام عالم کی چیستاں کو حل کروں، اور میں نے جس دن سے ملاح کی لاش کو سمندر میں اُتارتے ہوئے دیکھا ہے، میں ہمیشہ یہاں تک کہ خواب میں بھی موت

کی حقیقت پر غور کرتا رہتا ہوں، میں نے فرون سے سوال کیا کہ وہی اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اُٹھائیں، لیکن اُنھوں نے کچھ جواب نہیں دیا، اس بنا پر میں جس دن سے یونیورسٹی میں داخل ہوا وید کے جرمن ترجمہ اور ژنداوستا، اور تورات کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا، جن کا میرے دل پر بہت بڑا اثر پڑا، اور مجھ کو اُن کے اندر ایک نئی دنیا نظر آئی، لیکن اُن تاریکیوں کے درمیان جن کا پردہ ابھی تک چاک نہیں ہوا ہے، میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ ان کتابوں کے مطالعہ میں سر بسجود رہوں یا اس ظلمات سے نکل کر صرف ثابت شدہ علمی نتائج و تحقیقات میں مشغول ہو جاؤں۔

اس وقت میں آپ کی ہدایت کا محتاج ہوں، اور آپ کے سوا کس سے اس قسم کی درخواست کر سکتا ہوں، ؟ تمام طلبا کُشتی اور تیر اندازی[1] کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اور میں بھی دن میں گھنٹہ یا دو گھنٹہ اس کی مشق میں صرف کرتا ہوں، کیونکہ یہ مشق اعضا کی تقویت اور اُن کی نشو و نما کے لئے نہایت مفید ہے، کہنہ مشق طلبا مجھ کو یقین دلاتے ہیں کہ ماہر کُشتی بازوں کو چوٹ بہت کم آتی ہے، اگرچہ مجھے یہ توقع نہیں ہے کہ میں اس فن میں یہاں جارج[2] کا درجہ حاصل کر سکوں گا، تاہم میری خواہش یہ ضرور ہے کہ میں اکھاڑے میں اس بات کا کافی ثبوت دے سکوں کہ مجھ کو ہتھیاروں کے استعمال کا کافی علم ہے، تاکہ طلبا میری بھی وقعت کریں اور مجھ کو حقیر نہ سمجھیں، ان میں اکثر باہم لڑائی ہوتی ہے، اور کبھی کبھی وہ زخمی بھی ہو جاتے ہیں، لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے، اور بفضلہ مقتول تو کوئی نہیں ہوتا، جو طلبا زخمی ہوتے ہیں، وہ بھی اپنے چہرے کے زخموں کی پروا نہیں کرتے، بلکہ عورتیں اس قسم کے زخم خوردہ لوگوں کی تعظیم و توقیر کرتی ہیں۔

---

[1] غالباً بندوق کا نشانہ لگاتے ہوں گے، ورنہ اس زمانہ میں تیر کہاں؟ [2] خرافات کی کہن روایات کے بموجب ایک مشہور پہلوان اور تیر انداز

چھٹا خط

از ڈاکٹر اراسمس بنام امیل

جانِ پدر! تمھاری تربیتِ مذہبی کا جو معیار میں نے قائم کیا تھا، اُس کے قائم کرنے میں اگرچہ میں نے عرفِ عام اور مجاری عادت کی پوری مخالفت کی تھی، لیکن اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ میں عقائد کے بارے میں تم کو کامل آزادی دوں۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی کسی نہ کسی مذہب کی طرف منسوب ہو جاتا ہے اور خود دنیوی حکومتیں اُس کے باپ ماں کو اس کا ذمہ دار قرار دیتی ہیں، کیونکہ خود بچے میں اس قدر قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ملک اپنی قوم اور اپنے خاندان کے رسم و رواج کو چھوڑ کر اپنے لئے کسی مذہب کا تعیین کر سکے، لیکن یہ ایک تحکم اور زبردستی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر باپ ماں ایسا کرتے ہیں، تو وہ تمام قوم کی طرف سے سنِ تمیز کے قبل نیابتہً اپنے بچے کی نگرانی کرتے ہیں، لیکن اگر قوم کا یہ فرض ہے کہ لڑکے کو ایک خاص مذہب کا پابند بنائے تو اُس کا یہ فرض بھی ہونا چاہیے کہ لڑکے کے لئے کوئی پیشہ یا کوئی سرکاری کام متعین کرے، صرف اس بنا پر کہ ہم نے بچہ کو پیدا کیا ہے، اُس کی آزادی کا سلب کر لینا مناسب نہیں، کیونکہ احساس و شعور میں باپ ماں کا اختلاف بچے پر اُن کی ولایت اور نگرانی کو سخت مشکل اور پیچیدہ بنا دیتا ہے، آج باپ ماں کی عام حالت یہ ہے کہ باپ کافر ہوتا ہے اور ماں مومنہ ہوتی ہے[1] ایسی حالت میں اگر یہ دونوں مختلف مذہبی

---

[1] یہ یورپین لوگوں کا خاص مذاق ہے، اور جن مسلمانوں نے اندھا دھند اُن کی تقلید کی ہے اُن کا بھی یہی حال ہے لیکن مسلمانوں کی عام قوم اس سے بالکل مختلف ہے، اُن کے یہاں بی بی، میاں بلکہ آقا اور غلام تک اکثر ایک ہی مذہب کے پابند ہوتے ہیں۔

موٹر باہم ٹکرائیں تو بچے کا کیا حال ہوگا؟ میں کہتا ہوں کہ وہ اس زمانے کے لوگوں کی طرح مجبور اور سرگشتہ ہو جائے گا، میں اکثر نوجوانوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ ایک طرف تو پرستارانِ مذاہب کے چیتھڑوں سے اپنے پھٹے ہوئے ضمیر پر پیوند لگاتے ہیں اور دوسری طرف اُس کو آزاد خیال فلاسفہ کے دھاگے سے سیتے ہیں، مجھے نوجوانوں کا ایک گروہ اور بھی ملتا ہے جو شکوؤں سے لبریز ہے اور اُس کو اپنا راستہ نظر نہیں آتا، لوگوں میں تناقض اور اختلاف بڑھ گیا ہے، اور پریشانی، اور سرگردانی عام ہو گئی ہے۔

لیکن تم خدا کے فضل سے ان مصائب میں مبتلا ہونے نہیں پائے، کیونکہ ہمارا اور تمہاری ماں کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ ہم موقع تلاش کر کے تمہاری عقل پر غفلت کی نیند طاری کر دیں، اور تمہاری رضامندی کے بغیر تم کو اپنے مذہب کی پابندی پر مجبور کریں، اگرچہ تمام لوگوں کی طرح آسمانی اور فلسفیانہ مذاہب کے متعلق میری بھی ایک رائے ہے، لیکن تم نہ اُس کے پابند ہو، اور نہ تم کو اُس کی پروا کرنی چاہیئے۔

"اپنے باپ ماں کی عزت کرو" لیکن فرماں بردار صرف اپنے دل کے رہو، تم آزاد ہو، اور تمہارا حق ہے کہ ہمت، جرأت اور خلوص کی مدد سے حق کی تلاش میں اُس کے پیچھے پیچھے دوڑتے رہو، آج تک یہ دوڑ دھوپ تمہارے احاطۂ قدرت سے باہر تھی، لیکن اب وہ تمہاری عمر بھر کا مشغلہ ہو جانا چاہیئے۔

تمہارا فرض ہے کہ اِن اہم مسائل کے اختیار کرنے سے پہلے اُن پر بحث و مباحثہ کر لو، کیونکہ جو لوگ بغیر غور و فکر کے کسی آسمانی یا فلسفیانہ مذہب کو چھوڑ دیتے ہیں، اُن کی حالت بھی اُن ہی لوگوں کی سی ہے جو بغیر غور و فکر کے ایک مذہب کو تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں، اور سب سے زیادہ تمسخر انگیز نوجوان ڈاکٹروں کی یہ دلیرانہ بے حیائی ہے، ڈیکارٹ، اسپنوزا یا سکال لائبنز اور ہیگل نے جن مسائل کی اسٹڈی

کی ہے، وہ اُن کی توجہ کے قابل نہیں، ان میں جو لوگ زیادہ جاہل اور غبی ہیں، وہ نہایت بلند آہنگی کے ساتھ کہتے ہیں کہ "وجود باری اور بقائے روح جیسے لاینحل مسائل کی تشریح میں ہم اپنا وقت کیوں ضائع کریں؟ ہمارے مشغلے کے لئے صرف علم کافی ہے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ علم اس وقت مذہبی معاملات کی تجدید کر رہا ہے، اور ایک ایسے راستے پر چل رہا ہے، جو مذہبی طریقوں سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ وہ حوادثات پر تجربانہ بحث کے ذریعہ سے حق الیقین تک پہونچنا چاہتا ہے وہ حق الیقین جس کو اہل مذاہب صرف خداوند تعالیٰ کی ہدایت سے حاصل کر سکتے تھے، اگرچہ اس علمی بحث کے نتائج تو بہ مشکل معلوم ہو سکتے ہیں تاہم میرا یہ یقین ہے کہ علم نے حق تک پہونچنے کا جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ نہایت سیدھا ہے، اگر ہم علم کی موجودہ حالت پر غور کریں تو اُس کی عام حالت یہ نظر آئے گی کہ اُس نے مہمات مسائل کے متعلق ہم کو بہت کم فائدہ پہونچایا ہے، کیونکہ اگر ہم علم ترکیب الحیوان اور علم طبقات الارض کو مستثنےٰ کر لیں تو علومِ صحیحہ میں سے کوئی ایسا علم نظر نہیں آتا جس نے آج تک عِللِ اولیہ میں سے کسی عِلّت کے چہرے سے پردہ اُٹھایا ہو، علم ترکیب الحیوان نے تو بے شبہ بعض خصائص انسانی کی جن کے متعلق اہلِ مذاہب مختلف الرائے تھے تشریح کی ہے، اور علم طبقات الارض نے منشائے زندگی کو کسی قدر نمایاں کیا ہے، لیکن ان کے علاوہ اور تمام علوم کشف حقیقت میں ناکامیاب ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عِللِ اولیہ خود عقل کی دسترس سے باہر ہیں، اس لئے اُن سے تعرض ہی نہیں کرنا چاہیے، لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہ کہ ہزاروں برس کے بعد انسان کو جو تجربات حاصل ہوئے ہیں، اُنھوں نے قوائے بشری اور ملکاتِ انسانی کو محدود کر دیا ہے؟ یا یہ کہ ہم کو ہر حال میں ان نامعلوم باتوں پر پردہ ڈال دینا چاہیئے، تاکہ عقلی حرص سو جائے، اور علمی شوق کی آگ بجھ جائے؟ لیکن میں ان باتوں

میں سے کسی کو نہیں مانتا، بلکہ میرے نزدیک انسان جہل اور لاعلمی کے سامنے آسانی کے ساتھ ذلیل نہیں ہو سکتا۔

اگر پیچیدہ مسائل سے صرف یہ کہکر چھٹکارا حاصل ہو جاتا کہ وہ ایک عقدۂ لاینحل ہیں، تو نہایت آسانی کے ساتھ اُن کے شکنجے سے رہائی حاصل کرلی جاتی، انسان کے سوا تمام زندہ مخلوقات صرف جسمانی نشو ونما کی خواستگار ہوتی ہے، صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے، جو مادی ضرورتوں سے آگے ارتقائے فکری کو اپنا مطمح نظر قرار دیتا ہے، ارتقائے فکری کی اس خواہش کا نام خیال رکھو یا اُس کو مذہبی فطرت سمجھو، لیکن انسان میں بہرحال یہ خواہش موجود ہے، اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ جو لوگ اس خواہش کو مٹانا چاہتے ہیں اُن کو اس سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے، یہ کس کے بس میں ہے کہ انسان کے نفس سے "شعریت" کو جدا کردے، ہماری قوتِ فکریہ جن امور کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے، اُن کو صرف اس بنا پر وہم وفریب نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہماری عقل میں نہیں آسکتے لیکن اگر ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ خالص عقلی باتوں کو اوہام اور وساوس سے الگ کرلینا چاہیئے تو بے شبہ یہ ایک نہایت مفید بات ہے، لیکن خالص مدرکات عقلی سے تعرض نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ بچوں کی تربیت میں اُن کا بھی خاص ایک درجہ مقرر ہونا چاہیئے۔

اس تقریر سے تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ حکمت اور علم کو ساتھ ساتھ پایا جانا چاہیئے، اور اختلاف وتناقض کو اُن سے دور رکھنا چاہیئے، کیونکہ تعاضد اور تعاون ان دونوں کی مخصوص شان ہے، جو لوگ آسمانی اور فلسفیانہ مذاہب کی تعلیم کو مٹا دینا چاہتے ہیں وہ نامعلوم طور پر ایک انتقامانہ خواہش کو پورا کر رہے ہیں، اُن کو نظر آتا ہے کہ اس زمانہ میں فلاسفہ اور پیشوایان مذہب، انتہا درجہ کا ظلم کرتے ہیں، اپنے ضمیر کو بیچتے ہیں، اور بدترین افعال کے مرتکب ہوتے ہیں، اور ان کی یہ بداخلاقیاں اس حد تک پہونچ گئی ہیں کہ عقل صرف اُن کی سیرت سے نفرت ہی کرنے پر راضی نہیں ہوتی بلکہ کلیۃً اُس کا انکار کر دیتی ہے، اس لئے

پادری لوگ الحاد اور بے دینی کی دعوت دیتے ہیں، مادہ پرست لوگ نہیں دیتے، الحاد کو کیوں اس قدر خطرناک چیز خیال کیا جاتا ہے، وہ بے چارہ تو خود احساس انسانی کے سامنے کانپتا رہتا ہے، اصلی گناہ اُن لوگوں کا ہے جو جرائم کا ارتکاب کرکے اوپر سے مذہب کی چادر اوڑھ لیتے ہیں، یہی وہ گناہ ہے جس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے دنیا کو تہ وبالا اور اُس کے حالات کو درہم برہم کر دیا ہے ایسا کون شخص ہے، جو ان جرائم کے ارتکاب کے وقت اُس نمائشی شان وشوکت سے متحیر نہ ہو جائے جو اُن گنہگاروں کے عقائد کے ذریعہ سے اُن لوگوں کے اندر سرایت کر جاتی ہے، جو اُن کے اثر واقتدار پر غاصبانہ قبضہ کر لیتے ہیں، بعض فلاسفہ کو جب یہ نظر آتا ہے کہ بدی نے نیکی پر قبضہ کر لیا ہے، تو وہ بآواز بلند پکار اُٹھتے ہیں، "اگر ہمارا کوئی خدا نہ ہوتا تو یہ خدائے ظالم کے وجود سے بہتر ہوتا"[ل]

بہت سے لوگ ان مذاہب پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ اُنھوں نے نظام عالم کے اسرار وغوامض، خیر وشر کی جنگ وجدال اور جبر واختیار جیسے اہم مسائل کو تشفی آمیز طریقہ پر نہیں بیان کیا، بے شبہ یہ سچ ہے لیکن با ایں ہمہ ان مذاہب نے انسان کی قوتِ فکریہ کو عرش تک پہونچا دیا ہے، دنیا کی حالت بدل دی ہے، لوگوں کو عجیب وغریب علوم وفنون اور نوادر ولطائف کی تعلیم دی ہے، اگر یہ مذاہب نہ ہوتے تو یہ تمام چیزیں کتم عدم سے باہر نہ آتیں، بہت سے لوگ بچوں کی تعلیم سے عیسائی مذہب کا عنصر بالکل خارج کر دینا چاہتے ہیں، لیکن ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا ہے کہ ہمارے لٹریچر، ہمارے اخلاق، اور ہماری عادت پر اس مذہب نے کس قدر اثر ڈالا ہے، وہ لوگ کہتے ہیں کہ عیسائی مذہب ایک ناپاک خواب ہے، جس کو انسان نے نیند کی حالت میں دیکھا ہے، اور دورِ تنزل اور دورِ وحشت میں اس مذہب

ل لیکن ان لوگوں نے سننِ الٰہیہ کو نظر انداز کر دیا ہے اور ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ برائی صرف اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ لوگوں نے ان سنن کو چھوڑ دیا ہے، اس لئے یہ برائی خود اُن کی پیدا کی ہوئی ہے، خدا خود فرماتا ہے "وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ"، "وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ"

نے پیدا ہو کر قوم کی روح کو جہالت کے ظلمت کدے میں مقید کر دیا ہے یہ تمام باتیں قابلِ بحث و نظر ہیں، لیکن ان سے بھی افسوس ناک بات یہ ہے کہ کسی شخص کو یہ یقین دلایا جائے کہ خیالات کا جو طوفان یہ مذہب اپنے ساتھ لایا، اور اُس کے ذریعہ سے دنیا کی کایا پلٹ دی، اُس وقت اُس کے وجود کی کوئی ضرورت اور اس ضرورت کا کوئی سبب موجود نہ تھا، اس مذہب نے برا بھلا جیسا بھی تمدن پیدا کیا ہو، لیکن بایں ہمہ میں تم کو اُس کی تعلیم کی دعوت دیتا ہوں، اور اُس کے ساتھ اس پر بھی آمادہ کرتا ہوں کہ اس مذہب کی تعلیم خود اُس کے اصل مأخذ سے حاصل کرو، کیونکہ خود انجیل کے مطالعہ کا نتیجہ اُس تعلیم سے مختلف ہوگا جو پیشوایانِ مذہبی دیتے ہیں، مثلاً تم کو انجیل کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ مسیح علیہ السلام ہمیشہ اعمالِ ظاہرہ کی پابندی سے انکار کرتے رہے، اور سبت، روزہ، اور کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے اور اس قسم کے دوسرے شرعی امور کی مخالفت کر کے یہود کے تیر ملامت کا نشانہ بنے رہے، اگر انجیل کے بعض مواعظ کو سُن کر انسان کا دل کانپ اُٹھتا ہے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، مسیح علیہ السلام صرف اس لئے آئے تھے کہ لوگوں کے سامنے چھوٹوں کی عزت اور کمزوروں کی حیثیت کا اعلان کریں، اور لڑکوں کی عزت، اور زانیہ عورت کی محبت کی دعوت دیں، اس کے علاوہ اور کسی کتاب میں کسی مصیبت زدہ شخص کی طرف اس قدر محبت آمیز میلان، اور کسی ذلیل و خوار شخص کے لئے اس قدر لطف و کرم نہیں پایا جاتا، اسی کے ساتھ اس کتاب کے علاوہ اور کسی کتاب میں منکر، خود غرض، اور تفوق پسند لوگوں کے لئے اس قدر ناکامی اور مایوسی بھی نہیں پائی جاتی چونکہ وہ خود فقیر تھے اور فقیروں سے محبت رکھتے تھے، اس لئے ہمیشہ اپنی دھمکیوں، اور اپنی کہاوتوں کو دولت مندوں پر چسپاں کرتے رہتے تھے۔

مسیح علیہ السلام کی اس اخلاقی تعلیم کے ساتھ آج یورپین قوموں کے مدارج میں جو فرقِ مراتب پایا جاتا ہے، حسب و نسب کی فوقیت کی جو تائید کی جاتی ہے اور فقر و امارت میں جو اختلاف نظر آتا ہے، وہ اُس حد اعجاز تک پہونچی ہوئی خدا عانہ حالت کا نتیجہ ہے جس میں

یورپین لوگ مبتلا ہیں، آج جو قوم اپنے آپ کو عیسائی کہتی ہے، اور اپنے آپ کو دینِ مسیح کا معتقد سمجھتی ہے، اُس کے دل میں ایمان نے مطلق بار نہیں پایا ہے۔

اگر کوئی چیز اپنے وجود کے اوقات میں سے کسی خاص وقت میں معلوم ہو جائے تو اس کا نام علم نہیں ہے، وہ صحیح طور پر صرف اُس وقت معلوم ہو سکتی ہے، جب اُس کی اصل، اُس کی تاریخ، اور اُس کا آغاز و انجام معلوم ہو، حوادثاتِ عالم پر اس ترتیب کے ساتھ بحث کی گئی، تو نئے نئے علوم پیدا ہو گئے اور تم تعلیم مذاہب پر بھی اسی طریقۂ بحث کو منطبق کر سکتے ہو، اگر تم نے نیک نیتی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا تو مجھے اس سے کچھ بحث نہ ہوگی کہ تمھارے نتائج بحث صحیح ہیں یا غلط، میں زیادہ سے زیادہ تم سے یہ خواہش کروں گا کہ اصول کو صرف اس بنا پر قبول نہ کرلو کہ وہ صحیح تسلیم کئے جاتے ہیں، بلکہ خود اُس کی صحت پر اپنے نفس کی شہادت حاصل کرو۔

میں تم سے یہ کہتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں تم سے ایک امر اہم کی توقع رکھتا ہوں، لیکن تمھاری رہنمائی، اور روشنیِ قلب کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں، بے شبہ دنیا میں بہت سے مستند علماء ہیں، جو مذہبی، فلسفیانہ، سیاسی اور اخلاقی عقائد کی تعیین و تحدید کرتے ہیں اور تمام لوگوں کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تقریباً نصف طلباء دوسرے افراد کے دماغ سے غور و فکر کرنے کے خوگر ہو گئے ہیں، لیکن با ایں ہمہ صرف ایک چیز ہے جن کی تعلیم تم اُن کے مدرسے میں نہیں حاصل کر سکتے، اور وہ چیز علم الحریت ہی، اگر تم آزادی چاہتے ہو تو اپنی تمام استدلالی اور نظری سر و سامان کی مدد سے حق کو خود اپنے اندر تلاش کرو، اس وقت تم کو متعدد بار باوجود کافی حفاظت اور ہوشیاری کے یہ معلوم ہوگا کہ دوسروں کی رائیں بعینہ تمھاری رائیں ہیں، اور قبل اس کے کہ تمھاری غلطیاں معلوم ہوں تم متعدد مسائل میں غلطیاں کرو گے، لیکن تم کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ عقلی غذا جسمانی غذا کی طرح بغیر محنت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔

نواں خط

از امیل بنام ڈاکٹر راسم

استقلال علمی، فلسفۂ تخلیق عالم، فلسفۂ اجتماع، اور فلسفۂ تمدن، عقل پر اعتماد نہ کہ خطابت پر

حبِ وطن

میں نے شہر "ین" کو چھوڑ دیا اور تقریباً اپنی تمام مملوکہ کتابیں شہر ہنڈ بنرگ کو منتقل کر دیں۔ جرمنی میں یونیورسٹی کالجوں کے نظام کے مطابق طلبار بے تکلف ایک یونیورسٹی سے دوسری یونیورسٹی کے کالجوں میں منتقل ہو سکتے ہیں، اور اس سے اُن کی کسی قسم کی حق تلفی نہیں ہوتی، بلکہ اس ردوبدل سے طلبار کو یہ فائدہ پہونچتا ہے کہ علوم وفنون کی ہر شاخ کے متعلق وہ بہترین پروفیسروں کا لکچر سن سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ان پروفیسروں کے مفید لکچروں سے میں نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے، لیکن مجھ پر ہر روز یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے، کہ مدارس کی تعلیم ایک جویائے حق کے لئے خود اُس کی اندرونی اور ذاتی تحقیقات کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

دو مختلف مذاہب ہیں، جو علم، حکمت، مذہب، اور سیاست ہر جگہ پائے جاتے ہیں، پہلے مذہب کا اقتضاء یہ ہے کہ عالم مجبورِ محض بنا کر پیدا کیا گیا ہے، یعنی ارادۂ ازلیہ نے ہر دنیوی چیز کی تخصیص کر دی ہے، اور زندہ مخلوقات کی زندگی کی شکلیں غیر متبدل اور غیر متغیر ہیں، دوسرے مذہب کا منشا یہ ہے کہ عالم مختار بنا کر پیدا کیا گیا ہے، یعنی مخلوقات کی تولید عدمِ محض سے نہیں ہوئی ہے، بلکہ مختلف تغیرات وانقلابات نے اُن کو پیدا کیا ہے، قوا، خود بخود نہیں پیدا ہو گئے، بلکہ اُنھوں نے درجہ بدرجہ نشو ونما حاصل کی ہے، تمام نباتاتی اور حیوانی نوعیتیں

ہمیشہ قائم رہیں گی، لیکن قانون فطرت کے مطابق اُن میں تغیر و ترقی ہوتی رہے گی۔

علم کو چھوڑ کر اگر تاریخ کو لیا جائے تو وہاں بھی لوگوں کی رائے میں بعینہ یہی اختلاف نظر آتا ہے یعنی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تمدن ایک قدیم چیز ہے جو انسان کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا جس کے معنے یہ ہیں کہ خود خدا نے اُس کو پیدا کیا، انسان نے پیدا نہیں کیا، اس لئے خود کوئی قوم تمدنی اصول و قوانین کا انتخاب نہیں کر سکتی بلکہ وہ ایک فطرتی چیز ہیں، خود حکومت کی جو شکل مقرر ہے کوئی قوم اُس وقت تک اُس سے انحراف نہیں کر سکتی جب تک انارکسٹانہ مطلق العنانی کے غار میں گر نہ جائے۔ لیکن دوسرے لوگوں کے خیال کے مطابق انسان وحشیانہ شکل میں پیدا ہوا، پہلے وہ ایک ترقی یافتہ بندر تھا، پھر حیوانوں کے گروہ سے الگ ہو کر اُس نے نئی آبادی کے اپنے لئے قوانین بنائے، اپنا ذریعہ معاش متعین کیا، اور خشکی میں اپنا درجہ قائم کیا، تو مولانے اپنی نشو و نما کے دور میں بہت سے ابتدائی اصول اختیار کئے پھر نہ رُکنے والی ترقی کے اثر سے چند ہی روز میں اُن کو چھوڑ کر الگ ہو گئے، غرض جس طرح زمین خود بخود پیدا ہوئی بعینہ اسی طرح انسان بھی پیدا ہوا اور اپنی قوتِ ذاتی سے اپنی سوسائٹی قائم کی۔

مذاہب پر نظر ڈالو، اور اُن کے شراح کے اقوال کی تصدیق کرو تو تم کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ تمام مذاہب الہامی ہیں، لیکن اُن کے مخالفین کی رائے میں وہ ایک طبعی چیز ہیں، اور عام عقل انسانی کے مدرکات میں داخل ہیں، اور اگر میرے اہل وطن کی سیاسی رائے دریافت کرو تو اختلاف کی یہ خلیج اور وسیع ہو جائے گی۔

ان تمام اختلافات سے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ غیروں کے افکار و خیالات پر بحث کرنے کے ساتھ مجھ کو صرف اپنی عقل اور اپنے ضمیر پر اعتماد کرنا چاہیئے، یہی راستہ ہے جس پر میں نے چلنے کا ارادہ کیا ہے، اور آپ نے بھی مجھ کو یہی روش سکھائی، لیکن فیصلہ کی یہ مجبور کن ضرورت مجھ میں فخر و غرور کا مادہ نہیں پیدا کر سکتی، بلکہ عجز و خاکساری کا مادہ پیدا کرتی ہے کیونکہ اس طریقہ سے مجھے مجبوراً ہر وقت اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا، اور اس حالت میں

مجھ پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ میں دلیرانہ قدم آگے بڑھاؤں، اپنے علم کا دائرہ وسیع کروں، اور واقعاتِ عالم پر غور و فکر کر کے یقینی مقدمات قائم کروں، لیکن براہین خطابیہ جن کی نسبت کسی زمانے میں میرا یہ اعتقاد تھا کہ میں اُن کے ذریعہ سے وہ باتیں جان سکتا ہوں جو دنیا میں کسی کو نہیں معلوم ہو سکتیں آج اُن ہی کے متعلق مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ اُس سیپ سے بہت کچھ مشابہ ہیں جن کو لڑکے اپنے کانوں پر رکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کے اندر سے سمندر کے تلاطم و تموج کی پر شور صدائیں آتی ہیں۔

لیکن میری یہ تعلیم اور میری یہ بحث اس لئے نہیں ہے کہ میں ایک عالم بن جاؤں میری تمام تر خواہش یہ ہے کہ میں جس زمانے میں زندگی بسر کر رہا ہوں اُس کی ضروریات کو سمجھ لوں اور حق کی تائید کروں۔

یہ ایک نہایت افسوس ناک بات ہوگی کہ میں خود اپنے ملک کو بھول جاؤں، یا اُس کی کشمکش کی پروا نہ کروں، میں اگرچہ ایک اجنبی ملک میں پیدا ہوا، لیکن میں جس طرف نگاہ ڈالتا ہوں، مجھے اُن طویل الذیل لڑائیوں کے درمیان جو فرانس نے دنیا کے گوشے گوشے میں کیں، فرانس ہی فرانس نظر آتا ہے، یہ وطن جس کو میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا وہ میری دوسری ماں ہے، اس لئے جب اس کا ذکر آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور جب اُس کی تنقیص کی جاتی ہے، تو جذبۂ انتقام سے میرا خون جوش کھانے لگتا ہے، میں اُس کے جنگی کارناموں کی بنا پر اُس کا فریفتہ نہیں ہوں، بلکہ آزادی کی راہ میں اوس نے جو دلیرانہ مقابلہ کیا ہے، اُس نے مجھے اپنا شیفتہ بنا لیا ہے۔

دسواں خط

از ڈاکٹر اراسمس بنام ایمیل

نوجوان طلباء کے لئے اپنے ملک کی سیاست کے متعلق ایک رائے رکھنا ضروری ہے

جانِ پدر! تم کو بغیر ایک سیاسی رائے کے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، جو شخص کسی قوم کے درمیان اوس کے مصالحِ عامّہ سے الگ، اور اُس کے مسالکِ عقلی سے بے پرواہو کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، وہ اس قدر بتذل آدمی ہے، کہ اُس کو وحشیوں میں جا کر رہنا چاہیئے، بلکہ غیرت و حمیت کی بنا پر خود وحشی لوگ بھی اپنے قبائل کے مصالح میں حصّہ لیتے ہیں، بے شبہ قدیم زمانے میں اولیائے حکومت نے لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ سیاست اور حکمت عملی میں خدا کی طرف سے مبعوث ہو کر آئے ہیں، اور اس لحاظ سے رعایا کا فرض عام اُن کے احکام کی اطاعت اور فرماں برداری تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، اور وہ اُسی طرح اُن کی ملک میں گئے تھے، جس طرح زمین پر حقِ مالکانہ حاصل ہو جاتا ہے، اور اُس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ کاشتکار کے خلاف شورش اور بغاوت کرے، لیکن اب تمام روشن خیال اور تعلیم یافتہ ملکوں میں چند افراد کے سوا کوئی شخص بادشاہوں کے اس خدائی حق کی حمایت نہیں کرتا، جو سیاسی مذاہب قوانین الٰہی سے ماخوذ ہیں، خود عقل نے بھی اُن کے خلاف فیصلہ کیا ہے، اور تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ بہت سے بادشاہ تختِ سلطنت سے اُتار دئے گئے اور تائیدِ الٰہی نے اُن کی حمایت میں اپنا ہتھیار نہیں اُٹھایا۔

بہر حال جن ممالک میں سلطنت کی داغ بیل اس اصول پر ڈالی گئی ہے، وہاں کے بوڑھے لوگ بزدلانہ حرص و طمع کی بنا پر اپنے نوجوانوں کو سیاسیات میں حصّہ نہ لینے کی نصیحت کرتے ہیں، اور باپ بیٹے سے کہتا ہے کہ "بیٹا! دولت مند بنو، شادی کرو، شہرت حاصل کرو، اور

اس کے علاوہ تم کو کسی چیز میں حصہ لینے کا حق حاصل نہیں ہے، کیونکہ ایسے اشخاص موجود ہیں جن کو حاکم نے اپنی مرضی سے تمام معاملات و مقدمات کے فیصلہ کرنے اور لوگوں کو سزا و جزا دینے کا مجاز کر دیا ہے، پس جیسا کہ تورات میں مذکور ہے ان لوگوں کے نتھنوں کی سانس نظام و ضابطہ کے مخالفین کے مال و دولت کو اس طرح جلا دیتی ہے، جس طرح بادِ سموم کھیتوں کو، اس بنا پر تمہارے لئے محتاط طریقہ یہی ہے کہ حکومت کو اپنے طرز عمل میں آزاد چھوڑ دو، اور اگر تم کوئی سیاسی رائے رکھنا ہی چاہتے ہو تو ایسی روش اختیار کرو جو خود سلطنت کی موافق ہو اور اُس کو سلطنت ہی تک محدود رکھو، کیونکہ دوسرے کے مصالح کی فکر میں پڑنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا"۔

لیکن آزاد قوموں کی حالت بالکل اس سے مختلف ہے، یہاں تک کہ اُن میں جو طالب العلم تھوڑی بہت تقریر بھی کر سکتا ہے، وہ لازمی طور پر مصالح عامہ کی بحث میں حصہ لیتا ہے، اور جب کوئی آدمی، شریف آدمی بن کر نمایاں ہونا چاہتا ہے تو اُس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ کسی سیاسی پارٹی کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے، وہ لوگ اس کو بالکل تسلیم نہیں کرتے کہ سیاسی جد و جہد سے خانگی زندگی کو کسی قسم کا نقصان پہونچتا ہے، بلکہ مخصوص اوصاف جس قدر عام اور پبلک ہوتے ہیں، اُسی قدر وہ لوگ اُن کی عظمت کرتے ہیں، یہاں تک کہ اگر عدل و انصاف کو بھی مخصوص معاملات تک محدود کر دیا جائے تو یہ اُن کے نزدیک عام لوگوں کے حق میں ایک ظلم ہوگا اس تمہید کے بعد میں کہتا ہوں کہ تمام قومیں آزاد رہنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں، اور یہ خیال کرنا فضول ہے، کہ بعض قومیں نہایت مشتعل اور تیز طبع ہوتی ہیں بعض ضرورت سے زیادہ بہادر اور غیور ہوتی ہیں، بعض انتہا درجے کی احمق ہوتی ہیں، اور بعض نہایت عیش پسند اور رنگیلی ہوتی ہیں، کیونکہ قوموں کی اخلاقی ترقی کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ اُن کے نظام، ضابطہ اور قوانین کو ترقی دی جائے، اور یہ مسلم ہے کہ یہ قوانین جن کی بنیاد آزادی کی سطح پر رکھی گئی ہے آسمان سے نہیں اُترتے، اور خود حکام

سے بھی اُن کی توقع کرنا حماقت ہے، کیونکہ تمام استبدادی حکومتیں صرف اس اصول پر قائم ہیں کہ لوگ خود اپنے اوپر حکومت نہیں کر سکتے، اس بنا پر حکام اس قاعدہ کو چھوڑ کر خود اپنے آپ کو کیونکر جھٹلا سکتے ہیں؟ کبھی کبھی حکام نہایت ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ قوموں کی باگ ڈھیلی بھی کر دیتے ہیں، لیکن اُن کو یہ معلوم رہتا ہے کہ بوقت ضرورت کیونکر اُس کی لگام کو دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں، آزادی کی کوئی قسم بطور عطیہ کے نہیں ملتی، بلکہ جد وجہد اور مقابلہ ومقاتلہ سے حاصل ہوتی ہے، یعنی عقل وارادہ کا مقابلہ، گمنام مخلصین کا خلوص، اور غیور لوگوں کی آن بان، ایسی چیزیں ہیں جو جبراً وقہراً حق آزادی کو غاصبین حقوق آزادی کے ہاتھوں سے چھین کر اُس کے اصلی مستحقین کو دیتی ہیں، اور اس جد وجہد کے زمانے میں جو سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں وہ زائل ہو جاتی ہیں، اور اس کے بعد جو ترقیاں حاصل ہوتی ہیں وہ باقی اور قائم رہتی ہیں، میرے لئے وہ زمانہ بالکل تکلیف دہ نہیں ہے جس میں کوئی قوم حصول آزادی کے لئے تگ ودو کرتی ہے، تکلیف دہ صرف وہ زمانہ ہے، جس میں وہ آزادی کے بغیر آرام وآسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔

میرے ہمسن وہ لوگ ہیں جنھوں نے آزادی کی راہ میں اپنے آپ کو قربان کر دیا ہے، اور میں دل سے یہ چاہتا ہوں کہ جدید نسل اس معاملہ میں اُن سے بھی زیادہ خوش قسمت اور اُن سے بھی زیادہ قابل رشک ہو، البتہ اُن کو ہماری لغزشوں اور ہمارے تجربوں سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔

ہم نے انقلاباتِ زمانہ سے جو توقعات قائم کی تھیں وہ مبالغہ آمیز تھیں، اور میں نے جب جب اپنے دل سے اپنی مصیبتوں کا سبب دریافت کیا، تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہماری سیاسی تربیت کا قصور ہے، ہم میں سب سے زیادہ بے ایمان وہ شخص ہے جو معجزہ پر ایمان رکھتا ہے، کیونکہ اُس کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی حاکم مطلق، یا کم از کم کسی حاکم کی کونسل سے قومی انقلاب کا فرمان مل سکتا ہے، میں نے فرانس میں بار بار یہ دیکھا کہ جن شاہی

خاندانوں کا استحکام مسلم تھا وہ فنا ہو گئے، جو لوگ مستقبل کو شدّت حرص سے اپنی ملک بنا لینا چاہتے تھے، اُن کے مقاصد و اغراض ضائع ہو گئے۔ اس کے بعد جب فرانس نے اپنی بے نتیجہ جنگ چھیڑی تو خود اپنی آزادی اور اپنی نجات سے زیادہ اُس نے اُن اشخاص کی تلاش و جستجو میں وقت صرف کیا جن کے ہاتھ میں باتفاق عنانِ حکومت دی جائے، حالانکہ اس قسم کے اشخاص کچھ بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، حقیقی چیز یہ ہے کہ خود تمام قوم اور تمام قوم کے مختلف فرقے اپنی آزادی کے حاصل کرنے کا سبب بنیں۔

دنیا میں جب شر و فساد کا ظہور ہو تو انسان پر فرض ہے کہ اُس کے سبب کے ازالہ کے لئے ہر ممکن کوشش کرے، ایک نیک آدمی کے لئے صرف یہ فخر کافی نہیں ہے کہ اُس کے لئے ایک دوسرا عالم خیال موجود ہے، جس میں اُس کے معتقدات سربمہر محفوظ ہیں اور وہ اوپر سے نہایت حقارت کے ساتھ حوادثاتِ عالم کو جھانک کر دیکھ لیتا ہے، اُن کے مقابلہ کے لئے کسی قسم کے ہتھیار نہیں جمع کرتا، لیکن اس قسم کی مجبوری کوئی قابلِ لحاظ چیز نہیں ہے، ایک مشہور انشا پرداز کا یہ فقرہ تمھیں معلوم ہے کہ "مغلوب لوگ بالکل نہتھے نہیں ہو جاتے" مغلوب قوموں کے ہاتھ میں جو ہتھیار باقی رہ جاتے ہیں وہ تقریر و خطابت، اشاعتِ خیالات اور روحانی اور اخلاقی مقابلہ، ہیں، اور جب تک کوئی قوم خود عجز و درماندگی کے سامنے سر نہیں جھکا دیتی حکومت بھی اُس کے سامنے سر نہیں جھکاتی، یہ سچ ہے کہ حکومت رات بھر کے وقفہ میں اُن کے تمام حقوق و اموال چھین لے سکتی ہے، اپنے خلاف نفرت پھیلانے والوں کو اُن سے علحدہ کر سکتی ہے، معمولی درجے کے لوگوں کو دھمکا سکتی ہے، اور نادانوں کو فریب دے سکتی ہے، لیکن بااینہمہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اُس کی فتح نہیں ہے، وہ صرف اُسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب شرف انسانی کی روح کو بالکل فنا کر دے، بالکل سچ تو یہ ہے کہ آیندہ آزاد ہونے والی قوم صرف استبدادی حکومت کی آغوش میں پرورش پاتی ہے۔

اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ ہر شخص سیاسی کام کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے، لیکن ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اپنے زمانہ اور اپنے ملک کے پبلک کاموں کے متعلق اپنی ایک رائے رکھے، میں تم کو اپنی رائے اور اپنے گزشتہ اعمال کی پیروی پر مجبور نہیں کرتا، ہر نسل کو اپنا کام خود اپنی قومی ضروریات کے مطابق خود ہی کرنا چاہیئے، البتہ تم کو یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ تمہارے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ قدیم اصول وضوابط پر اعتراضات کر کے اُن کی بنیاد متزلزل کر دو، بلکہ علمی حیثیت سے تم پر اُس کا بطلان یا اُس کی عدم ضرورت ثابت ہو جانی چاہیئے اگر تم اپنے حریف پر غالب آنا چاہتے ہو تو اُس سے زیادہ نیک اور اُس سے زیادہ روشن خیال بنو۔

دورِ تنزل میں تمام لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ لوگوں کی روحیں افسردہ ہو گئی ہیں، ہر شخص اپنا بوجھ دوسرے کے سر پر رکھنا چاہتا ہے اور ہر شخص ضروریات وحالات کا حماقت آمیز طریقہ پر فرماں بردار بن جاتا ہے، لیکن خود یہ شکایت کرنے والے ہی اس حالت کے پیدا کرنے والے ہیں، ان میں سے ہر شخص اس عام تباہی میں شریک ہے، کوئی اس لئے کہ وہ بوقت ضرورت خاموش رہا، اور کوئی اس لئے کہ اُس نے اپنے لئے کسی کام کا انتخاب نہیں کیا، لیکن اسی زمانے میں غیور روحوں کو مضبوط اور ثابت قدم بننے کا موقع بھی ملتا ہے، پس اگر ہم اپنے اندر قوت اور استعداد نہیں پاتے تو ہم کو اُن لوگوں سے جو ہم سے بیشتر راہِ حق میں شہید ہو چکے ہیں ہم کو اون انشا پردازوں سے جو اپنے نتائج اعمالی سے فائدہ اُٹھانے سے پہلے استبداد کا مقابلہ کرتے ہوئے مر چکے ہیں، ہم کو اُن مقرروں سے جو اپنی منبروں سے خون میں لتھڑ کر گر پڑے ہیں، ہم کو ان حکماء وعقلاء سے جن سے روحانی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر سخت کام لئے گئے ہیں، اعانت وامداد حاصل کرنی چاہیئے، اگر ہم اپنے ماضی پر غور کریں تو ہم کو تاریک جیل خانے اور طرح طرح کی سزائیں نظر آئیں گی جو اس بات کی شہادت دیں گی کہ ہمارا مقصد نہایت

پاکیزہ تھا، ہاں آزادی کا جھنڈا اُن تمام لوگوں کے سر پر سایہ افگن ہے جنھوں نے اپنے فرائض کے ادا کرنے کی وجہ سے نقصانات اُٹھائے، اسی جھنڈے سے ہم کو کامیابی حاصل ہوگی اور اسی اعتقاد پر میں تمھارا رخصتی بوسہ لیتا ہوں۔

خاتمہ کتاب

گیارھواں خط

از ڈاکٹر وارنگٹن بنام لیڈی وارنگٹن

میں کل ایک جلسۂ دعوت میں شریک ہوا جس کو ڈاکٹر اراسم اور اُن کی بی بی نے اپنے لڑکے کی اکیسویں سال گرہ کی تقریب میں منعقد کیا تھا، یہ جلسہ نہایت شاندار اور باوقار تھا، لیکن اس متانت و وقار کے ساتھ تمام شرکائے جلسہ کے دلوں میں ابتہاج و مسرت کی ایک حرکت بھی پائی جاتی تھی، کھانے کے بعد قدیم انگریزی دستور کے موافق "امیل" کی محبت میں دورِ بادہ و ساغر چلا اور ڈاکٹر اراسم نے کھڑے ہو کر اپنے لڑکے کا جامِ صحت پینے کے لئے اجازت طلب کی، اُنھوں نے اس موقع پر جو فصیح و بلیغ تقریر کی اُس میں نہایت تفصیل کے ساتھ وہ تمام فرائض بتائے جو قومی زندگی میں ایک نوجوان کے اوپر عائد ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ مسئلہ تربیت، ہم سب کے مشاغلِ زندگی، اور موجودہ دور و اُس کی ضروریات پر بھی گفتگو کی۔

وہ ابھی اپنی تقریر ختم نہیں کر چکے تھے کہ دفعۃً تمام نگاہیں "امیل" کی طرف اُٹھ گئیں، پہلے تو اُس نے خاکسارانہ لہجے میں اپنے باپ کے دوستوں کا شکریہ ادا کیا کہ اُنھوں نے اس ناچیز

خانگی دعوت کو قبول کیا، اس کے بعد نہایت واضح الفاظ میں بعض مسائلِ عامہ پر گفتگو
کی اور وہ روش بتائی جو پبلک کے متعلق آئندہ اختیار کی جاسکتی ہے۔
جن لوگوں نے اُس کی یہ تقریر سُنی اُنھوں نے محسوس کیا کہ اُس نے جو کچھ بیان
کیا وہ ایک فکر مستقل کا نتیجہ تھا، اس کے بعد پھر دور چلا، اور متصل جامِ صحت تجویز
کئے گئے، جب ہم سب نے میز سے اُٹھنا چاہا تو اُس نے اپنے والدین کی طرف رُخ کیا اور
اُن دونوں کو ایک واقعہ کی اطلاع دینا چاہی، اُس وقت اگرچہ شرم و حیا کی سرخی
سے اُس کی پیشانی رنگین ہوگئی تھی تاہم اُس کے چہرے کے خط و خال سے مردانہ ثبات
و استقلال ظاہر ہوتا تھا، بہرحال ہم سب حیرت زدہ ہوگئے جب ہم نے بآواز بلند
اُس کو یہ اعلان کرتے ہوئے سُنا کہ "کل سے دو ریس اُس کے عقد نکاح میں آگئی" اس
اعلان کے بعد اُس نے اپنے والدین کے سامنے جھک کر کہا "کیا میں آپ دونوں سے
اس انتخاب کے پسندیدگی کی توقع رکھ سکتا ہوں؟ اس وقت اس لڑکے کے
دونوں گندمی رنگ کے گالوں پر شرم و حیا کی سرخی کا ایک بادل چھا گیا اور اُس نے
اپنی آنکھیں بند کرلیں، تو اُس کی سیاہ اور لمبی پلکیں اشکِ مسرّت سے تر ہوگئیں۔
ہیلانہ سے اپنے لڑکے کے اس سوال کا اس کے سوا کوئی جواب بن نہ آیا کہ
اُنھوں نے نہایت مسرت سے اُس کی گردن چوم لی، ڈاکٹر اراسمس بھی اگرچہ اپنی بی بی کی طرح
اس واقعہ سے متاثر ہوئے تاہم اُنھوں نے اپنے جذبات پر قابو رکھ کر اپنے لڑکے کو باوقار
طریقہ سے جواب دیا "اگر تم اس کو محبوب رکھتے ہو تو وہ میری لڑکی ہے"۔ اس کے بعد نہایت
فراخ دلی کے ساتھ اس لڑکی کا بوسہ لیا۔
اس مؤثر منظر کے درمیان میں ڈاکیہ نے دوبار دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک خط دیا،
جس کے لفافہ سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی دور دراز ملک سے آیا ہے۔
یہ خط "امیل" کے نام کا تھا، اور بدترین انگریزی یعنی حبشی انگریزی میں لکھا ہوا تھا،

اُس نے خط کے عنوان ہی سے معلوم کرلیا کہ یہ کابیڈن کا ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، بہر حال اس خط میں اس وفادار حبشی نے انیل کو اس تقریبِ سال گرہ پر مبارکباد دی تھی، اور حسب دستور آیندہ اس قسم کی بہت سی تقریب ہائے سالگرہ کے آنے کی توقع کی تھی، میں باوجودیکہ اپنے دوستوں کے ساتھ فرحان و شاداں نظر آتا تھا، تاہم مجھے اُن کی جدائی کا سخت رنج تھا، کیونکہ یہ تقریبِ دعوت، دعوتِ رُخصتانہ بھی تھی، اور یہ لوگ محبتِ وطن اور بعض سیاسی معاملات کی بنا پر فرانس کی طرف مراجعت کرنے والے تھے، اور میں اُن کو خدا حافظ کہنے والا تھا، میں ڈاکٹر اراسم کے اُن آخری الفاظ کو جو بھولنے ہم سے مُصافحہ کرتے وقت نہایت باوقار آواز میں کہے نہیں بھول سکتا، اور وہ الفاظ یہ تھے۔

"ہم سب کا فرض ہے کہ اپنے لڑکے کو ایک آزاد آدمی بنانے کی کوشش کریں کیونکہ اسی طریقہ سے اُن تمام برائیوں کی بیخ کنی کرسکتی ہیں، جو قوم کو مبتلائے غم کئے ہوئے ہیں۔"

ختم

وقار حیات

یعنی

نواب وقار الدولہ وقار الملک مولوی حاجی محمد مشتاق حسین صاحب سابق ریونیو سکرٹری
گورنمنٹ نظام و آنریری سکرٹری محمڈن کالج و بانی آل انڈیا مسلم لیگ

کی

نہایت مفصل، مکمل و دلچسپ و پُر از معلومات سوانح عمری جو ایجوکیشنل کانفرنس نے
علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر شائع کی

یہ سوانح عمری درحقیقت مسلمانوں کی گزشتہ پنجاہ سالہ زمانہ کی تعلیمی، سیاسی اور قومی تاریخ اور
عجیب و غریب واقعات کا مرقع ہے، حیدرآباد، علی گڑھ تحریک اور اسلامی پالیٹکس کے متعلق بہت سے
پُراسرار و مخفی حالات اس کتاب سے معلوم ہوتے ہیں، جو کسی دوسرے طریقہ سے نہیں معلوم ہو سکتے

مع مقدمہ

نوشتہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا **محمد حبیب الرحمن خاں** صاحب شروانی

مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس، کاغذ سفید تقطیع ۲۰/۲۶، کتابت و طباعت عمدہ ضخامت قریباً ۹۰۰ صفحہ مع فوٹو نواب صاحب

قیمت پانچ روپیہ

ملنے کا پتہ:- **دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ**

وقار حیات

یعنی

نواب ... وقار الملک مولوی محمد مشتاق حسین صاحب

گورنمنٹ نظام ...

شائع کردہ

... محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی

مطبع ...